اداریہ نویسی
اور
میرے اداریے

ڈاکٹر ابرار رحمانی

اداریہ نویسی
اور
میرے اداریے

ڈاکٹر ابرار رحمانی

عرشیہ پبلی کیشنز، دہلی ۹۵

نام کتاب	:	اداریہ نویسی اور میرے اداریے
مصنف	:	ڈاکٹرابراررحمانی
مطبع	:	کلاسک آرٹ پریس، دہلی
کمپوزنگ	:	افتخاراحمد
سرورق	:	اظہاراحمدندیم
ناشر	:	عرشیہ پبلی کیشنز، دہلی

EDARIYA NAVISI AUR MERE EDARIYE
By: Dr. Abrar Rehmani
Edition: 2016 Rs: 300/-

ملنے کے پتے

- مکتبہ جامعہ لمیٹڈ، اُردو بازار، جامع مسجد، دہلی۔6
- کتب خانہ انجمن ترقی، جامع مسجد، دہلی 011-23276526
- رائی بک ڈپو، 734، اولڈ کٹرہ، الہ آباد۔ 09889742811
- ایجوکیشنل بک ہاؤس، علی گڑھ
- بک امپوریم، اُردو بازار، سبزی باغ، پٹنہ۔4
- کتاب دار، ممبئی۔ 022-23411854
- ہدیٰ بک ڈسٹری بیوٹرس، حیدرآباد
- مرزا ورلڈ بک، اورنگ آباد۔
- عثمانیہ بک ڈپو، کولکاتہ
- قاسمی کتب خانہ، جموں توی، کشمیر

arshia publications

A-170, Ground Floor-3, Surya Apartment, Dilshad Colony, Delhi - 110095 (INDIA)
Mob: +91 9971775969, +919899706640 Email: arshiapublicationspvt@gmail.com

انتساب

اپنے ان قارئین کے نام جو میرے
اداریوں کو نہ صرف دلچسپی سے پڑھتے
ہیں بلکہ ان پر تنقیدی نظر بھی ڈالتے ہیں۔

اپنے بچوں

تنزیل، تزئین اور شجاع

کے نام

جو میری زبان اردو کے وارث ہیں

فہرست

اداریہ نویسی اور میرے اداریے

رسالہ یا اخبار نکالنا بہت آسان ہے لیکن اخبار یا رسالہ کے مطالبات یا تقاضے پورے کرنا آسان نہیں۔ یہی وجہ ہے کہ بہت سے اخبارات یا رسالے نکل تو رہے ہیں لیکن وہ لولے، لنگڑے اور معذور نظر آتے ہیں۔ اداریے کسی بھی رسالے یا اخبار کے لیے صحافتی تہذیب کے لحاظ سے ناگزیر ہے۔ لہٰذا جب ہم ماس میڈیا پڑھتے یا پڑھاتے ہیں تو صحافت کے دیگر لوازمات کے ساتھ اداریہ کو بھی اس میں لازماً شامل کرتے ہیں۔

کسی بھی رسالے یا اخبار کے لیے اداریے محض خانہ پری نہیں ہونے چاہئے۔ اداریے کا بہر حال ایک مقصد ہونا چاہئے۔ ہمارے قارئین معاف کریں گے کہ آج صحافت سے ہمارا مقصد پیسے کمانے اور کسی طرح مال وزر حاصل کرنے تک محدود ہو کر رہ گیا ہے جسے کسی بھی طور پر جائز اور روا نہیں کہا جاسکتا۔

مقصد کو ہمیشہ اعلیٰ فکر اور نیک نیتی پر مبنی آپ کی سوچ، آپ کے جذبات اور احساسات کا عکس ہونا چاہئے۔ اس کا ہرگز یہ مطلب نہیں ہونا چاہئے کہ ایک رسالے یا اخبار کا مدیر اپنے قارئین کے لیے ایک واعظ یا مذہبی پیشوا ہوتا ہے اور وہ جو کچھ بھی کہے اس کے ماننے والے اس پر آمنا وصدقنا یقین کرلیں اور اس پر عمل کریں۔ نہیں ایسا ہرگز نہیں بلکہ ایک مدیر ایک عام آدمی ہوتا ہے اور اسے ایک عام آدمی کی طرح ہی پیش آنا چاہئے۔ البتہ ایک ایڈیٹر ہونے کے ناطے اس کی ذمہ داری ایک عام آدمی کے مقابلے ذرا بڑھ جاتی ہے۔ ایک مدیر اپنے قارئین کے سامنے جواب دہ ہوتا ہے اور اسے اپنے کام کی توجیہ وتوضیح کرنی پڑتی ہے۔

جو لوگ اپنے اداریوں میں کچھ بھی لکھ کر اپنی ذمہ داریوں سے عہدہ برآ ہونے کو کافی سمجھتے

ہیں، وہ دراصل اپنی ذمہ داریوں سے فرار کا راستہ اختیار کرتے ہیں اور ایسے ایڈیٹر اپنے قارئین کے عتاب کا شکار کسی نہ کسی شکل میں ضرور ہوتے ہیں۔ مختصر یہ کہ کسی اخبار کا ایڈیٹر اپنے قارئین کے لیے ایک استاد، گائڈ اور نگراں کی حیثیت رکھتا ہے جو اپنے ایک خاص انداز میں ان کی تربیت کرتا ہے۔

اردو میں صحافت کی تاریخ بہت قدیم نہیں۔ تقریباً دو سو سال پر اس کی تاریخ بسیط ہے۔ جہاں تک اردو صحافت میں اداریہ نویسی کا سوال ہے تو یہ بھی اردو رسائل اور اخبارات کی قدامت تک محیط ہے۔ ہم کہہ سکتے ہیں کہ اردو صحافت میں اداریہ نویسی کی روایت اردو رسائل اور اخبارات کے اجرا کے ساتھ ساتھ چلتی رہی ہے۔ اداریہ شروع سے ہی رسائل اور اخبارات کی زینت بنتے رہے ہیں۔ یہ اور بات ہے کہ زیادہ تر رسائل کے اداریے تعریف اور تعارف تک محدود رہے ہیں۔ دلگداز اور مخزن کے اداریے اس کی بہترین مثالیں ہیں۔

یہ بھی ایک سچائی ہے کہ شروع سے ہی اردو رسائل کے بعض مدیران کے ہاتھوں میں اداریہ نویسی کے نام سے ہی ارتعاش ہونے لگتا تھا اور ان کے قلم کی روشنائی سوکھنے لگتی تھی۔ آج بھی صورت حال کچھ ایسی ہی ہے۔ ایسے مدیران گو کہ صحافی اور مدیر کہلانے کے شوق میں رسائل کا اجرا تو کر لیتے ہیں لیکن اس پیشے کے مطالبات کو پورا کرنے سے قاصر رہتے ہیں۔

بیسویں صدی کے ساتھ اردو کی ادبی صحافت کا آغاز ہوتا ہے۔ 'مخزن' اور 'زمانہ' بوجوہ زیادہ معروف ہیں۔ البتہ جہاں تک ان کے اداریوں کا سوال ہے تو وہ بھی محض رسمی ہیں اور انہیں خانہ پُری سے زیادہ اہمیت نہیں دی جا سکتی۔ لیکن کبھی کبھی یہ اداریے واقعی اداریے کا حق ادا کرتے نظر آتے ہیں۔ آزادی ملنے کے ساتھ ملک دو ٹکڑوں میں تقسیم ہو چکا تھا اور طرح طرح کے مسائل سے عوام دو چار تھے، اس کا اثر عوامی زندگی کے ہر شعبے پر واضح طور پر نظر آتا ہے۔ صحافت بھی اس سے اچھوتی نہیں رہی۔ مدیر زمانہ لکھتے ہیں:

> ''تقسیم ملک نے ہر شعبہ زندگی کو متاثر کیا ہے۔ ادبی شعبہ بھی اس کی دست برد سے محفوظ نہ رہ سکا۔ اردو کی بھی، جس کو ایک زمانہ سے ہندو مسلم متفقہ کوششوں سے حاصل کیا ہوا مشترکہ سرمایہ تصور کیا جاتا تھا ایک تنگ نظر طبقہ کے ہاتھوں مٹی خراب ہوئی اور آج اس کا مستقبل تاریک ہو گیا..... اردو زمانہ موجود میں جس انقلابی دور سے گزر رہی

ہے اور اس کو جن مصائب کا سامنا کرنا پڑ رہا ہے وہ ہمارے ناظرین باتمکین سے مخفی نہیں۔ پھر بھی ہم نے 'بانی مرحوم' کے نصب العین کی تکمیل کے راستے پر گامزن رہنے کا عزم بالجزم کرلیا ہے...... لیکن اس عزم کو قائم رکھنا ہمارے سرپرستوں کے ہاتھ ہے۔ ہم متوقع ہیں کہ ہمارے سرپرست دامے، درمے، سخنے بہر نوع ہماری امداد کر کے ہمارے عزم کو پورا کرنے میں ہماری مدد فرمائیں گے۔......" (زمانہ، مئی 1948ء)

اس وقت کے چند ایسے رسائل جو ادھر ڈوبے ادھر نکلے، کی مثال بنے ان میں 'لسان العصر' لکھنؤ، 'سہیلی'، 'عصمت'، 'شباب'، بہارستان'، صلائے عام'، 'پنجاب ریویو' کرم آباد'، اولڈ بوائے' بنارس، 'استبصار' رائے بریلی، 'سفیر' لکھنؤ، 'الصنعت' لاہور، 'میوزک گزٹ' قابل ذکر ہیں۔ البتہ اہم اور قابل ذکر رسائل میں زمانہ (منشی دیا نرائن نگم) الناظر (ظفر الملک علوی)، ادیب الہ آباد (نوبت رائے نظر) 'ہمایوں'، 'نگار'، 'نیرنگ خیال' خاص ہیں۔

مذکورہ بالا رسائل میں 'نگار' سب سے زیادہ اہمیت کا حامل ہے۔ جسے 1921ء میں نیاز فتح پوری نے جاری کیا۔ نگار اور نیاز اردو صحافت میں لازم وملزوم کی حیثیت رکھتے ہیں، انہوں نے اردو صحافت کی تاریخ میں اپنا ایک مقام بنایا ہے۔ نگار میں اداریے ملاحظات کے عنوان سے لکھے جاتے تھے اور ہر اداریہ کسی بھی فن پارے سے کم نہیں ہوتا تھا۔ ملاحظات کے عنوان سے 'آجکل' میں بھی کسی تحریر کو چھاپ دیا جاتا تھا جسے اداریے کا بدل سمجھ لیا جاتا تھا۔ جب کہ یہ نہ تو اداریہ ہوتا تھا اور نہ ہی کوئی مضمون یا کہانی۔ یہ ایڈیٹر کی مدیرانہ صلاحیت پر ایک سوالیہ نشان لگاتا تھا۔ لیکن نگار کے ملاحظات کا کوئی جواب نہیں۔ یہ ادب پارہ تو ہوتا ہی تھا ساتھ ہی مذہبی، سیاسی، تاریخی، تمدنی، ملکی اور بین الاقوامی مسائل پر نظر ڈالنے کا ایک بہترین پلیٹ فارم بھی تھا۔ اس کے اداریے دلچسپ اور قابل مطالعہ ہوا کرتے تھے۔ نگار کی ایک خاص بات یہ ہے کہ اس کے زیادہ سے زیادہ صفحات نیاز کے زور قلم کا نتیجہ ہوتے تھے۔ اکتوبر 1925 کے نگار میں نیاز فتح پوری لکھتے ہیں:

"آپ ملاحظہ فرمائیں گے کہ اس مہینہ تقریباً سارا کا سارا رسالہ مجھ ہی کو اپنے مضامین سے پُر کرنا پڑا اور ہر چند میں نے کوشش کی کہ اس میں تنوع ہو جائے لیکن یہ کوشش کامیاب نہ ہو سکی۔ بعض حضرات اسے پسند نہیں فرمائیں گے مگر نگار کے دور

حیات میں یہ کوئی نئی بات نہیں۔ گزشتہ تین سال نو ماہ کے رسالوں کی اگر ورق گردانی کی جائے تو معلوم ہوگا کہ 3744 صفحات میں مشکل سے ایک ہزار صفحات مضامین غیر کے ہوں گے اور باقی تین ہزار صفحات ادارت ہی کی طرف سے پیش ہوئے ہوں گے۔ اس کا ذکر میں نے اس لئے نہیں کیا کہ آپ میری کاوش کی داد دیں یا یہ کہ اس کو اپنی زندگی کا کوئی غیر معمولی واقعہ سمجھ کر آپ کے سامنے پیش کر رہا ہوں بلکہ مقصود اس ضمن میں صرف یہ ظاہر کرنا ہے کہ ملک میں اچھا لکھنے والے اس قدر کم ہیں کہ اگر ان کے اعتماد پر کوئی رسالہ جاری کیا جائے تو چند مہینے بھی زندہ نہیں رہ سکتا۔ چنانچہ جملہ دیگر اسباب کے یہ بھی ایک بڑا سبب رسائل کی ناکامیابی کا ہے۔ جس کو میں نگار کی اولین اشاعت میں بھی ظاہر کر چکا ہوں۔" (نگار، اکتوبر 1925ء)

نگار کی طرح نیرنگ خیال (1924) میں اداریے 'شذرات' کے عنوان سے لکھے جاتے تھے۔ لیکن نیرنگ خیال کے ایڈیٹر کلیم محمد یوسف حسن کسی بھی طرح نیاز کی ہمسری کرتے نظر نہیں آتے۔ البتہ ان میں سرقہ، توارد اور ایک ہی تخلیق یا مضمون کو کئی رسالوں میں شائع کرانے کی ہوس کو پُر زور طریقے سے بے نقاب کیا جاتا تھا۔ اس طرح کی چیزوں کا ذکر یا پردہ فاش کرنے کے سبب نیرنگ خیال کے مدیر کلیم محمد یوسف حسن بہ نظر استحسان دیکھے جانے لگے۔

اداریہ دراصل کسی مضمون یا مقالے کی مانند ایک تحریر ہوتی ہے جو عام طور پر اخبار کے ایک صفحے کا چھٹا حصہ ہوتا ہے جب کہ 'آجکل' جیسے بڑے سائز کے رسالے میں عام طور پر ایک صفحہ کا ہوتا ہے۔ 'آجکل' کے کسی دل جلے ستم ظریف قاری نے اسے ایک بیچی توپ سے موسوم کیا تھا جو اپنے دشمنوں کی فوج کو ایک ہی جھٹکے میں ڈھیر کرنے کی صلاحیت رکھتا ہو۔ کتابی سائز کے رسالے میں جسے جرنل اور جریدہ بھی کہتے ہیں، ایک سے 10 رصفحے تک اداریہ لکھنے کی گنجائش ہوتی ہے۔ اداریہ کسی اخبار یا میگزین کے ایڈیٹر کی اپنی رائے ہوتی ہے۔ یہی وہ کالم ہے جس میں ایڈیٹر اپنی بات قارئین کے سامنے رکھتا ہے۔ جس کے جواب میں قارئین اپنے تاثرات کا اظہار کرتے ہیں۔ جس کی روشنی میں ایڈیٹر اپنے رسالے کی خوبی و خامی کا محاکمہ کرتا ہے اور حسب ضرورت اس کی اصلاح کی سعی کرتا ہے۔ اس طرح کسی رسالے کا اداریہ ایڈیٹر کا اپنا کالم ہوتا ہے جب کہ

مراسلات قارئین کا کالم ہوتا ہے۔ کسی بھی رسالے کے لیے یہ دو ایسے پلیٹ فارم ہیں جن پر ایڈیٹر اور قارئین آمنے سامنے ہوتے ہیں اور جہاں افہام و تفہیم کا بھرپور موقع فراہم ہوتا ہے۔ اگر ایڈیٹر سمجھ دار ہو تو اپنے قارئین کے جذبات و احساسات کو سمجھنے اور سمجھ کر ان کے مطالبے اور شکایات دور کرنے کی کوشش کرتا ہے۔ قارئین بھی اپنی پسند و ناپسند کا اظہار کر کے اپنے ذوق کی تسکین کرتے ہیں۔

اس کا مطلب ہر گز یہ نہیں کہ ایڈیٹر اپنے قارئین کی انگلی پکڑ کر چلتا ہے یا ان کی پسند و ناپسند، جائز و ناجائز مطالبات کے تابع ہوتا ہے۔ البتہ کبھی کبھی ایک ایڈیٹر کو ایک خاص ماحول میں کوئی سخت قدم بھی اٹھانا پڑ سکتا ہے، جس سے کہ قارئین کا ایک طبقہ ناراض بھی ہو سکتا ہے اور وہ رسالے یا ایڈیٹر سے ہمیشہ ہمیشہ کے لیے دور بھی ہو سکتا ہے۔ لیکن رسالے کے مزاج، معیار اور اس کے وقار کی خاطر ایسا کرنا ضروری بھی ہوتا ہے۔

اخبار روزنامہ ہو یا ہفتہ وار، پندرہ روزہ ہو یا ماہنامہ میگزین، ان سبھوں کے لیے اداریہ ایک لازمی جزو ہے۔ اگر آپ اداریہ نہیں لکھ سکتے تو آپ کو کوئی حق نہیں پہنچتا کہ آپ کسی اخبار یا رسالہ کے ایڈیٹر کہلائیں۔

اداریہ کو اداریہ ہی ہونا چاہئے، مضمون یا افسانہ نہیں، یعنی آپ کے اداریے کو موقع محل کے لحاظ سے ایسا ہونا چاہئے جس کو آپ کے قارئین پسندیدگی کی نظر سے دیکھیں۔ آپ کا اداریہ آپ کے قارئین کو پرووک کرنے والا ہو، جو بے ساختہ اور برجستہ آپ کے قارئین کو اپنے جذبات و احساسات کے اظہار پر مجبور کر دے۔

محض 'اس شمارہ کے بارے میں' اور یہ کتاب، شذرات 'ملاحظات' یا اسی طرح کا کوئی اور متبادل اداریہ کی کمی کو ہر گز ہر گز پُر نہیں کر سکتا۔ یہ محض خانہ پری ہوگی جو کسی کم ہمت، مصلحت پسند یا بزدل ایڈیٹر کی جھجک، ڈر اور اس کی سوچ کا نتیجہ ہو سکتا ہے۔

کسی بھی اخبار یا رسالے کے لیے اداریہ اس کے چہرے کی مانند ہوتا ہے۔ یعنی جس طرح کسی بھی شخص کا چہرہ دیکھ کر ایک تاثر قائم کیا جا سکتا ہے، ٹھیک اسی طرح کسی رسالے یا اخبار کے بارے میں اس کے اداریہ سے ایک عام تاثر قائم ہوتا ہے کہ متعلقہ اخبار یا رسالہ کس نوعیت کا ہے۔ یہ اور بات ہے کہ کبھی کبھی بعض چہرے کو دیکھ کر ہم غلط تاثر قائم کر لیتے ہیں، یعنی اس کے چہرے پر

تو کچھ اور ہے لیکن اس کے باطن یا دل میں کچھ اور۔ اسے ہم عرف عام میں قول و فعل کا تضاد بھی کہتے ہیں۔ اب اگر آپ چاہیں تو اداریہ کو چہرہ نہ کہہ کر دل سے موسوم کرلیں، بعض دانشور تو اسے روح اور نبض سے بھی تعبیر کرتے ہیں۔ بہر حال اداریہ کو چہرہ، دل، روح، نبض یا جس نام سے بھی موسوم کریں، یہ طے ہے کہ اداریہ ایک رسالے یا اخبار کا لازمی اور اہم جزو ہوتا ہے۔

ہر اخبار اور رسالہ کی اپنی ایک پالیسی ہوتی ہے جو دراصل اس اخبار یا رسالے کے مالکان کی سوچ، نظریہ اور مقصد کے تابع ہوتی ہے۔ ایڈیٹر اخبار کی اسی پالیسی کے مطابق اداریہ لکھتا ہے اور جب کبھی مالکان اور ایڈیٹر میں نظریات کا اختلاف ہوتا ہے تو ایک مسئلہ کھڑا ہو جاتا ہے۔ ایسی صورت میں اکثر ایڈیٹر کو شکست کا منہ دیکھنا پڑتا ہے۔ چنانچہ ایڈیٹر ایسی صورت حال سے خود کو ہم آہنگ کر لیتا ہے لیکن اس کے نتیجے میں جو تحریر سامنے آتی ہے وہ قارئین کی پسندیدگی کی کسوٹی پر کم ہی اترتی ہے۔

آج سیکڑوں کی تعداد میں اخبارات اور رسائل نکل رہے ہیں، لیکن ان اخبارات ورسائل کے بہت کم ہی اداریے ہمیں جھنجھوڑ پاتے ہیں کیونکہ آج اداریے کو عام طور پر خانہ پری کا مشغلہ سمجھ لیا گیا ہے چنانچہ ایسے اداریے ہماری توجہ بھی نہیں کھینچ پاتے۔

اخبار اور رسالے کے اداریوں کا مزاج الگ الگ ہوتا ہے۔ اخبارات عام طور پر سیاسی موضوعات اور روزمرہ کے واقعات کا احاطہ کرتے ہیں لیکن اخبار کی ایک روزہ زندگی کے باوصف اداریہ نویسی میں انتہائی مہارت اور چابکدستی کا ثبوت دینا پڑتا ہے۔ چنانچہ اخبار کے لیے اداریہ لکھتے وقت اس امر کا خاص خیال رکھنا ہوتا ہے کہ کل کو جب صورت حال کوئی اور کروٹ لے تو اس میں اتنی گنجائش ہو کہ جب ہم اگلی بات کہیں تو وہ ہماری پچھلی بات سے متصادم یا متضاد نہ ہو۔ اگر اس امر کا خیال نہیں رکھا گیا تو اس سے ایڈیٹر کی بڑی ہی مضحکہ خیز صورت بن سکتی ہے۔ اداریوں کی وجہ سے کسی بھی اخبار یا رسالے کا ایک خاص حلقہ بنتا ہے اور انہیں کی وجہ سے ہی یہ حلقہ گھٹتا اور بڑھتا رہتا ہے۔

بلاشبہ آج اردو اخبارات کثیر تعداد میں نکل رہے ہیں لیکن یہ اخبارات جو کبھی ایک مشن کے طور پر نکل رہے تھے اور جو جنگ آزادی کے نقیب تھے، آج محض کاسۂ گدائی بن کر رہ گئے ہیں۔ بہ الفاظ دیگر یہ محض آمدنی کا ذریعہ بن گئے ہیں۔ ظاہر ہے جب اخبار کا مقصد اشتہار کی تحصیل اور

بلیک میلنگ کے ذریعہ پیسہ کمانا ہو کر رہ گیا ہو تو پھر اخبار کیا اور اخبار کا اداریہ کیا۔ یہ سب محض خانہ پری ہو کر رہ جاتے ہیں۔

جہاں تک اردو رسائل کا سوال ہے تو یہ ادبی، سماجی، سائنسی اور تجارتی نوعیت کے لحاظ سے اپنے اداریہ کے لیے موضوعات کا انتخاب کرتے ہیں۔ ہم رسائل کو دو زمروں میں بانٹ کر دیکھ سکتے ہیں۔ ایک سرکاری اور دوسرے غیر سرکاری یا ذاتی۔ سرکاری رسالوں میں اس وقت ماہنامہ 'آجکل' دہلی، ایوان اردو، اردو دنیا، کتاب نما، نیا دور، لکھنؤ، زبان وادب پٹنہ وغیرہ خاص اور اہم ہیں۔ ان میں سے صرف اول الذکر تین رسائل کے پاس ISSN نمبر ہے جب کہ باقی رسالے اس سے نہ صرف محروم ہیں بلکہ ان کے مالکان اور ایڈیٹر نابلد بھی ہیں۔ اسی طرح ذاتی رسالوں میں مباحثہ پٹنہ، مژگاں کلکتہ، جہان اردو دربھنگہ، ذہن جدید دہلی، نیا ورق ممبئی، انشار، کولکاتا، سب رس، حیدرآباد وغیرہ خاص اور اہم ہیں۔ سرکاری رسالوں میں عام طور پر ایڈیٹر انتہائی چوکس اور ہوشیار رہتا ہے۔ مبادا ذرا سی لغزش ہوئی اور لوگوں نے اس کے خلاف محاذ آرائی کر لی۔ یہ ایسے لوگوں کے لیے سنہرا موقع ہوتا ہے، وہ اس کی تاک میں رہتے ہیں۔ اور اپنی ذاتی رنجش کے سبب ایڈیٹر سے پُرخاش نکالتے ہیں۔ چنانچہ سرکاری رسالوں کے بعض ایڈیٹر اداریہ نہ لکھنے میں ہی عافیت سمجھتے ہیں۔ اگر لکھتے بھی ہیں تو باتیں گول مول اور انتہائی سرسری ہوتی ہیں۔

ذاتی رنجش اور مخاصمت کا نشانہ آجکل کے ایڈیٹروں کو وقتاً فوقتاً بننا پڑتا رہا ہے۔ ناچیز بھی اس کا مزہ چکھ چکا ہے۔ اسی لیے بعض سرکاری رسائل کے ایڈیٹر تو اداریہ لکھتے ہی نہیں اور بعض ایڈیٹر اداریہ کے نام پر کچھ بھی پیش کر کے فراغت پا لیتے ہیں اور کچھ رسالے مہمان اداریہ سے کام چلا لیتے ہیں۔ یعنی ہلدی لگے نہ پھٹکری، رنگ آئے چوکھا۔ وہ رسالے جو اداریہ لکھتے بھی ہیں، ان میں سے بیشتر اداریہ کے نام پر محض سرسری باتیں لکھ کر گلو خلاصی حاصل کر لیتے ہیں۔ اس میں سرکاری یا ذاتی رسالوں کی تخصیص نہیں۔ بیشتر رسالے رواں شمارے کے مشمولات پر سرسری رائے زنی کر کے گزر جاتے ہیں اور بعض تو وفیات پر ہی اکتفا کر لیتے ہیں۔

صحیح معنوں میں کسی بھی رسالے کا ایڈیٹر اپنی حد میں رہتے ہوئے ایک منصف کا رول ادا کرتا ہے اور اداریہ میں وہ اپنا فیصلہ یا اپنی رائے پیش کرتا ہے۔ یہ ٹھیک ہے کہ کسی بھی ایڈیٹر کا فیصلہ حتمی یا قطعی نہیں ہو سکتا لیکن یہ ضرور ہے کہ وہ اپنی رائے سے اپنے قارئین کو سوچنے سمجھنے اور اس پر

بحث کرنے پر مجبور کرتا ہے اور پرووک بھی۔

جہاں تک اداریہ کے موضوع کا سوال ہے تو اگر وہ کسی اخبار کا اداریہ ہے تو اکثر و بیشتر سیاسی نوعیت کا ہوگا۔ کبھی کبھی یہ سانحاتی اور حادثاتی بھی ہوسکتا ہے۔ لیکن کسی میگزین کے اداریہ کا موضوع عام طور پر رسالہ کے جاری ہونے کے وقت سے ہی طے ہوتا ہے کہ ہمارے اس رسالے کا مزاج اور موضوع کیا ہوگا۔ جیسے ' آجکل' کا مزاج اور موضوع ادبی ہے، لیکن کبھی کبھی یہ دوسرے موضوعات کا بھی احاطہ کرتا ہے۔ اس صورت میں بھی اس کے ڈانڈے ادب سے ملانے کی کوشش کی جاتی ہے۔ جیسے مئی 2013 میں سنیما کے سو سال پورے ہونے پر ایک شمارہ اس کے لیے وقف کیا گیا تھا۔ یا جیسے فروری 2015، کا شمارہ سائنس کے نام کیا گیا اور اردو ادب پر اس کا اطلاق کرنے کی کوشش کی گئی۔ ایسی صورت میں ان شماروں کے اداریے بھی اسی موضوع پر لکھے گئے جیسے ناچیز نے ہندوستانی سنیما کے سو سال والے شمارے میں ہندوستانی سنیما کی سمت و رفتار پر اداریہ لکھا تھا، جس کا عنوان ''سو سال کی ایک الہڑ حسینہ'' رکھا گیا تھا۔ جسے قارئین نے پسندیدگی کی نظر سے دیکھا تھا۔ ناچیز نے اپنے اداریے کے لیے دیگر موضوعات کا بھی انتخاب کیا ہے۔ کوشش کی گئی ہے کہ دیگر موضوعات اور عنوانات کے ساتھ بھی انصاف کیا جاسکے۔

ایک مدیر کو اداریہ لکھتے وقت دیانت داری، حق گوئی، بے باکی اور غیر جانب داری کا خاص خیال رکھنا چاہیے۔ البتہ زیب داستان کے لیے کچھ مرچ مسالہ ڈال کر اسے چٹپٹا اور دلچسپ بنایا جاسکتا ہے۔ خشک اور بے جان تحریر آپ کے قارئین کو آپ سے دور کرسکتی ہے۔

آیئے اب اپنے چند اداریوں پر ایک نظر ڈالتے ہیں۔ اس سے پہلے میں ایک بات کی وضاحت کردینا مناسب سمجھتا ہوں کہ ان میں سے بیشتر اداریے ' آجکل' میں اشاعت کے بعد مختلف رسائل اور اخبارات میں نقل ہوتے رہے ہیں۔ ان اداریوں کو ایک بار پھر یکجا طور پر آپ کے سامنے پیش کر رہا ہوں، قندِ مکرر سمجھ کر اسے قبول کرلیں۔ میں نے اپنے ایک اداریہ میں اردو سمیناروں کی عام صورت حال پر روشنی ڈالی تھی۔ صورت حال کے مطابق جو منظر نامہ پیش کیا گیا تھا وہ اس قدر مایوس کن تھا کہ اردو کے عام ادبی حلقہ میں اس پر تشویش کا اظہار کیا جانے لگا۔ لیکن اس صورت حال

کے لیے جو حضرات ذمہ دار تھے انہیں ہمارا یہ آئینہ دکھانا اچھا نہیں لگا کہ اس سے ان کی قلعی کھلتی تھی۔
اس اداریہ میں جو کچھ لکھا گیا تھا اس کا اعتراف بہت سارے حق پسند حضرات نے کھلے دل سے کیا تھا۔ آج بھی سمیناروں کی عام صورت حال انتہائی مایوس کن ہے۔

آج اردو کہانی کی صورت حال بھی بہت حوصلہ افزا نہیں نیز یہ کہ آج ہماری کہانی کا کردار بھی جاندار اور یادگار تخلیق نہیں ہو پا رہا ہے۔ ممکن ہے کہ ہماری بات صدفی صد درست نہ ہو۔ لیکن کیا اس سے انکار ممکن ہے کہ اس موضوع پر صحت مند مکالمہ ہونا چاہئے۔ ہمارا مقصد بھی یہی تھا کہ اس پر بھرپور گفتگو ہو اور کوئی کارآمد نتیجہ سامنے آئے۔ میں نے اپنی اس زیر بحث تحریر میں کہا تھا:

"آج افسانے سیکڑوں کی تعداد میں لکھے جارہے ہیں اور جیسا کہ میں نے کہا ہے کہ پڑھے بھی جارہے ہیں (کہ ادب کا قاری انہیں پڑھنے پر مجبور ہے) لیکن بہت کم ہی افسانے ایسے ہیں جو اپنا نقش تادیر قائم رکھ پاتے ہیں۔ آج بھی جب اردو فکشن کی بات ہوتی ہے تو پریم چند یا پھر ترقی پسند افسانہ نگار منٹو، بیدی، عصمت اور کرشن چندر کے افسانوں کا ہی بکھان ہوتا ہے۔ یا اس سے بہت آگے گئے تو بلراج مین را، سریندر پرکاش، قرۃالعین حیدر اور جوگندر پال تک آتے آتے ہماری سانس پھولنے لگتی ہے۔"

اسی طرح ایک اداریہ میں آج کی اردو کہانیوں میں جاندار اور یادگار کرداروں کے نہ ہونے پر تشویش کا اظہار کرتے ہوئے ناچیز نے لکھا تھا:

"افسانوں میں کردار کی تخلیق یا کردار سازی بھی آج اس سنہری دور سے بہت پیچھے ہے جسے ہم عہد زریں یا ترقی پسند دور کے نام سے جانتے ہیں۔ آج بھی ہم جب کردار نگاری کی بات کرتے ہیں یا یادگار کرداروں کا ذکر کرتے ہیں تو انہیں کہانیوں کی طرف رجوع کرنا پڑتا ہے۔ کیا وجہ ہے کہ آج کوئی یادگار کردار تخلیق نہیں ہو پا رہا ہے؟"

ظاہر ہے کہ جب کردار جاندار نہیں ہوں گے تو کہانی بھی بہت اچھی نہیں ہوسکتی۔ اس طرح جو صورت حال بنتی ہے اسے میں نے ان الفاظ میں بیان کیا تھا:

"نہ پلاٹ، نہ کردار، بس واقعات ہی واقعات آج کے افسانوں کی شناخت ہیں۔ تو کیا افسانے واقعات کی کھتونی محض ہیں؟"

ممکن ہے میں نے اپنی بات میں زور پیدا کرنے کے لیے کچھ سخت الفاظ استعمال کیے ہوں۔
لیکن اس سختی اور لہجہ کی اس جارحیت کے باوجود میں پھر اس بات پر اصرار کرتا ہوں کہ میں نے جو کچھ کہا تھا، وہ صحیح تھا اور اگر صحیح نہیں ہے تو آج کے افسانہ نگاروں اور افسانہ کے ناقدین پر لازم تھا کہ وہ میری باتوں کو مدلل انداز میں غلط ثابت کرتے۔ لیکن نہیں ایسا نہیں کیا گیا۔ وہ ایسا کر بھی نہیں سکتے تھے۔ وہ لاجواب ہو چکے تھے۔ ''کھسیانی بلی کھمبا نوچے''۔ انہوں نے کھمبا نوچنے کی کوشش میں الٹی سیدھی حرکتیں شروع کر دیں۔ ارباب حل وعقد کے سامنے کچھ اس انداز میں میری شکایات کی گئیں کہ مجھے مصلحت کی چہار دیواری میں پناہ لینی پڑی۔

شتر مرغ کی طرح ریت میں سر چھپا لینے سے طوفان نہیں ٹلتا، سچائی چھپ نہیں جاتی۔ سچی بات یہ ہے کہ ہم میں سچائی کا سامنا کرنے کی ہمت نہیں۔ سنا کرتے تھے کہ قلم کے سپاہی نڈر ہوا کرتے ہیں۔ فیض نے بڑے طمطراق سے کہا تھا:

متاعِ لوح و قلم چھن گئی تو کیا غم ہے
کہ خون دل میں ڈبو لی ہیں انگلیاں میں نے

فیض نے یہ شعر اس دور میں کہا تھا جب حق بات بولنے پر پابندی لگا دی گئی تھی۔ چنانچہ اپنے مافی الضمیر کے اظہار کے لیے شاعر نے اپنی انگلی کے قلم کو خون دل کی روشنائی میں ڈبو کر لکھنے کا عزم ظاہر کیا تھا۔ لیکن اب یہ سب کچھ ایسا لگتا ہے گویا ''خواب تھا جو کچھ کہ دیکھا جو سنا افسانہ تھا۔''

اب یہ باتیں فسانہ بن چکی ہیں اور ایسا لگتا ہے گویا کبھی ایک خواب دیکھا تھا جب ادیب قلم کے سپاہی یا مزدور ہوا کرتے تھے۔ اب تو ہم 'قلم کے سوداگر' ہو چکے ہیں۔ 'سوداگری' کی انتہا یہ ہے کہ ہم اپنے فائدے کے لیے کسی بھی حد تک جا سکتے ہیں۔ اس میں اپنی عزت و وقار کا بھی پاس و لحاظ نہیں ہوتا۔

یونیورسٹیوں کے شعبۂ اردو کی ملازمت تو آج گدی نشینی یا سجادہ نشینی ہو کر رہ گئی ہے۔ اگر آپ کو یہاں ملازمت حاصل کرنی ہے تو آج سے بلکہ ابھی سے ہی اپنے صدر شعبہ اور دیگر با اثر اساتذہ اور ایکسپرٹ کی خوشامد و چاپلوسی بلکہ خصیہ برداری شروع کر دینی چاہیے۔ تبھی آپ کو یہاں گھسنے کی اجازت دی جا سکتی ہے بصورت دیگر آپ اس کے اہل نہیں۔ آپ کی تعلیمی صلاحیتیں اپنی جگہ لیکن اگر آپ میں 'مطلوبہ صلاحیت' خوشامد اور چاپلوسی نہیں تو آپ جس تس کا منہ تکا کیجیے۔ کسی فائدے کی امید مت رکھیے۔

میں اپنی بات کو سمیٹتے ہوئے پھر اپنے موضوع کی طرف لوٹتا ہوں۔ ویسے تو عام طور پر کچھ جغادری قسم کے حضرات نے میری ہر بات کا برا مانا ہے اور مجھے زک پہنچانے کی کوشش کی ہے۔ لیکن میری جن تحریروں کو خاص طور پر نشانہ بنایا گیا ان میں چند اداریے قابل ذکر ہیں۔ ایک وہ جس میں میں نے 'سرٹیفکیٹ کی روایت' کا ذکر کرتے ہوئے ایسے تمام نقادوں کی گرفت کی تھی جو ایسی مجرمانہ حرکتوں کے مرتکب ہوتے ہیں۔ اس میں میں نے بجا طور پر لکھا تھا کہ کس طرح آج کے بڑے اور سکہ بند نقاد و ادیب ہر ایرے غیرے کو شاعر و ادیب اور معتبر نقاد ہونے کا سرٹیفکیٹ بانٹتے رہتے ہیں اور اس کے بدلے صاحب کتاب ان کے نام اپنی کتاب کا انتساب کرتا ہے۔ یا کسی اور طریقے سے انہیں فائدہ پہنچا کر انہیں خوش کرتا ہے۔ یہ اداریہ زیر نظر کتاب میں پہلے نمبر پر شامل ہے۔ یہ اداریہ پہلے بھی کئی رسالوں اور اخبارات نے 'آجکل' کے اکتوبر 2002ء کے شمارہ سے نقل کر کے شائع کیا ہے۔ قارئین کو اگر میرا یہ اداریہ بار بار پڑھنے سے طبیعت منغض یا مکدر ہوتی ہے تو اس کے لیے معذرت خواہ ہوں۔

ایک اور اداریہ ہے جس میں ایسی کتابوں کی اشاعت پر گرفت کی گئی تھی جو ادب کی بزرگ شخصیات خود پر شائع کرواتی رہتی ہیں اور اب تو گھٹنوں کے بل چلنے والے طفل مکتب بھی اپنے بزرگوں کے نقش قدم پر چل رہے ہیں۔ ایسے ہی چند نو آموز ادیبوں نے اپنی شخصیات اور ادبی خدمات پر کتابیں اور رسالوں کے نمبر شائع کروا کر خوش ہو رہے ہیں۔ اسی ضمن میں رسالوں کے شخصیات نمبر کا بھی ذکر کیا گیا تھا۔ ظاہر ہے خود پر کتاب اور رسائل کے نمبر چھپوانے کی کوشش اور سعی پیہم نے ادب میں ایک عجیب افراط و تفریط کی کیفیت پیدا کر دی ہے۔ مجھے حد درجہ تعجب ہے کہ آخر کیوں کر کوئی اپنے اوپر مضمون لکھوا کر اور اسے شائع کر کے خوش ہو سکتا ہے۔ ظاہر ہے کہ میرے اداریوں کی اس تنقید و تبصرہ کی زد میں آنے والے تمام حضرات کی کہیں نہ کہیں کو ر دبتی تھی۔ لہٰذا ان کا بلبلانا فطری ہے۔

اردو کی ترقی کے اداروں کی رقم سیمیناروں کے نام پر اس طرح لوٹی اور لٹائی جاتی ہے، جس کی کوئی مثال نہیں۔ سیمیناروں کے تعلق سے ایک بات عرض کر دوں کہ یہ اردو کی حقیقی ترقی کے بنیادی کاموں میں سے نہیں ہیں جب کہ اس وقت ضرورت ہے اردو کی حقیقی ترقی کے کام کرنے کی۔ آپ چاہے اردو افسانوں پر سیمینار کروالیں یا اردو شاعری پر۔ چاہے حقیقت نگاری یا جدیدیت پر۔ اس

سے اردو کی حقیقی ترقی کی راہ ہموار نہیں ہوتی۔ البتہ ان سیمناروں کے نام پر کچھ جیبیں گرم ضرور ہو جاتی ہیں۔ لیکن عام اردو والا ٹھگا سا رہ جاتا ہے۔

ان معروضات کے بعد میں آپ کو دعوت دیتا ہوں کہ کھلے دل و دماغ سے ان سطور کا مطالعہ کریں، جنھیں میں نے بطور اداریہ رقم کیے ہیں۔ بے شک جہاں میں نے اپنے ان اداریوں میں بے جا تلخ کلامی کی ہے اس کی طرف مدلل اشارہ کیجیے میں اپنی اصلاح کی پوری کوشش کروں گا اور اگر میری کوئی بات آپ کو اچھی لگی ہو تو اس کی بھی نشاندہی کیجیے۔ بیشک میری ان اچھی باتوں کے محرک آپ جیسے مخلصین، دوست اور احباب ہیں، جو یقیناً مبارکباد کے مستحق ہیں۔

زیر نظر کتاب میں فلر کے طور پر قدیم رسائل کے اداریوں سے جستہ جستہ اقتباسات دیے گئے ہیں۔ میں اس کے لیے کولکاتا کے نور الہدیٰ صاحب کا مشکور ہوں۔ یہ اقتباسات ان کے ایک طویل مضمون 'قدیم ادبی رسائل کے اداریے' (آجکل اپریل 2002ء) سے ماخوذ ہیں۔ میں سہیل انجم، شفیع ایوب اور ابوظہیر ربانی کا بھی شکر گزار ہوں، جن کے مفید مشوروں سے میں استفادہ کرتا رہا ہوں۔

آجکل میں اداریہ ایک زمانے تک صرف اداریہ کے نام سے ہی لکھا جاتا رہا۔ ناچیز نے اس سپاٹ پن اور اُباؤ یکسانیت سے اپنے قارئین کو محفوظ رکھنے کے لیے اپنے دوست ڈاکٹر عبید الرحمٰن (مرحوم) کے مشورہ پر ہر اداریہ پر ایک سرخی یا عنوان دینے کا سلسلہ شروع کیا اور پھر یہ سلسلہ چل پڑا۔ ان عنوانات سے ہر اداریہ کی اپنی ایک منفرد شناخت بنتی ہے۔

اداریوں کو ان کی تاریخ اشاعت کے لحاظ سے ترتیب دیا گیا ہے۔ موقع و محل کے حساب سے غالب، اقبال اور پریم چند پر ایک سے زیادہ بار اداریے لکھے گئے ہیں۔ لیکن کوشش کی گئی ہے کہ ان میں تکرار کی کیفیت پیدا نہ ہو۔

آجکل میں چھپے میرے اداریوں کا پہلا مجموعہ پیش خدمت ہے۔ حالات سازگار رہے تو یہ سلسلہ آئندہ بھی جاری رہے گا۔ مجھے احساس ہے کہ یہ اداریے تلخ بھی ہیں، ترش بھی اور شیریں بھی۔ شاید اسی وجہ سے:

اپنے بھی خفا مجھ سے ہیں، بیگانے بھی ناخوش
میں زہر ہلاہل کو کبھی کہہ نہ سکا قند

ابرار رحمانی

ادب میں 'سرٹیفکیٹ' کی روایت

ادب میں ان دنوں 'سرٹیفکیٹ' لینے اور دینے کا چلن عام ہے۔ چونکئے نہیں۔ یہ حقیقت ہے اور یہ حقیقت کسی وبائی بیماری کی طرح بڑی تیزی سے پھیلتی جا رہی ہے اور اگر اسے بروقت روکنے کی تدبیر نہیں کی گئی تو سارا ادب تعفن زدہ ہو کر رہ جائے گا۔ اس سرٹیفکیٹ اور اس بیماری کی پہلی قسم 'انتساب' ہے۔ عام طور پر ہم جس سے متاثر ہوتے ہیں یا جس سے ہماری زندگی میں کسی قسم کا کوئی بڑا فائدہ ہوا ہو، ہم اس کے نام اپنی کسی کتاب کا انتساب کرتے ہیں۔ اس سے جہاں ایک طرف ہماری سعادت مندی کا پتہ چلتا ہے وہیں دوسری طرف ہمارے ذہن وافکار کی سطح کا بھی پتہ چلتا ہے۔ دیکھا جائے تو اس میں کوئی مضائقہ بھی نہیں بلکہ یہ ایک اچھی بات ہے۔ عام طور پر انتساب اس طرح کے ہوتے ہیں: اپنے استاد محترم..... کے نام، اپنے والدین کے نام، اپنے عم مکرم..... کے نام، اپنی مادر علمی..... کے نام.....،..... کے اساسی تصورات کے نام، میرے یار..... کے نام وغیرہ وغیرہ، مذکورہ بالا انتسابات انتہائی بے ضرر قسم کے ہیں اور اس سے بلاشبہ صاحب کتاب کی احسان مندی، محبت، لگاؤ اور والہانہ پن کا اظہار ہوتا ہے۔

لیکن آج جس طرح کے انتسابات ہو رہے ہیں اور ان انتسابات میں اپنے ممدوح کو جس قسم کے سرٹیفکیٹ دیئے جاتے ہیں ان میں مفاد پرستی، خوشامد اور چاپلوسی کی بو صاف طور پر محسوس کی جاسکتی ہے۔ جیسے ایک اوسط قسم کے طالب علم یا ریسرچ اسکالر کا اپنی اوسط قسم کی کتاب کو اپنے کسی بارسوخ استاد کے نام ان الفاظ میں معنون کرنا: ''میں اپنی اس ناچیز کوشش کو اپنے محترم استاد اور کرم فرما جناب..... کے نام معنون کرتا ہوں جنھوں نے مجھے قلم پکڑنا سکھایا۔''

'قلم پکڑنا' تو خیر آپ نے اب بھی نہیں سیکھا۔ البتہ یہ ضرور ہے کہ آپ اپنے ممدوح کو اپنے القابات وخطابات سے عرش معلی پر بٹھانے کا فن جان چکے ہیں۔ اب اگر آپ کا ممدوح واقعی سمجھ دار

اور بے نیاز قسم کا انسان ہے تو آپ کی اس چاپلوسی کو ضرور سمجھ جائے گا اور ایک تبسم زیرلب میں 'یوں ہی' کر کے اڑا دے گا۔ لیکن ان دنوں عام طور پر ایسے ممدوح عنقا ہیں۔ چنانچہ وہ آپ کی چاپلوسی سے نہ صرف خوش ہوگا بلکہ آپ کو حتی المقدور فائدہ بھی پہنچائے گا۔ کیونکہ خود آپ کا ممدوح بھی کبھی ایسے ہی حربوں کی بدولت آج اس مقام پر پہنچا ہے، وہ اسے برا نہیں سمجھتا بلکہ اسے احترام اور سعادت مندی سے تعبیر کرتا ہے۔ ستم ظریفی یہ کہ اسے آپ کی صلاحیت اور اہلیت کا پیمانہ بھی مانا جاتا ہے۔

کبھی کبھی ایسے 'سعادت مند، باصلاحیت' اور 'اہل' قسم کے لوگ اپنے اس گر میں انتہائی فنکاری کا ثبوت پیش کرتے ہیں۔ کسی یونیورسٹی کے ایک شعبہ میں ایک صاحب لیکچرر کے عہدہ کے لئے اپنی راہ اس لئے ہموار نہیں کر پا رہے تھے کہ دو مخالف گروپ کے بیچ تنازعہ تھا۔ اب ان صاحب کی فنکاری ملاحظہ کیجئے کہ انہوں نے ایک ہی کتاب کا ایک کے نام 'انتساب' کیا اور دوسرے کے نام 'معنون'۔ اب انہیں کون سمجھائے کہ بھئی انتساب اور معنون کرنا ایک ہی چیز ہے۔ لیکن انہیں اس سے کیا مطلب؟ انہیں تو لفظ معنون کا تلفظ تک نہیں معلوم کہ آیا یہ لفظ مَعنُون ہے یا مُعَنون۔ بہرحال ممدوحین خوش ہو گئے اور ان کا کام بن گیا۔

سرٹیفکیٹ کی دوسری قسم وہ ہے جسے ہم پیش لفظ، تقریظ، حرف اول، حرف آخر یا فلیپ اور پشت لکھوا کر اپنے اساتذہ اور پروفیسران سے لیتے ہیں۔ اس بیماری میں بھی وہی خوشامد اور چاپلوسی کا جرثومہ تیزی سے حرکت پذیر نظر آتا ہے۔ اس سرٹیفکیٹ میں ایک استاد یا اس سبجیکٹ کا نام نہاد ایکسپرٹ عام طور پر اس صاحب کتاب کے کام کی تعریف میں زمین آسمان کے قلابے ملا دیتا ہے۔ بعض اوقات تو ان کی یہ لفاظی اتنی 'پرلطف' ہوتی ہے کہ آگے کتاب پڑھنے کی ضرورت ہی محسوس نہیں ہوتی۔ جب کہنے کو کوئی بات نہ ہو اور محض کہنے اور خوش کرنے کے لئے کی جائے تو اسی قسم کی 'پرلطف' باتیں ہوتی ہیں جو صاحب کتاب کے لئے تو یقیناً ایک کام کی چیز ہو سکتی ہے لیکن باقی لوگوں کو اس سے کوئی مطلب نہیں ہوتا اور بادل ناخواستہ بڑا نام دیکھ کر اسے کوئی قاری پڑھ ہی لیتا ہے تو سوائے کوفت کے اس کے ہاتھ کچھ نہیں آتا۔

ابتدائیہ/ پیش لفظ/تقریظ/ حرف اول/حرف آخر/ فلیپ میں سے عام طور پر پیش لفظ یا ابتدائیہ مصنف خود لکھتا ہے اور اپنے کام کا تعارف کراتا ہے۔ اسی طرح تقریظ عام طور پر ان

صاحب سے لکھوایا جاتا ہے جن سے آپ کو کہیں نہ کہیں کسی موقع سے کوئی فائدہ ملنے کی امید ہو۔ اس طرح یہ ایک پنتھ دو کاج والا معاملہ ہے۔ صاحب کتاب بھی خوش اور تقریظ لکھنے والا بھی راضی۔ حرف اول، حرف آخر اور فلیپ کا معاملہ ذرا الگ ہے۔ اسے کبھی مصنف خود ہی لکھ لیتا ہے اور ناشر کے کھاتے میں ڈال دیتا ہے اور کبھی اس کے لئے کسی 'بڑے نام' کا سہارا لیا جاتا ہے۔

یہ تو ٹھیک ہے صاحب کہ کتاب آپ کی ہے اور آپ جو چاہیں کریں۔ لیکن اگر اس کا براہ راست یا بالواسطہ خراب اثر قارئین پر پڑتا ہے تو اس کے ذمہ دار آپ ضرور ہوتے ہیں۔ یہ برا اثر کیسے پڑتا ہے۔ آیئے اس پر ایک سرسری نظر ڈالیں۔ عام طور پر ابتدائیہ، پیش لفظ، تقریظ ،حرف اول، حرف آخر اور فلیپ وغیرہ تنقیدی، تحقیقی اور ریسرچ پر مشتمل کتب پر لکھے جاتے ہیں۔ جس میں مصنف/ ناقد اپنا نظریہ، طریقہ تنقید/ تحقیق اور موضوع سے متعلق تفصیل لکھتا ہے تا کہ قارئین کو اس کتاب کے مشمولات اور دیگر جزئیات کے بارے میں معلوم ہو جائے۔ اب اگر اسی کتاب میں مصنف کے علاوہ کسی دوسرے بزرگ ناقد، محقق یا استاد تقریظ یا کسی دوسرے عنوان سے اسی کتاب کے متعلق لکھتا ہے تو اکثر و بیشتر انہیں باتوں کی تکرار ہوتی ہے جو پہلے مصنف خود کہہ چکا ہوتا ہے۔ البتہ اس پر ان تعریفی کلمات اور مبارکبادیوں اور نیک تمناؤں کے ڈونگرے کا اضافہ ہو جاتا ہے جو مصنف خود اپنی تحریر میں کہنا مناسب نہیں سمجھتا، لیکن جس کا وہ دل سے متمنی اور خواہاں ہوتا ہے۔

کبھی کبھی تو حد ہی ہو جاتی ہے۔ ایک ہی کتاب میں مختلف لوگوں سے ابتدائیہ، اختتامیہ، حرف اول، حرف آخر اور فلیپ لکھوا کر کتاب میں شامل کئے جاتے ہیں اور کامیابی، کامرانی اور سرخ روئی کے جھنڈے گاڑ دئے جاتے ہیں۔ جو چاہے آپ کا حسن کرشمہ ساز کرے۔

ناول، افسانے اور دیگر تخلیقی کتابوں میں اس قسم کی وبا کم پائی جاتی ہے۔ لیکن اب دھیرے دھیرے یہ کتابیں بھی اس زد میں آنے لگی ہیں۔ نتیجتاً ہم تو ناول پڑھنے کے خواہاں تھے لیکن یہ اضافی چیزیں پڑھ کر ہی بیٹھ گئے۔

مجھے یاد ہے' اسکول امتحانات کی تیاری کے لئے مختلف سبجیکٹ (بشمول اردو ادب) کی کنجی (Key) لایا کرتے تھے اور اس شارٹ کٹ سے ہم امتحان تو پاس کر لیا کرتے تھے لیکن ہمیں آج بھی اس بات کا افسوس ہے کہ اگر اس وبا کی زد میں نہ آئے ہوتے تو ہمارا مطالعہ زیادہ صحت مند ہوتا۔ آج

کورس کے علاوہ چھپنے والی دیگر علمی اور ادبی کتابوں کا بھی کچھ یہی حال ہے۔ نتیجہ یہ ہوتا ہے ہم مصنف کی 'پہلی بات---' یا کسی نام نہاد اکسپرٹ کا تجزیہ پڑھ کر ہی کتاب چھوڑ دیتے ہیں۔ چونکہ اُس کہانی یا ناول کا مختصر اً علم پہلے ہی ہو جاتا ہے اس لئے اصل ناول یا کہانی پڑھنے کی کم ہی نوبت آتی ہے۔ بہت ممکن ہے اس وجہ سے بہت سی اچھی تخلیق ہمارے مطالعے میں آنے سے رہ بھی جاتی ہوں۔

افسوس اس بات کا ہے کہ اس جرم میں ہم بھی شامل ہیں، جو پیشہ وارانہ طور پر اس طرح کے سر ٹیفکیٹ جاری کرتے رہتے ہیں۔

(اکتوبر 2002)

ادھر ایک اور مصیبت آن پڑی ہے۔ یو جی سی کی نئی ہدایت کے مطابق کسی بھی ریسرچ اسکالر کو پی ایچ ڈی تھیسس جمع کرنے کی اسی صورت میں اجازت دی جاسکتی ہے جب کہ ISSN نمبر والے کسی رسالے میں اس کے کم از کم 3 مضامین شائع ہو چکے ہوں۔ اس کا سیدھا سیدھا اثر 'آجکل' اور اس قسم کے چند دیگر رسائل پر پڑتا دکھائی دیتا ہے۔ چنانچہ روزانہ ہی بڑی تعداد میں کچے پکے مضامین ادارے کو موصول ہوتے ہیں۔ ان میں سے بعض مضامین کو تو کاٹ چھانٹ کر نوک پلک درست کر کے شائع کر دیا جاتا ہے لیکن زیادہ تر ایسے مضامین ہوتے ہیں جن کا کوئی علاج ہمارے پاس نہیں۔ ان پر ہم سوائے خاموشی اختیار کرنے کے اور کچھ نہیں کر سکتے۔

اردو کی عملی اور اصلی خدمت

نومبر کا مہینہ اردو والوں کے لیے ایک خاص اہمیت رکھتا ہے۔ یہ وہ مہینہ ہے جس میں اردو کے دو بڑے ادیب و مفکر اور محب وطن پیدا ہوئے۔ ایک علامہ ڈاکٹر محمد اقبال اور دوسرے مولانا ابوالکلام آزاد۔ یہ دونوں ہندوستان کے وہ عظیم سپوت ہیں جنہوں نے نہ صرف اپنے فکر و فلسفہ اور اپنے وسیع تر نظریات سے اپنے مادر وطن ہندوستان کا پوری دنیا میں نام روشن کیا بلکہ انہوں نے اپنے شہ پاروں اور لازوال تحریروں سے اردو ادب کو عالمی ادب کے مدمقابل لا کھڑا کیا۔

اقبال کا شاہکار "ترانہ ہندی" گرچہ بچوں کا ترانہ ہے لیکن اس کے اکثر اشعار آج ضرب المثل کی شکل اختیار کر چکے ہیں۔ آج نہ صرف ہر بچہ

سارے جہاں سے اچھا ہندوستاں ہمارا
ہم بلبلیں ہیں اس کی یہ گلستاں ہمارا

کا اسکول سے گھر تک ورد کرتا ہے، بلکہ ایک ادنیٰ مزدور سے لے کر اعلیٰ سیاست داں تک اس شعر کو گنگنا کر اپنے محب وطن ہونے کا ثبوت دیتا ہے۔ راکیش شرما نے جب چاند سے "سارے جہاں سے اچھا ہندوستاں ہمارا" کہا تھا تو اقبال کے اس مصرعہ سے نہ صرف اپنے حب وطن کا ثبوت دیا تھا بلکہ ہندوستان کی عظمت کا اعلان بھی کیا تھا۔ اسی طرح ایوان سیاست میں سیاست داں حضرات اس شعر کے ذریعہ اپنے دیش بھکت ہونے کا ثبوت فراہم کرتے رہتے ہیں۔ کہنے کا مطلب یہ کہ ہر موقع سے اور کم و بیش ہر روز اس شعر یا اس ترانے کے توسط سے اقبال یاد کئے جاتے ہیں۔ لیکن ہمارا یہ عمل بڑے مشینی انداز کا ہوتا ہے اور اکثر و بیشتر اس میں ہمارے شعور کا کوئی دخل نہیں ہوتا۔ اقبال جیسے عظیم شاعر اور محب وطن کے تئیں ہمیں شایان شان طریقے سے خراج

عقیدت ضرور پیش کرنا چاہئے۔

مولانا ابوالکلام آزاد ہماری قومی سیاست کا ایک معروف نام ہے۔ مولانا کی شخصیت ہشت پہلو رہی ہے۔ وہ ایک مدبر سیاست داں، عظیم رہنما، ماہر تعلیم، مفسر قرآن اور صف اول کے ادیب تھے۔ ان تمام حیثیتوں میں مولانا آزاد کی الگ الگ مگر مضبوط شناخت ہے۔ مولانا کا کمال یہ ہے کہ وہ ان میں سے ہر شعبہ میں کامیاب وکامران رہے۔ مولانا آزاد ہندوستان کے پہلے وزیر تعلیم تھے۔ انہوں نے بحیثیت وزیر تعلیم جو کارہائے نمایاں انجام دئے وہ کسی سے مخفی نہیں۔ مفسر، مدبر اور مفکر کی حیثیت سے ان کا ''ترجمان القرآن'' ایک لازوال اور لافانی شاہکار ہے۔ مولانا کے اس کام پر تنقید وتبصرہ کرنا مجھ جیسے ہیچمدان کے لئے یقیناً سورج کو چراغ دکھانے والی بات ہوگی۔ ''الہلال اور البلاغ'' کے اداریے اور مضامین ایک طرف ان کی مدیرانہ صلاحیتوں کو اجاگر کرتے ہیں تو دوسری طرف ان کی ادبی حیثیت کو مسلم بناتے ہیں۔ غبار خاطر مولانا کے سیاسی افکار کا آئینہ بھی ہے اور ادبی شاہکار بھی۔

موقع بہ موقع ہم اس نابغہ روزگار کو بھی خراج عقیدت پیش کرتے رہتے ہیں۔ وہ بھی بڑے ہی میکانکی اور مشینی انداز میں۔ جیسے ہم ان کے یوم پیدائش اور یوم وفات کے موقع سے ان کے مزار پر جمع ہو کر قل، فاتحہ خوانی اور گلپوشی کر دیتے ہیں۔ بس اللہ اللہ خیر صلّٰی۔

اقبال ہوں یا مولانا آزاد۔ کیا ہمیں کچھ ایسا نہیں کرنا چاہئے جو ان کے شایان شان ہو۔ اقبال کا یوم پیدائش 9/نومبر ہے اور مولانا آزاد کا ۱۱/نومبر۔ کسی کا خیال ہے کہ علامہ اقبال کے یوم پیدائش کو 'یوم اردو' کے طور پر منایا جائے تو کوئی کہتا ہے کہ مولانا آزاد کے یوم پیدائش کو 'یوم تعلیم' کے طور پر منایا جائے۔ لیکن اس کا عملی پہلو پس پشت رہتا ہے۔

ہم اس سے ایک قدم آگے بڑھ کر کہنا چاہیں گے کہ پورے ماہ نومبر کو اردو مہینہ کے طور پر کیوں نہ منایا جائے۔ کچھ اس طرح کہ ہم اقبال کو یاد کریں اور اقبال کی روح بھی خوش ہو۔ ہم آزاد کو یاد کریں اور آزاد کی روح بھی سرشار ہو۔ عام طور پر 'یوم اردو' مناتے ہوئے ہم نشستن، گفتن، خوردن اور برخاستن کو ہی کافی سمجھتے ہیں اور خوش ہو لیتے ہیں۔ کیا کچھ ایسا نہیں کیا جاسکتا جو ہمارے عملی فائدے کی بات ہو۔ یقیناً کیا جاسکتا ہے۔ لیکن ایک دن اس کے لئے کافی نہیں ہوگا۔

ہم نے اسی لئے پورے ماہ نومبر کی بات کی ہے۔اس ماہ میں ہم اردو کی ترقی کے لئے اپنی اپنی سطح پر مختلف کام کر سکتے ہیں۔ یہ اجتماعی سطح پر بھی ہو سکتا ہے اور انفرادی سطح پر بھی۔ انفرادی سطح پر ہم اپنے طور پر اپنی زبان سے متعلق کوئی بھی فیصلہ کر کے اس کو عملی جامہ پہنا سکتے ہیں۔اس میں ہم پوری طرح آزاد ہیں۔لیکن اجتماعی طور پر کوئی فیصلہ لیتے ہوئے ہمیں بہت سوچ سمجھ کر انتہائی دانشمندانہ فیصلہ لینا ہوگا (کہ اردو والوں میں نفاق باہمی کی وبا عام ہے) مشاعرے اور ادبی سیمینار بہت ہو چکے اور ہوتے رہیں گے اور اس کے جو فائدے ہیں وہ ہم سب پر عیاں ہیں۔اس موقعے سے ہمیں کچھ ایسے کام کرنے چاہئیں جو اردو کی عملی اور اصلی ترقی کے ضامن ہوں۔

اردو کی ترقی کے عملی اور اصلی کاموں میں کچھ اس طرح ہو سکتے ہیں۔ہم میں سے ہر اردو والا یہ عہد کرے کہ وہ کم از کم پانچ افراد کو خود اردو پڑھائے گا یا اگر یہ ممکن نہ ہو تو پانچ افراد کو اردو پڑھوائے گا۔اگر ہم نے اس پورے مہینے میں ایمانداری سے یہ کام کر لیا تو دیکھیں گے کہ بہتر نتیجے سامنے آنے لگے ہیں۔یہ کام شہر، قصبہ اور چھوٹے چھوٹے گاؤں ہر سطح پر کیا جا سکتا ہے۔

آج انگلش میڈیم اسکولوں کا زور ہے اور ہم میں سے بیشتر لوگ انہیں اسکولوں میں اپنے بچوں کو ڈالنے میں عافیت سمجھتے ہیں کہ ان اسکولوں کا انتظام وانصرام تو بہتر ہوتا ہی ہے، معیار تعلیم بھی کہیں بلند ہوتا ہے۔(اردو میڈیم اسکولوں سے معذرت کے ساتھ) لیکن یہ کہہ کر ہم گلو خلاصی حاصل نہیں کر سکتے۔ٹھیک ہے اپنے بچوں کو ان اسکولوں میں ڈالیں، شوق سے ڈالیں۔لیکن خدارا اپنے بچوں کو اپنے کلچر اور اپنی تہذیب سے بیگانہ نہ کریں۔انہیں خود گھر پر اردو پڑھائیں یا پڑھانے کا انتظام کریں۔

خط و کتابت میں ممکنہ حد تک اردو کا بھی استعمال کیا جا سکتا ہے۔ پوسٹ کارڈ کی قیمت آج بھی محض پچاس پیسے ہے۔اگر ہم ایک مہینہ میں صرف دس کارڈ اردو میں لکھیں تو کم از کم پانچ کارڈ تو ضرور منزل مقصود پر پہنچ جائیں گے۔ البتہ پتہ میں پن کوڈ انگریزی میں ضرور لکھیں۔اپنی دکانوں کے سائن بورڈ، مکانوں پر نام کی تختی لازماً اردو میں بھی لگوائیں۔اپنی گلی، سڑک اور محلے کے نام میونسپل کارپوریشن/ میونسپلٹی کے حکام پر زور ڈال کر اردو میں بھی لگوائیں۔ یہ کام اپنی زبان کی خاطر ہم خود بھی کر سکتے ہیں۔ معمولی صرفہ پر ہم اپنی شان اور شناخت برقرار رکھ سکتے ہیں۔شادی،

عقیقہ اور اس طرح کی دیگر تقریبات کے کارڈس میں دیگر زبان کے ساتھ اردو کا استعمال بھی لازماً کریں۔

آج صورت حال یہ ہے کہ ہم اردو کتب ورسائل خرید کرنہیں پڑھتے۔ روزانہ انگریزی اخبار تو خریدتے ہیں لیکن اردو اخبار ہم مانگ کر پڑھتے ہیں۔ اس صورت حال پر ہمیں سنجیدگی سے غور کرنے کی ضرورت ہے۔ ہم ہر ماہ حسب استطاعت ایک دو کتابیں، ایک دو رسالے اور روزانہ کم از کم ایک اردو اخبار خرید کر پڑھیں۔ ان سب پر اوسطاً ایک سو سے دوسو روپے تک خرچ آئے گا۔ اگر ہم اپنے کام و دہن کے لئے چائے اور پان پر چار پانچ سو روپے ماہانہ خرچ کر سکتے ہیں تو ذہن و دماغ اور مادری زبان کے لئے دو تین سو روپے کیوں نہیں خرچ کر سکتے؟ کچھ کم قیمت والے رسائل اور کتب خرید کر ہم اپنے رشتہ داروں، عزیزوں اور دوستوں کو تحفتاً پیش کر سکتے ہیں۔ مثلاً 'آجکل' کی قیمت آج بھی محض سات روپے ہے۔ اب اگر ہم پانچ کاپیاں خرید کر تحفتاً تقسیم کرتے ہیں تو ہماری جیب پر مبلغ 35 روپے کا بوجھ پڑے گا۔ لیکن اس سے ہمیں جو سکون اور طمانیت حاصل ہوگی وہ 35 روپے میں برا نہیں۔

آیئے! ہم ماہ نومبر کو ماہ اردو کے طور پر مناتے ہوئے عہد کریں کہ مذکورہ بالا باتوں کو اپنی زندگی میں عملی طور پر نافذ کریں گے۔ یہ نہ صرف مولانا ابوالکلام آزاد اور علامہ اقبال کے تئیں ہمارا سچا اور بامعنی خراج عقیدت ہوگا بلکہ اپنی زبان وادب کے تئیں سچی خدمت بھی۔

(نومبر 2002)

4 جنوری 2014 کو میرا یار ڈاکٹر عبیدالرحمٰن بھی مجھ سے بچھڑ گیا۔ آہ! میں کیسے کچھ اظہار خیال کروں کہ زبان گنگ ہے اور دماغ ماؤف۔ وہ سائنس داں تھا، انگریزی میں ایک سائنس میگزین کا ایڈیٹر تھا، بہت کامیاب ایڈیٹر۔ وہ اردو کی گنگا جمنی تہذیب کا پروردہ تھا۔ چنانچہ وہ اردو میں اعلیٰ معیار کی شاعری کرتا تھا اور نثر نگاری میں بھی اپنا ثانی نہیں رکھتا تھا۔ عبیدالرحمٰن کی تحریر و تقریر میں سائنسی مزاج کا اظہار ہوتا تھا۔

زمیں کھا گئی آسماں کیسے کیسے

نوبل انعام یافتہ ٹیگور

ہمارا ملک محبان وطن اور دیش بھکتوں سے خالی نہیں۔ابوالکلام آزاد اور اقبال کا ذکر ہم پہلے ہی کر چکے ہیں۔آج ہم ربندر ناتھ ٹیگور کا ذکر خیر کریں گے۔ ٹیگور ہمارے دیش کے ان سپوتوں میں سے ہیں جنھوں نے نئے ہندوستان کی تعمیر کے لئے اپنی تحریروں سے کارہائے نمایاں انجام دئے۔

ٹیگور کا تخلیق کردہ 'جن گن من ادھینا ئک جے ہے، بھارت بھاگیہ ودھاتا' ہر دیش واسی کا پسندیدہ ترانہ ہے اور ہر قومی تہوار کے موقع پر اسے بڑے احترام وعقیدت سے گایا جاتا ہے۔ ٹیگور یوں تو سیکڑوں تصانیف اور بیش قیمت تحریروں کے خالق ہیں اور ان میں سے بیشتر اپنی اپنی جگہ آفتاب وماہتاب ہیں۔لیکن یہ ایک ترانہ ان کی قومی شخصیت کی شناخت بن گیا ہے۔

ٹیگور نہ صرف ایک سچے دیش بھکت اور محب وطن تھے بلکہ شانتی کے ایک بہت بڑے امین بھی تھے۔1915ء میں ٹیگور کو 'نائٹ' کے خطاب سے نوازا گیا لیکن اسے انہوں نے جلیانوالہ باغ قتل عام کے خلاف احتجاج کرتے ہوئے لوٹا دیا۔ یہ ان کی امن پسندی اور انصاف دوستی کا تقاضا تھا چنانچہ انہوں نے انگریزوں کا دیا ہوا خطاب لوٹا کر اپنے شانتی کے پیغام کو بڑے خوبصورت انداز میں پوری دنیا کے سامنے پیش کیا۔شانتی کے دوت کی حیثیت سے پوری دنیا میں ان کی ایک خاص پہچان ہے۔شانتی نکیتن ان کے مشن کا سب سے بڑا جیتا جاگتا اور عملی نمونہ ہے۔ مغربی بنگال کے بولپور میں جب 1901ء میں ربندر ناتھ ٹیگور نے شانتی نکیتن کا قیام کیا تو انہوں نے اسی وقت ساری دنیا کو شانتی کا پیغام دے دیا تھا۔ شانتی نکیتن دراصل ربندر ناتھ ٹیگور کی آرزوؤں کا گہوارہ ہے اور انہوں نے اس ادارہ کی جس طرح ترتیب وتنظیم کی تھی اس سے اس نے بچوں کی تعلیم وتربیت کے ایک مثالی ادارہ کے طور پر اپنی شناخت بنالی۔ فطری ماحول میں اور فطری انداز میں تعلیم

وتربیت کا یہ انداز گو کہ پہلے سے آزمودہ اور قابل قبول رہا ہے لیکن ٹیگور نے اسے جس طور پر آئیڈیل بنا کر پیش کیا اس سے ٹیگور کی پہچان ایک کامیاب ماہر تعلیم کے روپ میں ابھر کر سامنے آئی۔

ٹیگور کا ایک بڑا کارنامہ 'گیتانجلی' ہے۔ یہ ٹیگور کی سب سے کامیاب تصنیف مانی جاتی ہے۔ جب درد وسوز اور روح کی گہرائی سے نکلا جذبہ تحریر کا روپ دھار لے تو وہ واقعی لافانی اور شاہکار ہو جاتا ہے۔ 1902ء سے 1907ء کے درمیان ٹیگور نے پے در پے کئی صدمے سہے۔ پہلے بیوی مریں، اس کے بعد بیٹا داغ مفارقت دے گیا اور پھر بیٹی نے موت کی آغوش میں پناہ لی۔ یہ تینوں انہیں بے حد عزیز تھے۔ ان کی جدائی کا درد جب ایک نقطہ پر سمٹ کر آ گیا تو اس نے 'گیتانجلی' کی شکل اختیار کر لیا۔ اسی 'گیتانجلی' کے لئے ٹیگور کو 1913ء میں ادب کے نوبل پرائز سے نوازا گیا۔

شانتی کا پیغام اور صالح ادبی روایات کی تشہیر کے لئے ٹیگور نے 1916ء سے 1941ء تک دنیا کے مختلف ممالک میں لیکچر دیئے۔ ان ممالک میں یورپ، امریکہ، چین، جاپان، ملایا اور انڈونیشیا وغیرہ شامل ہیں۔ یہ وہ دور تھا جب دنیا نے دو بڑی جنگوں کے مصائب جھیلے تھے اور انہیں شانتی اور امن کی سخت ضرورت تھی۔

ٹیگور اپنے دور کے شانتی کے ایک بڑے نقیب تھے تو دوسری طرف ہٹلر امن، شانتی اور انسانیت کا سب سے بڑا دشمن تھا۔ اس کی پہچان موت کے ایک عظیم سوداگر کے طور پر مسلم ہو چکی تھی۔ ہٹلر سے جہاں ساری خلقت پریشان تھی وہیں اپنے دور کا سب سے بڑا سائنس داں آئنسٹائن بھی اس کے مظالم سے نالاں تھا۔ چنانچہ اس نے ہٹلر کی ظلم وزیادتی سہنے کے مقابلے ترک وطن کو ترجیح دی۔

1945ء کی ہولناک جنگ عظیم کے بعد آئنسٹائن نے نیوکلیائی ہتھیاروں کے خلاف ایک زبردست مہم چھیڑ دی۔ البرٹ آئنسٹائن نے ہمیشہ اس بات پر زور دیا کہ نیوکلیائی طاقت کا استعمال انسانیت کی بھلائی کے لئے کیا جانا چاہئے نہ کہ اس کی بربادی کے لئے۔

ٹیگور اور آئنسٹائن میں ایک بڑی مماثلت یہ ہے کہ دونوں ہی امن پسند اور شانتی کے دوت تھے۔ ان دونوں میں ایک مماثلت یہ بھی ہے کہ ان دونوں کو اپنے اپنے شعبہ میں نمایاں کارکردگی کے لئے نوبل انعام سے نوازا گیا۔ ٹیگور کو 1913ء میں ادب کے لئے اور آئنسٹائن کو 1922ء میں سائنس میں فوٹو الیکٹرک ایفکٹ کے لئے۔

بات جب نوبل انعام کی نکل آئی ہے تو دو شبد اس پر بھی۔ ایک موت کے سوداگر (الفریڈ نوبیل) کو جب اپنی غلطی کا احساس ہوا تو اس نے ڈائنا مائیٹ بیچ کر کمائی ہوئی ساری رقم سے سودمند ایجادات کرنے والے موجدوں اور امن کے لئے کوشاں افراد کو نوازنے کی وصیت کی۔

کی مرے قتل کے بعد اس نے جفا سے توبہ
ہائے اس زود پشیماں کا پشیماں ہونا

صحیح ہے کہ 'بد اثرات' جلد ختم نہیں ہوتے۔ اس بار کا نوبل انعام دنیا کی 'عظیم' طاقت امریکہ کے سابق صدر کو امن کے لئے دیا گیا ہے۔ کیا خوب؟ حیراں ہوں کہ رووٗں کہ پیٹوں جگر کو میں۔ آئنسٹائن بھی دودھ کا دھلا نہیں۔ اسے بھی 'بربادی' کے اس الزام سے صاف بری نہیں کیا جاسکتا۔ لیکن اس کی علمیت اور اس کی ایجاد سے انکار نہیں کیا جاسکتا۔

خیر! بات ہو رہی تھی ٹیگور اور آئنسٹائن کی۔ ٹیگور کی آئنسٹائن سے پہلی ملاقات برلن میں 1926ء میں ہوئی تھی۔ اس پہلی ملاقات میں ہی دونوں ایک دوسرے سے کافی متاثر ہوئے۔ دونوں ہی ایک دوسرے کی علمیت کے قائل ہوئے۔ ان دونوں کی دوسری ملاقات 1930ء میں ہوئی۔ اس ملاقات میں ان دونوں کے مابین جو گفتگو ہوئی وہ کتابوں میں محفوظ ہو گئی ہے اور پڑھنے سے تعلق رکھتی ہے۔

ٹیگور اور آئنسٹائن کے بیچ گفتگو میں مختلف موضوعات زیر بحث آئے۔ ان میں منطق، فلسفہ، مذہب، ادب و شاعری، مصوری اور موسیقی سبھی کچھ شامل ہیں۔ اس گفتگو سے ان دونوں لیجنڈ کا مختلف علوم وفنون سے شغف اور دلچسپی کا پتہ چلتا ہے۔ واضح ہو کہ آئنسٹائن بنیادی طور پر سائنس داں تھا لیکن دوسرے میدان میں بھی اسے درک حاصل تھا۔ اسی طرح ٹیگور بنیادی طور پر شاعر تھے، لیکن مصوری اور موسیقی میں بھی جس مہارت کا مظاہرہ کیا ہے وہ ہمارے لئے قابل رشک ہے۔

ٹیگور کی ادبی حیثیت کا ایک زمانہ قائل ہے۔ اپنے زمانے کا مشہور مغربی ادیب ولیم بٹلرئیس نے گیتانجلی کا جو دیباچہ لکھا ہے وہ پڑھنے سے تعلق رکھتا ہے۔ اس کے مطالعہ سے ہمیں دو باتوں کا بخوبی اندازہ ہوتا ہے۔ ایک یہ کہ ایک مغربی ادیب 'گیتانجلی' اور ٹیگور کی علمی و ادبی حیثیت کا کس قدر مداح و قائل تھا۔ دوسرے یہ کہ 'گیتانجلی' کا یہ اعجاز ہی ہے کہ جب ایک مغرب کا مصنف اس پر دیباچہ لکھنے/تبصرہ کرنے بیٹھتا ہے تو خود شاعری کرنے لگتا ہے۔ (دسمبر 2002)

ادب ہے شرط....

اردو میں ان دنوں کتابیں خوب چھپ رہی ہیں، سیکڑوں کی تعداد میں۔ سیکڑوں کی تعداد میں انعام بھی بانٹے جارہے ہیں۔ اس لحاظ سے دیکھا جائے تو آج اردو ایک بہت اچھے دور سے گزررہی ہے۔ پھر یہ رونا گانا کیسا؟

آیئے اس کا دوسرا پہلو دیکھتے ہیں۔ کتابیں سیکڑوں کی تعداد میں چھپتی ضرور ہیں لیکن کیا یہ فروخت بھی ہوتی ہیں؟ جواب نفی میں ہے۔ کیا ہم نے کبھی اس بات پر غور کیا کہ ایسا کیوں ہے؟ نہیں، شاید اس کی ضرورت ہی نہیں۔ کتابیں چھپ رہی ہیں اور لوگ دھڑا دھڑ صاحب کتاب بن رہے ہیں۔ صاحب کتاب خوش کہ وہ صاحب کتاب ہوئے۔ ہم اس لیے خوش کہ چلو ایک کتاب اور مُفت ہاتھ آئے تو برا کیا ہے۔ یہ صورت حال عام ہے۔ آج بھی میر، غالب اور اقبال ہی سب سے زیادہ بکتے ہیں۔ ہم آپ نہیں۔ آخر اس کی وجہ کیا ہے۔ کیا ہم نے اس پر غور کیا؟ نہیں، شاید اس کی ضرورت ہی نہیں۔

عام لوگوں کی توجہ کا مرکز وہی ادب ہوگا جو ادب عالیہ ہوگا۔ باقی اپنی موت آپ مرجاتا ہے۔ چاہے آپ لاکھ خوش ہولیں، آپ کی یہ خوشی جھوٹی اور مصنوعی ہوگی اور اس خوشی کو آپ بہت دنوں تک برترار نہیں رکھ سکتے۔

آج کتابیں لکھنے کا سب سے بڑا کارخانہ ہماری یونیورسٹیاں ہیں۔ جہاں ایم فل اور پی ایچ ڈی کرنے والوں کو لازماً ایک ایک تھیسس رڈیزرٹیشن جمع کرنا ہوتا ہے۔ جس کے عوض انہیں ڈگری عطا کردی جاتی ہے۔ اب یہ اور بات ہے کہ بقول رضا نقوی واہی مرحوم:

کس نے تحقیق مقالہ لکھا کس کے نام سے
کون دلّی جا کے پوچھے گا یہ مالک رام سے

اور اب تو مالک رام بھی زندہ نہیں رہے۔ ستم کی بات یہ ہے کہ پھر یہ اسکالرس اس تھیسس یا ڈیزرٹیشن کو چھپوانا بھی ضروری سمجھتے ہیں۔ ستم بالائے ستم یہ کہ کتاب چھپواتے وقت انہیں یہ بھی یاد نہیں رہتا کہ انہوں نے دوران ریسرچ کہاں کہاں سے اور کس کس کا مال اڑایا تھا۔ بلکہ اسے تو وہ اپنی قابلیت اور علمیت کی دلیل سمجھتے ہیں کہ انہوں نے اتنا اہم کام کیا۔ ایسے ایسے خوبصورت جملے تراشے، ایسے ایسے پیراگراف لکھے۔ جب کہ حقیقت یہ ہے کہ ان میں سے بیشتر چبائے ہوئے نوالے ہوتے ہیں اور بار بار چبانے کی وجہ سے ایک گھناؤنی کیفیت پیدا ہو چکی ہوتی ہے۔

یونیورسٹی سے باہر ہونے والے کام میں بھی قبیح صورت حال سامنے آئی ہے۔ کتاب لکھ دو اور کتاب لکھوالو کی صدائیں آج خوب خوب گونج رہی ہیں۔ ہمارے یہاں بزرگ ادیبوں میں کئی ایسے ادیب ہیں، جواب اس بات کے متمنی نظر آتے ہیں کہ کوئی ان پر کتاب لکھ دے یا کوئی رسالہ ان پر نمبر نکال دے۔ ہوس اور نام ونمود کی اس دوڑ میں ہمارے کچھ اچھے اور جنوین ادیب بھی شامل ہیں۔ ادب ہے شرط منہ نہ کھلوائیں۔

دوسری طرف وہ لوگ ہیں جو کان پر پنسل/قلم پھنسا کر گلی گلی گویا آواز لگاتے پھرتے ہیں کہ مضمون لکھوالو، کتاب لکھوالو، نمبر نکلوالو۔ ایسے لوگوں کی بھی کمی نہیں۔ ایسے لوگوں کے پیش نظر دو فائدے ہوتے ہیں۔ ایک یہ کہ کچھ ان کی روزی روٹی کا مسئلہ حل ہوتا ہے اور دوسرے یہ کہ مفت بیٹھے بٹھائے صاحب کتاب ہونے کا اعزاز بھی حاصل ہو جاتا ہے۔ مذکورہ دونوں شخصیات میں بڑا گہرا ربط ہوتا ہے۔ دونوں لازم وملزوم کی حیثیت رکھتی ہیں کہ ایک کا کام دوسرے کے بغیر نہیں چلتا۔

ہمارے کئی بزرگ ادیب ایسے ہیں جنہوں نے ایام تخلیقیت میں کچھ نہ کچھ کیا۔ اپنی جانب متوجہ بھی کیا۔ ہم کہہ سکتے ہیں کہ ادب میں یوگدان بھی دیا۔ لیکن اب وہ Exhaust ہو چکے ہیں اور اپنے آپ کو دوہرا رہے ہیں۔ دوہرانا ایک انتہائی اُباؤ عمل ہوتا ہے چنانچہ اپنے اس عمل سے وہ بہت جلد اوب بھی جاتے ہیں۔ آپ اپنی سہولت کے لیے اسے ایام ناامیدی سے موسوم کر سکتے ہیں۔ زندگی کے اس آخری پڑاؤ پر ان کی شدید خواہش ہوتی ہے کہ ان کے فن پر، ان کی شخصیت پر دو چار کتابیں آ ہی جائیں کہ مبادا لوگ انہیں بھلا نہ دیں۔ انہیں شاید اپنے فن/تخلیقی کام پر بھروسہ نہیں ہوتا (ورنہ سچا فنکار عام طور پر بیگانہ ہوتا ہے۔ اس کی بے شمار مثالیں موجود ہیں)۔

ایسی کتابیں لکھوانے کے لیے کئی طریقے استعمال کیے جاتے ہیں۔ ایک تو یہی کہ اپنے کسی عزیز، رشتے دار یا کسی شاگرد کا انتخاب کیا جاتا ہے اور انہیں اپنے سامنے بٹھا کر اپنی زندگی اور فن کے بارے میں سب کچھ خود ہی لکھوا دیا جاتا ہے۔ اس طرح انہیں اطمینان ہوتا ہے کہ کوئی بات ان کی پسند کے خلاف درج نہیں ہوئی۔ دوسری صورت یہ ہوتی ہے کہ آپ کے پاس جتنا کچھ مواد اپنے بارے میں دستیاب ہے وہ کسی 'قابل' 'اسکالر' کو فراہم کر دیجئے اور اطمینان کر لیجئے کہ آپ پر مرتبہ اس کتاب میں وہ اپنی مرضی سے کیا کیا نکتے نکالتا ہے یا کیا کیا گل بوٹے کھلاتا ہے۔ یہاں پر آپ کی انا کو کچھ تسکین ہوتی ہے کہ صاحب کتاب نے اپنی مرضی سے آپ کے بارے میں گل افشانیاں کی ہیں۔

اس طرح کی کتاب کی دوسری قسم وہ ہوتی ہے، جس میں مختلف لوگوں سے اس 'شخصیت' پر مضامین لکھوا کر مرتبہ کتاب کی صورت میں شائع کیے جاتے ہیں۔ یہ نسبتاً سہل طریقہ ہے۔ مرتب کا کام صرف جمع و ترتیب اور دو چار صفحہ کا پیش لفظ ہوتا ہے بس۔ اس طریقہ میں ممدوح شخصیت اس لیے زیادہ خوش ہوتی ہے کہ اس میں اکٹھے بیس پچیس لوگوں کے مضامین/تعریف نامے شامل ہو جاتے ہیں اور مرتب اس لیے خوش کہ اس کا کام زیادہ آسان ہو جاتا ہے۔

آج اردو میں بہت سے رسالے نکل رہے ہیں جو صرف اسی طریقے سے چل رہے ہیں۔ رسالے کے مدیر نے کسی 'شخصیت' سے بات کر لی کہ ہم آپ پر نمبر نکالنا چاہتے ہیں۔ اس کام پر اتنا خرچ آئے گا، وہ آپ ادا کریں گے۔ اس طرح دونوں کا کام بن جاتا ہے۔ اس 'شخصیت' نے لافانی ہونے کا سامان کر لیا اور مدیر نے اپنے رسالے کی دو چار سانسیں اور بڑھا لیں۔

بہت سے لوگ اس طرح کے کام بظاہر 'بے غرض' ہو کر کرتے ہیں لیکن اسے کیا کیجئے کہ اس بے غرضی میں بھی غرض جھلک جاتی ہے۔ ایک ہمارے دوست ہیں جنہوں نے ایک 'بڑے نام' کا مطبوعہ افسانوی مجموعہ من و عن دوسرے نام سے اس طرح چھاپا گویا یہ اس 'بڑے نام' کا دوسرا 'بڑا کام' ہے۔ لیکن جب ہم نے پڑھنا شروع کیا تو معلوم ہوا کہ اس میں 'قاری' کے لیے تو کوئی نئی چیز ہے ہی نہیں بلکہ صرف اپنے ممدوح کو خوش کرنے کے لیے نام بدل کر اسی چیز کو خوبصورت انداز میں پیش کر دیا گیا ہے یعنی مال پرانا اور لیبل نیا۔

کچھ صاحبان ایسے ہیں جو ادب کی ہر صنف اور ہر موضوع پر کتاب لکھنا، ترتیب دینا اپنا حق

سمجھتے ہیں۔اسی طرح وہ ہر کتاب اور ہر رسالہ میں اس طرح نظر آتے ہیں جیسے کسی گھر میں رکھی ہوئی چپل۔گویا وہ ادبی ہوائی چپل ہیں۔

یہ عام صورت حال ہے اور یہ ایک ایسا جرم ہے جس کے خلاف ادب کی دنیا میں کوئی تعزیر بھی نہیں۔چنانچہ یہ جرم اپنی انتہا کو پہنچ چکا ہے۔اس جرم پر قابو پانے کی کوئی نہ کوئی تدبیر ضرور کرنی ہوگی۔ورنہ ایک دن وہ آئے گا جب یہ وبا تعفن کی صورت پیدا کرے گی اور اس کی زد میں صاف ستھرا اور اچھا ادب بھی آجائے گا۔ (جنوری 2003)

میرا خیال ہے کہ آج جدید رجحان میں سب سے نمایاں بات یہ ہے کہ ہم دو خانوں میں بٹے ہوئے ہیں۔آج اردو کی ادبی دنیا دو قطبین یعنی ساؤتھ پول (S) اور نارتھ پول (N) میں منقسم ہے اور جو ان دو خانوں میں سے کسی ایک میں نہیں ہے وہ کہیں بھی نہیں ہے اور اس کی کوئی وقعت نہیں، کوئی پوچھ نہیں۔اس سلسلے میں مجھے فلم شعلے کا وہ ڈائیلاگ یاد آتا ہے کہ ''ہم انگریزوں کے زمانے کے جیلر ہیں، خبردار! آدھے اِدھر جاؤ آدھے اُدھر جاؤ اور باقی میرے پیچھے آؤ۔'' کاش! کسی تیسری غیر جانب دار اور باصلاحیت ادیبوں کی نسل سامنے آسکتی جو اپنے وجود کا احساس کرا سکتی۔

معاملہ اردو میڈیم اسکولوں کا

شکر ہے آج بھی چند اسکول ہیں جو اردو میڈیم سے چل رہے ہیں اور ان میں سے کچھ اسکول ایسے ہیں جو اچھا رزلٹ بھی کر رہے ہیں۔ لائق مبارکباد ہیں وہ والدین جو اپنے بچوں کو ان اسکولوں میں پڑھا رہے ہیں۔ یہ نہ صرف ان کی اردو دوستی کا ثبوت ہے بلکہ ایسے حضرات اپنی اس اردو دوستی کے ذریعہ وطن پرستی اور اپنی تہذیب وثقافت کی پاسداری کا علم بھی بلند کیے ہوئے ہیں۔

آپ میری بات کو 'یوں ہی' کہہ کر نہیں اڑا سکتے۔ ان اسکولوں میں پڑھنے والے بہت سے بچے ایسے ہوتے ہیں جو اچھے اور خوشحال گھرانوں سے تعلق رکھتے ہیں اور ان کے پاس اتنی سکت ہوتی ہے کہ وہ اپنے بچوں کو اچھے سے اچھا اسکول میں پڑھا سکیں۔ لیکن نہیں، وہ ایسا نہیں کرتے۔ کیونکہ انہیں اپنی زبان پیاری ہے، اپنی تہذیب سے محبت ہے، اپنا کلچر عزیز ہے۔ اور سب سے بڑھ کر یہ کہ اپنے وطن عزیز سے انہیں بے حد پیار ہے۔

جی ہاں! ہم اپنے بچوں کو اردو پڑھا کر یا اردو میڈیم سے پڑھا کر اپنی وطن دوستی کا ہی ثبوت دیتے ہیں کہ اردو خالص ہندوستانی زبان ہے۔ اردو اسی ہندوستان میں پلی بڑھی، پھلی پھولی اور شباب کی منزل کو پہنچی۔ یاد رکھیے! اردو کی حیثیت پہلے حسینۂ ہند (مس انڈیا) کی ہے، پھر حسینۂ عالم (مس ورلڈ/مس یونیورس) کی ہے۔ داغ نے ایک صدی پہلے کہا تھا:

اردو ہے جس کا نام ہمیں جانتے ہیں داغ
ہندوستاں میں دھوم ہماری زباں کی ہے

یہ ہماری خوش فہمی ہی ہے کہ ہم نے داغ کے اس شعر میں 'ہندوستاں' کی جگہ 'سارے جہاں' کو کچھ اس طرح چسپاں کیا کہ اب اصل مصرعہ ''سارے جہاں میں دھوم ہماری زباں کی ہے'' ہو کر رہ گیا۔ واقعہ یہ ہے کہ اب ہندوستان میں تو اردو راندۂ درگاہ ہوتی جا رہی ہے جب کہ سارے

جہاں میں اس کا ڈنکا بج رہا ہے۔ چاہے وہ مشاعروں، قوالیوں، فلمی گانوں اور سیمناروں تک ہی کیوں نہ محدود ہو۔ اور ایسا بھی نہیں ہے، بہت سی جگہوں پر یہ عام بول چال میں بھی رائج ہے۔ خاص طور پر وہاں جہاں ہندوستانیوں کی ایک معتد بہ تعداد موجود ہے۔ اور خیر سے دنیا میں وہ کون سی جگہ ہے جہاں ہندوستانی موجود نہیں۔ اور یہ ناممکن ہی ہے کہ جہاں ہندوستانی ہوں وہاں اردو نہ ہو۔

تو ثابت یہ ہوا کہ سارے جہاں میں 'ہندوستانی' ہیں اور ہندوستانی ہیں تو اردو بھی ہے لیکن اگر ہندوستانی نہیں ہیں تو ہندوستان میں، اور اردو نہیں ہے تو ہندوستان میں۔ مطلب یہ کہ ہم بنگالی ہیں، اڑیہ ہیں، کنڑ ہیں، گجراتی ہیں، مراٹھی ہیں، تمل ہیں، تلگو ہیں اور نہ جانے کیا کیا ہیں اور نہ جانے کتنے خانوں میں بٹے ہوئے ہیں اور نہیں ہیں تو ہندوستانی اور اگر ہیں تو پہلے بنگالی پھر ہندوستانی، پہلے مراٹھی پھر ہندوستانی پہلے گجراتی پھر ہندوستانی۔

خانوں میں بٹنا اور علاقائی شناخت کا تحفظ شاید انسانی فطرت ہے یہ انسان کی سرشت میں شامل ہے، لیکن اس کے جو نقصانات ہیں وہ ہم سب پر ظاہر ہیں۔

دیکھئے بات کہاں سے کہاں جا پہنچی۔ بات ہو رہی تھی اردو میڈیم اسکولوں کی اور بات پہنچ گئی بین الاقوامی منظر نامے تک۔ اب اسے اردو کی خوش نصیبی کہئے یا بد نصیبی۔ جسے اپنے ملک کے اسکولوں میں نیچی نظر سے دیکھا جاتا ہو وہی بین الاقوامی منظر نامے میں اپنی موجودگی درج کراتی نظر آتی ہے۔

آج انگریزی میڈیم اسکولوں میں اپنے بچوں کو پڑھانا سماجی وقار کا مسئلہ بن گیا ہے۔ ایک طرح سے یہ اسٹیٹس سمبل بن گیا ہے۔ یہ اور بات ہے کہ چاہے ان کے بچے ان اسکولوں میں نہیں چل پا رہے ہوں۔ چاہے ان انگریزی اسکولوں میں پڑھانے کی ان کے پاس سکت نہ ہو۔ ان کے گھر کا ماحول انگریزی نہ ہونے کی وجہ سے ان کے بچے پچھڑتے جا رہے ہوں، احساس کمتری کے شکار ہوتے جا رہے ہوں، لیکن پڑھائیں گے انہیں انگلش میڈیم اسکولوں میں کہ یہ ان کے وقار کا سوال ہے۔

یہ بات اب جگ ظاہر ہے کہ بچوں کو ان کی مادری زبان میں ہی تعلیم دی جانی چاہئے۔ کم از کم بنیادی تعلیم تو لازماً مادری زبان میں ہی ہونی چاہئے کہ ہمارا گھریلو ماحول، ہمارا آس پاس پڑوس اور ہمارا سماج اسی کا پروردہ ہے۔ اب اگر ایسے میں انگریزی یا کسی اور زبان میں تعلیم دی جائے گی تو مشکلات اور پریشانیاں تو آئیں گی ہی۔ کبھی کبھی تو ایسا بھی ہوتا ہے کہ پتلون کی تاک

میں لنگوٹی بھی چلی جاتی ہے اور بڑی شئے کی چاہ میں ہم چھوٹی چیز سے بھی ہاتھ دھو بیٹھتے ہیں۔ مثالیں ہمارے سامنے ہیں۔ انگریزی اسکولوں کی چاہ میں ہم اپنے اسکولوں کو لگاتار اور مسلسل نظر انداز کرتے چلے جارہے ہیں۔ نتیجہ یہ ہورہا ہے کہ ہمارے اپنے تعلیمی ادارے خواہ وہ ہندی میڈیم کے ہوں یا اردو میڈیم کے مسلسل پچھڑتے چلے جارہے ہیں۔

یوں کہنے کو تو ہم اپنی زبانوں کی آبیاری خوب خوب کررہے ہیں۔ لیکن ہماری یہ ساری کوششیں کسی پیڑ یا پودے کے پھول پتیوں پر پانی کے چھڑکاؤ کے مترادف ہیں۔ ہماری ساری کوششیں اوپر اوپر کی اور ظاہری چمک دمک کی ہیں۔ جڑوں میں پانی ڈالنے اور صحیح آبیاری پر نہ تو کسی کی توجہ جارہی ہے اور نہ ہی شاید اس کی ضرورت محسوس کی جارہی ہے۔ نتیجتاً یہ ہے ہمارے یہ پودے سوکھتے جارہے ہیں۔

عام طور پر اب ایسا دیکھا جارہا ہے کہ ہم اپنی زبان کی طرف سے مایوسی کے شکار ہیں اور احساس کمتری میں مبتلا ہوتے جارہے ہیں کہ ہماری زبان سکڑ چکی ہے نیز یہ کہ یہ ایک چھوٹی زبان ہے۔ زبان چھوٹی ہو یا بڑی، زبان تو زبان ہوتی ہے اور زبان کا تحفظ خود اپنے تشخص کا تحفظ ہوتا ہے۔ اپنی زبان کو ایک چھوٹی اور سکڑتی زبان کہہ کر ہم اپنا پلو نہیں جھاڑ سکتے۔ زبان سے محبت کی مثالیں دیکھنی ہوں تو آپ دنیا کی ہزاروں چھوٹی چھوٹی زبانوں کو دیکھیں جن کے بولنے والے نہ صرف اپنی ان زبانوں سے پیار کرتے ہیں بلکہ ان میں دنیا کے سارے کام کرتے ہیں، بہترین تخلیقی 'تنقیدی' تحقیقی اور کاروباری استعمال کرتے ہیں۔ تازہ مثال ابھی سامنے ہے۔ امسال کا نوبل انعام ہنگری زبان کے ادیب امرے کرتیز کو دیا گیا ہے۔ یہ وہ زبان ہے جو دنیا کی چھوٹی زبانوں میں شمار کی جاتی ہے اور اس کے بولنے والے بلاشبہ اردو بولنے والوں سے بھی کم ہیں۔

بہر حال قابل مبارکباد ہیں وہ لوگ جو اس پرآشوب دور میں بھی اردو سے محبت کرتے ہیں۔ اپنے بچوں کو اردو میڈیم اسکولوں میں ڈالنے کا جوکھم مول لیتے ہیں۔ ان اسکولوں کے وہ اساتذہ اور اسٹاف بھی مبارکباد کے مستحق ہیں جو ایمانداری سے درس وتدریس کا فریضہ انجام دیتے ہیں۔ البتہ ایسے لوگوں کو اپنا محاسبہ بھی کرنا چاہئے جو اپنے فرائض منصبی سے غفلت برتتے ہیں اور ایک نسل کی بربادی کے ذمہ دار ہوتے ہیں۔ اور اپنی کام چوری اور لاپرواہیوں سے ان اسکولوں کی بدنامی کا سبب بنتے ہیں۔

(فروری 2003)

اردو افسانے کی صورتحال

اردو میں افسانے ان دنوں خوب لکھے جا رہے ہیں اور شاید پڑھے بھی جا رہے ہیں۔ (اور میں تو ان افسانوں کو بوجوہ پڑھنے پر مجبور ہوں) لیکن میں اکثر سوچتا ہوں کہ آج کوئی افسانہ یادگار کیوں نہیں ہو پا رہا؟ اسی طرح کردار بھی افسانے کی ضرورت کے مطابق تخلیق تو ہو رہے ہیں لیکن کوئی کردار لافانی اور یادگار کیوں نہیں ہو پا رہا؟ ان دو سوالات پر اکثر میں خود سے الجھتا رہتا ہوں، لیکن کسی نتیجے پر پہنچنے سے قاصر رہتا ہوں۔

پچھلے دنوں دہلی میں اردو افسانے پر ایک سہ روزہ سیمینار منعقد ہوا۔ ڈھیر سارے مقالات پڑھے گئے اور ڈھیر سارے افسانے بھی سنے گئے۔ لیکن کیا اس سیمینار سے کچھ برآمد بھی ہوا؟ مجھے اس میں شبہ ہے۔

کہنے کو یہ ایک سہ روزہ سمینار تھا لیکن عملاً دو روز ہی ملے۔ ہر روز چار چار اجلاس ہوئے۔ ہر اجلاس ڈیڑھ سے دو گھنٹے کا ہوتا تھا اس میں چھ سے آٹھ مقالات یا افسانے پڑھے گئے۔ اس کے علاوہ ناظم اجلاس اور صدور مجلس کی نوازشات الگ۔ ایسے میں کیا مقالہ پڑھنا اور کیا مقالہ سننا۔ 'منہ پر دے مارنے' والا محاورہ سنا تھا سو عملاً اب دیکھنے کو بھی مل رہا ہے۔ مشاعرہ ہمارے یہاں بہت مقبول ہے۔ اب لگتا ہے اسی طرز پر 'مکاہنہ' یا مجلس افسانہ منعقد کرنے کی کوشش کی جا رہی ہے جو اب تک تو کامیاب نہیں ہو سکی ہے اور مستقبل میں بھی اس طور پر کامیاب ہونے کی کوئی صورت نظر نہیں آتی۔ 'لے دنا دن دے دنا دن' والے انداز میں افسانہ خوانی سامعین کو راس آ ہی نہیں سکتی۔ اس کے لیے تو چھوٹی نشستیں ہی موزوں اور مناسب ہیں۔

سمینار میں اردو کے تقریباً تمام ہی بڑے افسانہ نگار اور ناقدین موجود تھے۔ لیکن ان کے درمیان کسی قسم کا کوئی نتیجہ خیز مکالمہ ہو سکا اور نہ ہی افہام و تفہیم کی کوئی صورت پیدا ہو سکی۔ مقالہ نگار

حضرات طویل مقالے کے ساتھ ڈائس پر وارد ہوتے رہے اور' کچھ اِدھر سے کچھ اُدھر سے' پڑھ کر جاتے رہے۔ ظاہر ہے جہاں مقالوں کی تعداد زیادہ ہوگی تو وقت تو کم پڑے گا ہی۔ ایسے میں دو ہی صورتیں ہیں کہ یا تو کچھ ہی مقالہ نگاروں کو دعوت دی جائے یا پھر اگر زیادہ لوگوں کو خوش کرنا ہی مقصود ہو تو پھر ساتھ میں یہ تاکید بھی ہونی چاہئے کہ مقالہ میں گفتگو ایک دائرے میں ہی ٹو دی پوائنٹ ہو جسے دس سے پندرہ منٹ میں سمیٹا جاسکے۔ میرا دعویٰ ہے کہ مقالہ گردی کے اس شور میں شاید ہی کوئی مقالہ ٹھیک سے سنا جاسکا ہو۔ ایسے میں مقالوں کی پیشکش بلکہ پورا سیمینار ہی بے کار محض ہو کر رہ جاتا ہے۔

مجلس افسانہ کا تو اور برا حال تھا۔ ایک خانہ پری تھی جو کی جارہی تھی۔ کوئی دس سال پرانا افسانہ پڑھ رہا ہے تو کوئی غیر ضروری طویل افسانہ بلکہ ناولٹ پیش کر رہا ہے۔ ایک افسانہ نگار افسانہ پڑھ رہا ہے تو دوسرے افسانہ نگار باہر۔ کوئی زنانہ انداز میں افسانہ پڑھ رہا ہے کہ اس افسانہ کی تھیم بھی زنانہ ہے۔ کوئی کسی ایکٹر کی نقل کر رہا ہے کہ اس کا افسانہ چاہے کتنا ہی پھسپھسا کیوں نہ ہو اس ترکیب سے پسند کرلیا جائے۔ سنا کرتے ہیں کہ ایک زمانے میں ایک شاعر اوڑھنی چنی ڈال کر مشاعرہ پڑھا کرتے تھے کہ ان کی شاعری زنانہ کیفیات و واردات پر مبنی ہوتی تھی جسے وہ اپنے ہاؤ بھاؤ، شکل و صورت اور پہناوے سے متشکل کردینا چاہتے تھے۔

اس سمینار میں ہمارے اکثر دوستوں نے پرانا ہی افسانہ پڑھا۔ نئے شاید و باید۔ ان افسانہ نگاروں کے ذہن میں شاید یہ بات رہی ہو کہ جو افسانہ ان کا آزمودہ اور قارئین کا پسندیدہ ہوا سے ہی پیش کیا جائے تاکہ ہوٹنگ یا ناپسندیدگی کا خطرہ کم سے کم ہو۔

محفل میں جیسا کہ میں نے عرض کیا کہ ایک تو ایسی طویل چیز سننے کا موقع نہیں ہوتا، دوسرے یہ کہ کہانی سننے کی چیز نہیں (بے تکلف دوستوں کی چھوٹی محفلوں یا 'اڈے بازی' کی اور بات ہے) بلکہ پڑھنے کی چیز ہوتی ہے اور عام طور پر اسے رسالوں اور کتابوں میں ہی پڑھ کر لطف اندوز ہوا جاسکتا ہے۔ وہ دور گیا جب لوگ چوپال میں جمع ہوتے تھے اور کوئی داستان گو داستان چھیڑتا تھا اور سامعین ہمہ تن گوش اب کیا؟ اب کیا؟ سنتے رہتے تھے۔ اب نہ تو وہ داستانیں ہیں اور نہ وہ داستان گو--- اب وہ طویل داستانوں کا دور ختم ہو چکا ہے، بلکہ مختصر داستانوں کا بھی۔ اب وہ موڈ ہی یکسر بدل چکا ہے۔ فکشن کا بھی اور فکشن لکھنے والوں کا بھی اور سننے یا پڑھنے والوں کا بھی۔

آج کی برق رفتار زندگی میں کس کے پاس اتنا وقت ہے کہ وہ ایک لمبے وقت تک کسی افسانے کی قرأت کو بغور سنے اور اس سے لطف اندوز ہو۔ سامعین کو اس وقت اور بھی زیادہ کوفت اور مایوسی ہوتی ہے جب اسے کوئی پرانا اور باسی افسانہ سنایا جائے یا اسے سننے پر مجبور ہونا پڑے۔

آج افسانے سیکڑوں کی تعداد میں لکھے جا رہے ہیں اور جیسا کہ میں نے کہا کہ پڑھے بھی جا رہے ہیں (کہ ادب کا قاری انہیں پڑھنے پر مجبور ہے) لیکن بہت کم ہی افسانے ایسے ہیں جو اپنا نقش تادیر قائم رکھ پاتے ہیں۔ آج بھی جب فکشن کی بات ہوتی ہے تو پریم چند یا پھر ترقی پسند افسانہ نگار منٹو، بیدی، عصمت اور کرشن چندر کے افسانوں کا ہی بکھان ہوتا۔ یا اس سے بہت آگے گئے تو بلراج مین را، سریندر پرکاش، قرۃ العین حیدر اور جوگندر پال تک آتے آتے ہماری سانس پھولنے لگتی ہے۔

ایک زمانے تک افسانوں سے کہانی کی گمشدگی کا بڑا چرچا رہا۔ خیر سے وہ دور بھی گزرا اور افسانے میں کہانی کی واپسی ہوئی۔ ہم نے اطمینان کی سانس لی کہ چلو کہانی کی واپسی ہوئی۔ لیکن کیا واقعی کہانی کی واپسی ہوئی ہے؟ اگر واقعی کہانی کی واپسی ہوئی ہے تو وہ کہانی کہاں ہے؟ کون سی ہے؟ اور وہ اپنا وجود منوانے میں آخر کامیاب کیوں نہیں ہے؟ آج کوئی کہانی یادگار کیوں نہیں ہو پاتی؟

افسانوں میں کردار کی تخلیق یا کردار سازی بھی آج اس سنہری دور سے بہت پیچھے ہے جسے ہم ترقی پسند دور کے نام سے جانتے ہیں۔ آج بھی ہم جب کردار نگاری کی بات کرتے ہیں یا یادگار کرداروں کا ذکر کرتے ہیں تو انہیں کہانیوں کی طرف رجوع کرنا پڑتا ہے۔ کیا وجہ ہے کہ آج کوئی یادگار کردار تخلیق نہیں ہو پاتا؟ مطلب یہ کہ نہ پلاٹ، نہ کردار بس واقعات ہی واقعات آج کے افسانوں کی شناخت ہیں۔ تو کیا افسانہ واقعات کی کھتونی محض ہے؟

ٹھیک ہے آج بھی کچھ افسانہ نگار ہیں جن کے یہاں افسانہ کے فکر و فن کی پاسداری ہے۔ اور ان کی کوشش ہوتی ہے کہ ان کے افسانوں میں کہانی بھی ہو اور جاندار اور یادگار کردار بھی ہوں۔ لیکن تان پھر وہیں آ کر ٹوٹتی ہے کہ کیا یہ سب مذکورہ ترقی پسند افسانہ نگاروں کے افسانوں کے مدمقابل رکھے جا سکتے ہیں؟ ہمارے بعض افسانہ نویس احباب کہہ سکتے ہیں کہ جناب ان کا زمانہ اور تھا اور ہمارا زمانہ اور ہے اور اس پس منظر میں دیکھا جائے تو ہم ان سے آگے ہیں، لیکن کیا ہم اپنے اس دعوے میں حق بجانب ہیں؟

(مارچ 2003)

ہند کے عمر خیام: بچن

'**جو** بیت گئی سو بات گئی/ جیون میں ایک ستارا تھا/ مانو وہ بے حد پیارا تھا/ وہ چھوٹ گیا تو چھوٹ گیا/ امبر کے آنن کو دیکھو/ کتنے اس کے تارے ٹوٹے/ کتنے اس کے پیارے چھوٹے/ پر پوچھو ٹوٹے تاروں سے/ کب امبر شوک مناتا ہے۔'

ہندی شاعری کے عمر خیام ہری ونش رائے بچن بھی آخر ہمیں داغ مفارقت دے گئے۔ ایک شور اٹھا ہندی شاعری کے ایک یگ کا خاتمہ ہو گیا۔ میرا خیال ہے کہ ہندوستانی شاعری کا ایک اہم ستون گر گیا۔ ہندوستانی شاعری کی 'مدھوشالا' سونی ہو گئی:

ایک برس میں ایک بار ہی جلتی ہے ہولی کی جوالا ایک بار ہی لگتی بازی، جلتے دیپوں کی مالا
دنیا والو کنتو کسی دن آمدِ رالے میں دیکھیں دن کو ہولی، رات دیوالی، روز مناتی مدھوشالا

زندگی اور دنیا اور اس کی پیچیدگیوں کو سمجھنے سمجھانے اور اس کے اصول کی تفہیم کے لیے بچن نے مدھوشالا کو سب سے طاقتور اور موزوں استعارے کے طور پر پیش کیا ہے۔ زندگی کو سمجھنے کے لئے مختلف شاعروں اور ادیبوں نے مختلف استعارے وضع کیے ہیں۔ بچن نے اسے مدھوشالا یا میخانہ کہا ہے اور یہاں یقیناً وہ عمر خیام سے پوری طرح متاثر ہیں۔ بچن نے اس کا اعتراف کرتے ہوئے ایک جگہ لکھا بھی ہے:

''رباعیات عمر خیام سے میرا تعارف تو پرانا تھا، لیکن اب وہ میری محبوب کتاب ہو گئی تھی۔ رات کو تکیے کے نیچے اور دن کو میری جیب میں، خود عمر خیام کے اثرات کو میں نے اس طرح ظاہر کیا ہے:

تمہاری ہمدرا سے ابھی شکست ہوئے تھے جس دن میرے پران
اسی دن میرے منہ کی بات ہوئی تھی انتر من کی تان

میں نے عمر خیام کا ترجمہ کر ڈالا، خیام کی فکری کائنات کی رنگینی نے مجھے اس درجہ متاثر کیا کہ مجھے اپنے احساسات کے اظہار کے لیے وہی علامتیں، شراب، میخانہ، جام وسبو، ساقی وغیرہ زیادہ

موزوں معلوم ہوئیں۔ 34-1933ء میں میں نے مدھوشالا لکھی اور 1935ء میں مدھو بالا۔"

بچن آفاقیت کے حامل شاعر تھے۔ ان میں تعصب اور تنگ نظری نام کو نہ تھی۔ انہوں نے عالمی ادب کے شاہکار ادب کا مطالعہ کیا تھا اور اس سے حتی الوسع اخذ و قبول بھی کیا تھا۔ یہی وجہ ہے کہ ان کی شاعری آفاقی ہوتی گئی اور وہ خود عالمی شاعروں کی صف میں ایک نمایاں نام کے طور پر ابھر کر سامنے آئے۔

ہری ونش رائے بچن 27 ر نومبر 1907ء کو الہ آباد میں پیدا ہوئے۔ وہیں ان کی بنیادی تعلیم ہوئی۔ اعلیٰ تعلیم الہ آباد اور کاشی وشوودیالیہ سے حاصل کی۔ 1941ء سے 1952ء تک الہ آباد یونیورسٹی میں انگریزی کے لکچرر رہے۔ کیمبرج یونیورسٹی لندن سے 1954 میں پی ایچ ڈی کی۔ انہوں نے ولیم بٹلر ییٹس پر ریسرچ کی تھی۔ اور شاید یہ ڈگری حاصل کرنے والے وہ پہلے ہندوستانی تھے۔ لیکن اس سچے ہندوستانی نے انگریزی میں پی ایچ ڈی کی ڈگری حاصل کرنے کے باوجود اپنے تخلیقی جوہر کا مظاہرہ ایک ہندوستانی زبان میں ہی کیا اور سچی بات تو یہ ہے کہ انہوں نے ساری زندگی اسی عام ہندوستانی زبان کو حرز جاں بنائے رکھا۔ ہندی کے ساتھ دوسری ہندوستانی زبانوں سے بھی ان کا تعلق بڑا والہانہ اور دوستانہ رہا۔ چنانچہ ان کی شاعری میں صاف طور پر اس کی جھلک دیکھی جاسکتی ہے۔ انہوں نے اپنی زبان کے تعلق سے ایک جگہ لکھا ہے:

> "تھوڑا اردو، فارسی تھوڑی سنسکرت جاننے کا اثر میری بھاشا پر اچھا پڑا۔ اردو کے شبدوں سے مجھے کبھی پرہیز نہیں رہا۔"

مدھوشالا کا مختلف زبانوں میں ترجمہ ہو چکا ہے۔ لوگوں نے اس کے خاص انداز اور فکر و فن کی بلندی کے سبب دوسری زبانوں میں بھی اسے کافی سراہا ہے۔ لیکن اردو رسم الخط میں مدھوشالا کی پیشکش کی کچھ اور ہی بات ہے۔

مدھوشالا کے علاوہ ہری ونش رائے بچن کے اہم کارناموں میں 'مدھوبالا' اور 'مدھوکلش' بھی اہم ہیں۔ دلچسپ بات یہ ہے کہ بچن کی یہ ابتدائی تصانیف ہی ان کی شناخت کا ذریعہ بن گئیں۔ اس کے بعد انہوں نے تقریباً پچاس کتابیں اور لکھیں جن میں چار جلدوں میں "کیا بھولوں کیا یاد کروں، نیڑ کا نرمان پھر، بسیرے سے دور، اور دش ددوار سے سوپان تک" ان کی خودنوشت سوانح حیات معاصر ہندی ادب کی تاریخ میں ایک خاص اہمیت کے حامل کارنامے ہیں۔

ہری ونش رائے بچن نے انگریزی اخبار 'پانیر' میں ایک نمائندے سے لے کر وزارت خارجہ میں اسپیشل آفیسر تک مختلف عہدوں پر کام کیا اور ان سبھی جگہوں پر انہوں نے اپنا ایک نقش چھوڑا۔

انہیں ان کی ادبی خدمات کے اعتراف میں بہت سارے انعامات واعزازات سے نوازا بھی گیا۔ 1966ء میں وہ راجیہ سبھا کے رکن نامزد ہوئے۔ 1967ء میں صدر جمہوریہ نے پدم وبھوشن کے قومی اعزاز سے نوازا اور 1992ء میں انہیں برلا فاؤنڈیشن کا پہلا سرسوتی سمان ملا۔ اس کے علاوہ بھی دوسرے چھوٹے بڑے کئی اعزازات حاصل ہوئے۔ لیکن اتنے سارے انعامات واعزازات پانے والے بچن نے کبھی گھمنڈ یا فخر وغرور کا اظہار نہیں کیا۔

1973ء میں انہوں نے ایک انتہائی استعاراتی خوبصورت کتاب 'جال سمیٹا' کے نام سے اہل ادب کے سامنے پیش کر دیا۔ اس کے بعد وہ پورے تیس سال تک جئے لیکن ایسا نہیں ہے کہ وہ گمنامی کے غار میں چلے گئے۔ وقتاً فوقتاً ادب میں اپنی موجودگی کا احساس وہ کوی سمیلنوں میں شرکت کے ذریعہ کراتے رہے۔ کبھی کبھار چھوٹی موٹی تخلیق بھی پیش کرتے رہے۔ البتہ پچھلے ایک دہے سے وہ مفلوج ہو کر رہ گئے تھے۔ لیکن اتنا ضرور ہے کہ انہوں نے ایک بھرپور فطری زندگی جی۔ بھرپور ادبی زندگی گزاری۔

ہمیں افسوس ہوتا ہے جب انہیں کچھ لوگ ان کے بیٹے فلم اسٹار امیتابھ بچن کے والد کے روپ میں پہچانتے ہیں۔ فلم، تھیٹر، نوٹنکی کبھی بھی ادب وشاعری کی برابری نہیں کر سکتے۔ لفظوں کی حرمت ہمیشہ باقی رہے گی خواہ ٹی وی اور فلم کتنا ہی شور مچالیں۔ خود امیتابھ بچن کو اس بات پر فخر ہے کہ وہ ہندوستان کے ایک عظیم شاعر کے بیٹے ہیں۔ میں اپنی بات مدھوشالا کے ایک بند پر ہی ختم کرنا چاہوں گا۔

میرے شو پر وہ روئے، ہو جس کی آنکھوں میں ہالا
آہ بھرے وہ، جو ہو سُر بھی، مِدراپی کر متوالا
دیں مجھ کو وے کندھا جن کے، پد مد ڈگمگ ہوتے ہوں
اور جلوں میں اس ٹھور جہاں کبھی رہی ہو مدھوشالا

(مارچ 2003)

حسن کی تاثیر

سنتے آئے ہیں کہ ہر کامیاب مرد کے پیچھے 'ایک عورت' کا ہاتھ ہوتا ہے (غالباً ناکام مردوں پر بھی یہ بات اتنی ہی صادق آتی ہے)۔ یہ 'عورت' ہر مرد کے لیے مختلف صورتوں میں سامنے آتی ہے۔ کہیں یہ بیوی کی صورت میں ہوتی ہے تو کہیں ماں کی صورت اور کبھی کبھی یہ پھوپھی، بہن اور بیٹی کے روپ میں بھی۔ لیکن اکثر و بیشتر یہ 'عورت' دوست، محبوبہ یا معشوقہ کی صورت میں نظر آتی ہے۔ 'عورت' کے اسی روپ کی وجہ سے کوئی معمولی سی بات بھی ایک افسانہ کی صورت اختیار کر لیتی ہے۔ کسی شاعر نے کہا ہے:

کچھ تو ہوتے ہیں محبت میں جنوں کے آثار
اور کچھ لوگ بھی دیوانہ بنا دیتے ہیں

ظاہر ہے کہ کچھ نہ کچھ 'جنوں کے آثار' ضرور ہوتے ہیں جس کا 'فسانہ' بنتا ہے۔ اور یہ افسانہ قریبی دوستوں یا معاصرین کی زبانی مذاق اور مزاح کے سے ہلکے پھلکے انداز میں شروع ہو کر بہت دور تک جاتا ہے اور بہت دیر پا ثابت ہوتا ہے۔

یہ لطیف جذبہ ہر حساس انسان کے دل میں موجود ہوتا ہے۔ ہر شخص زندگی میں کبھی نہ کبھی اس احساس سے دوچار ہوتا ہے۔ ادیب و شاعر تو اس معاملے میں کچھ زیادہ ہی حساس واقع ہوتے ہیں۔ مشہور ہے کہ جس نے عشق نہ کیا ہو وہ شاعری کر ہی نہیں سکتا۔

اس لطیف جذبہ سے علامہ اقبال اور مولانا شبلی بھی اچھوتے نہیں تھے۔ اس ضمن میں نام تو اور بھی بہت سے اکابرین و معاصرین کے لیے جا سکتے ہیں لیکن یہاں ہمارے ممدوحین یہی دو اکابرین ہیں۔ اتفاق سے دونوں شاعر اور صاحب طرز ادیب ہیں۔ دونوں نے ہی اردو شعر و ادب

میں اپنا گہرا نقش قائم کیا ہے۔ دونوں میں ایک زبردست قدر مشترک یہ ہے کہ دونوں ایک ہی ''زلف گرہ گیر کے اسیر'' تھے۔ اور یہ کوئی ڈھکی چھپی بات نہیں کہ اس زلف گرہ گیر کی مالکہ کوئی اور نہیں بلکہ اپنے وقت کی سب سے باذوق اور اسمارٹ لیڈی عطیہ فیضی تھیں۔ اقبال اور شبلی دونوں ہی انہیں 'چاہتے' تھے اور عطیہ بھی دونوں سے بات کرکے 'فیضیاب' ہوتی تھیں اور 'خوش' ہوتی تھیں۔ ایک ملاقات کے بعد دوسری ملاقات کی 'آرزومند' رہتیں۔ یہ معاملہ 'یک طرفہ' نہ تھا۔ بلکہ دونوں طرف ہے آگ برابر لگی ہوئی' والا معاملہ تھا۔ واوین میں استعمال کیے گئے چاہت، فیضیاب، آرزومند اور آگ برابر لگی ہوئی، بظاہر منفی استعمال والے الفاظ معلوم پڑتے ہیں۔ لیکن دیکھا جائے تو یہ وہ الفاظ ہیں جس کے لیے فراق کا مصرعہ یاد آتا ہے کہ عشق توفیق ہے گناہ نہیں۔

اقبال، شبلی اور عطیہ۔ ایک خوبصورت مثلث۔ ایک ایسا مثلث جو مشہور بھی ہوا اور بدنام بھی۔ بلکہ بدنام کیا گیا۔ برا ہو معاصرانہ چشمک کا 'اک ذراسی بات کا افسانہ کر دیا'۔ جس طرح یہ لطیف جذبہ انسانی سرشت کا حصہ ہے اسی طرح یہ بھی انسانی فطرت کا خاصہ ہے کہ اس طرح کی باتوں کو چٹخارے لے لے کر خوب اچھالا جاتا ہے۔ اقبال اور شبلی کے باب میں تو یہ حرکت کچھ زیادہ ہی کی گئی۔

اقبال اور شبلی دونوں ہی عطیہ کے ذوق کے قائل تھے۔ دونوں ہی اس کے 'قرب' کے خواہاں رہے لیکن کیا عطیہ کی وجہ سے ان دونوں میں کبھی رقابت کا جذبہ ابھر کر سامنے آیا؟ جیسا کہ عام طور پر عشق میں ہوتا ہے۔ نہیں، کیونکہ دونوں ہی کا جذبہ صادق تھا۔ دونوں ہی عشق کے مدارج سے بخوبی واقف تھے۔ اس زمانے میں عطیہ سے کہیں زیادہ خوبصورت عورتیں موجود تھیں اور کم از کم اقبال کو تو یورپ کے قیام کے دوران ایسے مواقع زیادہ میسر آئے ہوں گے کہ خوبصورت اور آزاد خیال عورتوں سے قرب حاصل کرتے، لطف اندوز اور فیضیاب ہوتے۔ مولانا شبلی کا بھی معاملہ کچھ ایسا ہی تھا۔

دراصل عشق اور ہوس کے بیچ ایک باریک سی حد فاصل قائم ہے۔ ذراسی چوک ہوئی کہ عشق رسوا ہوا بدنام ہوا، قعر مذلت میں لے گیا۔ آیئے ایک نظر اس دور پر ڈالتے ہیں۔ اقبال اور شبلی کا دور ایک ایسا دور تھا جب مسلمان عورتوں میں تعلیم کا بہت زیادہ رواج نہ تھا۔ ناظرہ قرآن اور واجبی اردو کی تعلیم بس اتنا ہی کافی سمجھا جاتا تھا۔ حتیٰ کہ لکھنا جاننا بھی لڑکیوں کے لیے معیوب سمجھا جاتا تھا۔ مبادا کسی سے مراسلت نہ کر بیٹھیں۔ ایسے میں اقبال اور شبلی جیسے علما، دانشور اور حکیمان ملت عطیہ کو ماڈل کے روپ میں دیکھتے

تھے۔اس میں کوئی شک نہیں کہ اس وقت عطیہ فیضی عورتوں کے لیے ایک آئیڈیل کا درجہ رکھتی تھیں۔

عطیہ فیضی اعلیٰ تعلیم یافتہ، مہذب اور باذوق خاتون تھیں۔ اور انہیں کم از کم تین زبانوں، اردو، فارسی اور انگریزی پر عبور حاصل تھا۔ساتھ ہی وہ فرانسیسی بھی جانتی تھیں۔ اس وقت کے ماحول میں ایک مسلم عورت کا اتنی زبانیں جاننا تو حیرت انگیز تھا ہی۔طرہ یہ کہ انہوں نے انگلستان اور یورپ جیسے ممالک کا دورہ بھی کیا تھا۔ وہاں کے رہن سہن دیکھے تھے۔ اس سے متاثر بھی تھیں چنانچہ وہ ثقافتی اور علمی و ادبی پروگراموں میں بڑھ چڑھ کر حصہ بھی لیتی تھیں۔ظاہر ہے کہ ایسی باذوق اور تعلیم یافتہ لیڈی کا منظور نظر ہونا غیر فطری نہیں تھا۔

اقبال اور عطیہ اور اسی طرح شبلی اور عطیہ کے درمیان کیا کیا گفتگو ہوتی تھی۔ ان کے درمیان مراسلت میں کون کون سے موضوعات زیر بحث آتے تھے۔آداب والقاب کس قسم کے استعمال کیے جاتے تھے، بے تکلفی کی حدود کیا تھیں۔ یہاں ان سب باتوں پر گفتگو تحصیل حاصل ہوگی۔ یہ بارہا صفحہ قرطاس کی زینت بنتی رہی ہیں۔ یہاں اس موضوع پر صرف اتنا کہنے کی ضرورت محسوس ہوتی ہے کہ

حسن کی تاثیر پہ غالب نہ آسکتا تھا علم
اتنی نادانی جہاں کے سارے داناؤں میں تھی

لیکن اس 'نادانی' کو جس انداز سے اچھالا گیا اس سے اردو ادب کا تو کوئی بھلا نہ ہوا البتہ ان شخصیات کو داغدار کرنے کی مذموم کوشش ضرور کی گئی اور اس کے پیچھے لوگوں کی جو ذہنیت اور جو نفسیات کارفرما تھی، اسے اقبال نے ایک شعر میں بڑی خوبصورتی سے بیان کردیا ہے۔

ہند کے شاعر و صورت گر و افسانہ نویس
آہ! بے چاروں کے اعصاب پر عورت ہے سوار

اقبال نے اپنے اس شعر میں صرف اپنے ہم وطنوں کو مخاطب کیا ہے اور خوب کیا ہے۔ یہاں میں صرف اس قدر اضافہ کی اجازت چاہوں گا کہ اس قسم کی ذہنیت دنیا کے ہر گوشہ میں اور ہر خطہ میں پائی جاتی ہے۔ یہ ذہنیت ہمیشہ سے آفاقی اور عالمی رہی ہے۔ کہیں زیادہ کہیں کم۔اور حقیقت تو یہ ہے کہ اس سے مفر بھی ممکن نہیں کہ: وجودِ زن سے ہے تصویر کائنات میں رنگ

(اپریل 2003)

ستاروں سے آگے

وہ 16 رجنوری کا دن تھا۔ بڑے جوش وخروش کا ماحول تھا۔ اس دن سات خلا باز اپنے خلائی مشن پر روانہ ہو رہے تھے۔ امریکہ سے ہندوستان تک ایک جشن کا ماحول تھا۔ امریکہ میں اس لیے کہ یہ خلائی منصوبہ اس کا تھا۔ ہندوستان میں اس لیے اس سات رکنی خلائی ٹیم میں ایک اہم رکن کی حیثیت سے ہمارے ہندوستان کی چہیتی کلپنا چاولہ بھی شامل تھی۔ یہ خلا باز خلا میں گئے بھی اور بڑی حد تک اپنے مشن میں کامیاب بھی رہے۔ لیکن.....

لیکن اس وقت سارے کیے کرائے پر پانی پھر گیا جب خلائی شٹل کولمبیا روئے زمین پر اترنے ہی والا تھا، صرف 16 منٹ باقی رہ گئے تھے کہ اچانک وہ ہو گیا جس کی کوئی امید نہیں تھی۔ 16 رجنوری سے ہمارے چہروں پر جمی شادمانی پل بھر میں غائب ہو گئی۔ ہماری کامیابی اچانک ناکامی میں بدل گئی۔ 16 دن کا یہ مشن چند سیکنڈوں میں یکم فروری کو امریکہ کے ٹکساس صوبہ کے اوپر تقریباً دولاکھ فٹ کی بلندی پر پاش پاش ہو گیا۔

اس خلائی مشن میں کئی اہم تجربات شامل تھے۔ ایک اطلاع کے مطابق ان تجربات کی تعداد 80 رتھی جن میں کینسر کے علاج کی دریافت بھی شامل تھی۔ اس لحاظ سے دیکھا جائے تو یہ مشن ایک انتہائی مقدس مشن تھا۔ اور اگر یہ کامیاب ہو جاتا تو یقیناً انسانیت کا بہت بھلا ہوتا۔ لیکن برا ہو بدنیتی اور لاپرواہی کا کہ اس کا انجام ایک دلخراش حادثہ کے ساتھ ہوا۔

اب تک کی جانچ کے بعد جو رپورٹ آئی ہے اس کے مطابق سائنس دانوں کی ایک ٹیم نے کولمبیا کے نظام تحفظ پر اعتراضات کیے تھے اور اس کے کچھ حل بھی بجھائے تھے۔ لیکن نیشنل ایروناٹکس اینڈ اسپیس ایڈمنسٹریشن (ناسا) نے نہ صرف اسے ناقابل توجہ گردانا بلکہ اس کی نشاندہی کرنے والوں کو ہی برخاست کر دیا۔ اب ناسا کے افسران لاکھ صفائی دیں اس کی تاویلیں پیش کریں، جن جانوں کا زیاں ہوا ہے اس کی بھرپائی نہیں کی جاسکتی۔

انسانی جانیں خواہ امریکی ہوں یا ہندوستانی، انسانی جان ہوتی ہیں اور ان کی تلفی پر افسوس تو ہوتا ہی

ہے۔ ایسے میں چند نمائندہ امریکی اخبارات نے جس طرح سے کلپنا چاولہ کی تکنیکی صلاحیتوں پر انگلی اٹھائی، اس سے نہ صرف ہم ہندوستانیوں کو تکلیف پہنچی بلکہ تمام دنیا کے لوگوں کو بھی حیرت ہوئی ہے کہ اگر کلپنا ناتجربہ کار تھی، اس کی تکنیکی صلاحیتوں میں خامی تھی تو پھر اسے اس مشن میں شامل ہی کیوں کیا گیا۔ اس سے خود ان کی تضاد بیانی کا پتہ چلتا ہے۔ اپنی ناکامیوں کی پردہ پوشی کرنا انسانی فطرت ہے۔ اور اس کا آسان طریقہ یہ ہے کہ اپنی ناکامی کسی اور کے سر منڈھ دی جائے۔ واضح ہو کہ کلپنا چاولہ کا یہ دوسرا خلائی سفر تھا اور یقیناً اس کی صلاحیتوں کا اعتراف کرتے ہوئے ہی اسے یہ موقع دیا گیا تھا۔

کلپنا چاولہ نے ہندوستان کے ایک چھوٹے شہر کرنال کے ایک قدامت پرست گھرانے میں ضرور جنم لیا تھا لیکن اس کی سوچ اور تصور کی اڑان ہمیشہ اونچی رہی۔ کلپنا واقعی اسم بامسمیٰ تھی۔ یکم جولائی 1961 کو پیدا ہوئی کلپنا نے ٹیگور اسکول میں ابتدائی تعلیم کے بعد 1982ء میں چنڈی گڑھ کے پنجاب انجینئرنگ کالج سے ایرونا ٹیکل انجینئرنگ میں بیچلر کی ڈگری حاصل کی۔ پھر ہندوستان سے پہلی اڑان امریکہ کے لیے بھری اعلیٰ تعلیم کی خاطر۔ جہاں 1984ء میں ٹیکساس یونیورسٹی سے ایرواسپیس میں ماسٹر کی ڈگری حاصل کی۔ 1988ء میں ناسا کے ریسرچ سینٹر میں انہیں پہلی بار کام کرنے کا موقع ملا۔ انہوں نے کیلی فورنیا کی ایک کمپنی میں ریسرچ سائنسداں کے طور پر بھی کام کیا۔ کلپنا کی محنت، لگن، ریسرچ اور جستجو سے متاثر ہو کر 1992ء میں ناسا نے انہیں خلابازی کی تربیت کے لیے منتخب کیا۔ 1997ء میں پہلی بار اسے خلا کی سیر کا موقع ملا۔ اس وقت زمین سے 65 لاکھ میل کی بلندی پر خلا میں 376 گھنٹے سے بھی زیادہ وقت گزارنے کے بعد وہ 5 دسمبر 1997ء کو زمین پر بہ حفاظت واپس لوٹی تھی۔

کلپنا نے ایک طرح سے امریکہ کو اپنا وطن ثانی بنالیا تھا۔ وہیں انہوں نے ایک فلائٹ انسٹرکٹر زیاں پیرے ہیریسن کے ساتھ شادی کر کے گھر بسایا۔ لیکن کلپنا ایک عام عورت نہ تھی جو اپنا گھر بسا کر گھر گرہستی تک خود کو محدود کر لیتی، اس باہمت اور پر عزم خاتون نے اس کے بعد بھی اپنی بہترین صلاحیتوں کا مظاہرہ جاری رکھا۔ چنانچہ 1999ء میں خلائی شٹل کی پائلٹ ٹیم کے اراکین کا نمائندہ منتخب ہوئیں۔ کلپنا کا ایقان تھا کہ:

ستاروں سے آگے جہاں اور بھی ہیں
ابھی عشق کے امتحاں اور بھی ہیں

اب وہ یقیناً ستاروں سے آگے بہت دور جا چکی ہے لیکن اس کے نہ لوٹ پانے کا ہمیں افسوس رہے گا۔

(اپریل 2003)

سچا ترقی پسند: سجاد ظہیر

قارئین کرام! سجاد ظہیر کی صد سالہ تقریبات کے اختتام پر ایک گوشہ پیش خدمت ہے۔ سجاد ظہیر ایک متحرک اور فعال شخصیت کا نام ہے۔ جس نے نہ صرف رجحان ساز ادب کی تخلیق کی بلکہ اسے باضابطہ تحریک کی شکل بھی دی۔ سجاد ظہیر نے انتہائی خلوص کے ساتھ نہ صرف ایک ادبی تحریک کی بنیاد ڈالی تھی بلکہ انتہائی خلوص کے ساتھ اور تمام تر ادبی آلائشوں سے بالاتر ہو کر اس کو سینچا بھی تھا۔ یہی وجہ ہے کہ ترقی پسند ادبی تحریک نے ادب کو جتنا کچھ اور جیسا کچھ عطا کیا، وہ ہمارے ادب کا بیش بہا سرمایہ ہے۔ یہ حقیقت ہے کہ اس تحریک نے ادب کو خاص طور پر اردو ادب کو جتنا کچھ دیا اتنا کسی دوسری تحریک یا رجحان نے نہیں دیا۔

اردو ادب میں ترقی پسند تحریک کا جب جب ذکر ہوتا ہے سجاد ظہیر کو ضرور یاد کیا جاتا ہے۔ گویا سجاد ظہیر اور ترقی پسند تحریک لازم وملزوم کی حیثیت اختیار کر چکے ہیں۔ سچی بات تو یہ ہے کہ یہ سجاد ظہیر کا ہی بوتا تھا کہ انہوں نے اپنے چند ساتھیوں ملک راج آنند، جیوتی گھوش، محمد دین تاثیر، کے ایس بھٹ اور یشونت سنہا کے ساتھ مل کر اپنے ملک ہندوستان سے ہزاروں میل دور لندن میں نہ صرف اس تحریک کی داغ بیل ڈالی بلکہ جب وہ ہندوستان آئے تو ہندوستان میں بھی اس کی خوب خوب آبیاری کی اور اسے پروان چڑھایا۔ سجاد ظہیر کی یہ تحریک تازہ بہ تازہ تھی اور دنیا کے تمام ادبی رجحانات خاص طور پر یوروپ کے رجحان سے کلی طور پر ہم آہنگ بھی۔ چنانچہ یہ تحریک ہندوستان میں خوب پھلی پھولی۔ کسی نہ کسی صورت میں آج بھی اس تحریک کے اثرات محسوس کیے جاسکتے ہیں۔

سجاد ظہیر چونکہ ایک بے باک ادیب تھے، انہیں اپنے سڑے گلے سماج کو دیکھ کر از حد تعفن کا احساس ہوتا تھا۔ وہ ریاکاری، مکاری، دکھاوا، چھوت چھات اور ذات پات کے سخت مخالف تھے

چنانچہ ان موضوعات پر لکھتے ہوئے ان کا لہجہ سخت، درشت اور کبھی کبھی تمسخرانہ بھی ہو جایا کرتا تھا۔ چنانچہ کچھ لوگ ان کے اس رویہ پر شاکی بھی رہے۔ لیکن سچی بات یہ ہے کہ زخم جب خطرناک صورت اختیار کر جائے تو اس پر نشتر زنی کرنی ہی پڑتی ہے اور جب نشتر زنی ہوگی تو تکلیف بھی ہوگی۔ حقیقت یہ ہے کہ وہ اوروں کے جذبات واحساسات اور عقیدے کا اتنا ہی احترام کرتے تھے جتنا کہ خود اپنے عقیدے کا۔ سینٹرل جیل حیدر آباد سے مئی 1951 میں انہوں نے شریک حیات رضیہ کو جو خط لکھا تھا اس کا ایک اقتباس یہاں پیش کرنا مناسب معلوم ہوتا ہے:

> ''مجھے اس کوٹھری میں رکھا گیا ہے جس میں بھگت سنگھ قید تھا۔ شاید اس لیے کہ میں وحشت زدہ ہو کر ڈگمگا جاؤں۔ مجھ سے ساری کتابیں، قلم اور کاغذ لے کر مجھے صرف قرآن دیا گیا ہے۔ شاید اس لیے کہ آخرت کے متعلق سوچوں مگر یہ لوگ نہیں جانتے کہ بھگت سنگھ کی کوٹھری اور مجاہدین حق سے بھری اس عظیم کتاب نے میرے قلب وحواس کو پہلے سے بھی مضبوط تر بنا دیا ہے۔''

سجاد ظہیر کا جذبہ صادق تھا اور انہوں نے اس تحریک کے لیے بے لوث خدمات انجام دی تھیں۔ یہی وجہ ہے کہ تحریک منظم، فعال اور دیرپا ثابت ہوئی اور اس نے اردو ادب کے ذخیرے میں بیش بہا اضافے کیے۔ سجاد ظہیر کو اس تحریک کا قائد اعظم تو سب ہی مانتے ہیں لیکن ان کی حیات وجہات پر اب تک کوئی مبسوط کام نہیں ہوا۔ البتہ سرسری یا ضمنی تذکرے بہت ہوئے ہیں۔ جن میں ماہنامہ 'حیات' کے دو خاص نمبر (1968، اور 1973)، عبدالقیوم ابدالی کی کتاب ''بنے بھائی'' 1986 کے علاوہ 1991 میں لاہور سے عتیق احمد نے بھی ''بنے بھائی'' کے نام سے ایک اور کتاب شائع کرائی۔ عتیق احمد نے ہی ''سجاد ظہیر: تخلیقی وتنقیدی جہات'' کے نام سے شائع کی۔ 1988 میں عبدالحق نے ''سجاد ظہیر کی ناولٹ نگاری اور لندن کی ایک رات'' شائع کرائی تھی۔ اس کے علاوہ ابھی حال کے دنوں میں الہ آباد سے زیب النسا نے سجاد ظہیر کی حیات وخدمات پر پی ایچ ڈی کی، یہ مقالہ بھی شائع ہو چکا ہے۔ چند دیگر یونیورسٹیوں میں بھی سجاد ظہیر پر مقالے لکھے جانے کی اطلاع ملی ہے۔ پی ایچ ڈی کے لیے لکھے گئے مقالوں میں ایک مقالہ نصیر الدین ازہر کا بھی ہے جو ''سجاد ظہیر: حیات وجہات'' کے نام سے شائع بھی ہو چکا ہے۔ سجاد ظہیر پر ایک مختصر مگر

جامع کتاب (مونوگراف) پروفیسر قمر رئیس نے لکھی ہے جسے ساہتیہ اکادمی نے ''ہندوستانی ادب کے معمار'' سیریز کے تحت شائع کیا ہے۔ اس کتاب میں مصنف نے سجاد ظہیر کی حیات اور ادبی خدمات کو بڑے ہی دلکش اور سلیس انداز میں کچھ اس طرح پیش کیا ہے کہ سجاد ظہیر کی ایک چلتی پھرتی تصویر نظروں کے سامنے آجاتی ہے۔

ہم نے 'آجکل' میں پہلے بھی (دسمبر 1973ء میں) خراج عقیدت پیش کرتے ہوئے ایک پورا نمبر پیش کیا تھا، جس میں سجاد ظہیر کی شخصیت اور فن پر چند انتہائی اہم مضامین شائع ہوئے تھے جن میں ظ۔ انصاری کا 'بنّے بھائی' کرشن چندر کا 'بنے بھائی: ایک تاثر' ملک راج آنند کا ''سجاد ظہیر: چند یادیں'' شارب ردولوی کا ''سجاد ظہیر کی تنقید نگاری''، قمر رئیس کا ''سجاد ظہیر اور ترقی پسند تحریک'' اور پروفیسر محمد حسن کا ''سجاد ظہیر کی ادبی خدمات'' خاص ہیں۔ ملک راج آنند جن کا ابھی حال ہی میں انتقال ہوا ہے اور جو انجمن ترقی پسند مصنفین کی تشکیل میں سجاد ظہیر کے ساتھ برابر کے شریک تھے، انہوں نے اپنے مذکورہ مضمون میں سجاد ظہیر کے ساتھ گزارے ہوئے چند متحرک اور فعال لمحات کو بڑے ہی دلآویز انداز میں یاد کیا ہے۔

زیرِ نظر گوشہ میں ہم مذکورہ مضامین سے چند اقتباسات کے علاوہ تازہ مضامین میں علی احمد فاطمی کا ''لندن کی ایک رات'' پر بھرپور مضمون دے رہے ہیں۔ یہی وہ ناولٹ ہے، جس میں شعور کی رَو کی تکنیک کا پہلی بار استعمال کیا گیا۔ دوسرا مضمون شہناز نبی کا ''سجاد ظہیر اور نئی اردو شاعری'' پر ہے، جس میں مضمون نگار نے سجاد ظہیر کے حوالے سے نئی اردو شاعری پر بھرپور بحث کی ہے۔ شہزاد انجم نے اپنے مضمون میں ''سجاد ظہیر کے افکار کی عصری معنویت'' سے بحث کی ہے۔ یہ تینوں مضامین سجاد ظہیر کی حیات و خدمات اور ان کے افکار کا بھرپور احاطہ کرتے ہیں۔ موقع کی مناسبت سے پروفیسر قمر رئیس کی کتاب ''سجاد ظہیر: حیات اور ادبی خدمات'' پر تبصرہ بھی دیا جارہا ہے۔ اس طرح یہ شمارہ سجاد ظہیر پر ایک مبسوط شکل اختیار کر گیا ہے۔ امید کہ قارئین کو پسند آئے گا۔

(مئی 2006)

پھر آ گئے وہیں پہ...

وہ بھی کیا دن تھے جب انسان ہر فکر و تردد سے آزاد، لباس وحجاب سے بے نیاز، فطری زندگی گزارا کرتا تھا۔ جب جی چاہا کھالیا، جب جی چاہا سولیا، بھوک لگی شکار کیا اور کچے گوشت سے ہی پیٹ بھرلیا۔ کچے پکے پھل سے لطف اندوز ہوئے۔ یوں ہی صدیوں تک انسان بے نیازی اور بے فکری کی زندگی گزارتے ہوئے آخر کو تہذیب و تمدن کے دور میں داخل ہوا۔

انسان فطری طور پر تفریح پسند واقع ہوا ہے۔ ہر دور میں تفریح و منورنجن اس کی ضرورت رہی ہے۔ ماقبل تاریخ میں انسان کی یہ ضرورت کھیل کود، ناچ گانا اور شکار تک محدود تھی۔ یہ وہ زمانہ تھا جب انسان اپنی بے لباسی اور بے حجابی کو پیڑ پودوں کے پتوں سے چھپایا کرتا تھا اور کیفیت کچھ ایسی ہوتی تھی کہ 'صاف چھپتے بھی نہیں سامنے آتے بھی نہیں'۔ ماقبل تاریخ کے اس دور میں ہر انسان قدرت کی بے انتہا اور بے کراں زمینوں کا مالک ہوا کرتا تھا اور اس کے تصرف میں قدرت کی عطا کردہ بے حساب نعمتیں ہوا کرتی تھیں۔

پھر ایسا ہوا کہ انسان نے قدرت کے عطا کردہ عقل و شعور کی بنیاد پر ترقی حاصل کرنی شروع کی۔ اب وہ دھیرے دھیرے تہذیب کے دائرے میں آنے لگا۔ اپنی بے لباسی اور بے حجابی بھی اسے کھٹکنے لگی۔ چنانچہ انسان نے اس سمت میں سوچنا شروع کیا اور تیزی سے اپنی اس محرومی پر قابو پانا شروع کیا۔ اب جانوروں کی کھال ستر پوشی کے کام آنے لگی۔ انسان کی اس ترقی کے ساتھ ساتھ انسان کی فطری ضرورت، تفریح کی شکل و صورت اور رنگ و روپ بھی بدلنے لگا۔ وہی انسان جو پہلے جانوروں کی طرح کھیل کود، ناچ گانا اور شکار کیا کرتا تھا، اب مہذب اور متمدن ڈھنگ سے اسے انجام دینے لگا۔ وقت کے ساتھ ساتھ بڑے ہی فطری اور غیر محسوس انداز میں کھیل کود، ناچ گانا اور شکار کے اصول و ضوابط منضبط ہوتے چلے گئے اور حضرت انسان ماقبل تاریخ کے دور سے تاریخ کے

دور میں داخل ہوگیا۔ اب انسان تفریح کے نئے نئے ذرائع اور نئے نئے وسائل ڈھونڈنے لگا۔ وقت کے ساتھ ساتھ خاندان اور سماج کی بھی تشکیل ہونے لگی اور حجاب جو پہلے پتوں تک محدود تھا اب کھالوں، پھر کپڑوں کی شکل اختیار کرگیا۔ تفریح کی سطح پر کھیل کود، ناچ گانا اور شکار سے آگے بڑھ کر نقالی سوانگ اور ناٹک تک آپہنچی۔ اب انسان کے پاس تفریح کا نسبتاً وسیع میدان سامنے تھا۔

ہندوستان میں ناٹک اولاً تو ظاہر ہے کہ ان کی فطری زبان میں ہی ہوا کرتا رہا ہوگا۔ لیکن جب جو قدیم ناٹک سینہ بہ سینہ عوامی طور پر منتقل ہوتے ہوتے ہمارے سامنے آئے، وہ سنسکرت کے ناٹک ہیں۔ پھر یہ ناٹک پراکرت سے ہوتے ہوئے ہندوستان کی مختلف زبانوں، ہندی، اردو، بنگلہ، تامل، تیلگو، کنڑ، مراٹھی، گجراتی، ملیالم اور دیگر زبانوں میں لکھے اور کھیلے جانے لگے۔ سنسکرت میں ناٹک کی مضبوط روایت رہی ہے۔ لیکن سنسکرت کے عوامی زبان نہ ہونے کے سبب یہ ناٹک اسٹیج کے نقطۂ نظر سے بے معنی ہوکر رہ گئے۔ مگر یہی سنسکرت زبان اور ڈرامے ہندی، اردو اور دیگر زبانوں کے لیے خام مواد کے طور پر بہت کام آئے۔ بہت سے سنسکرت ڈراموں کے ترجمے کیے گئے اور بہت سے سنسکرت ڈراموں کے مرکزی خیال پر مبنی ہندی اردو کے ڈرامے تخلیق کیے گئے۔

انیسویں صدی ہندی اور اردو ڈراموں کے عروج کا زمانہ رہا ہے، جب نوابوں اور راجاؤں کے دربار میں ناٹکوں کا انعقاد ہوا کرتا تھا اور لکھنؤ میں تو نواب خود سوانگ رچتے تھے۔ اس طرح ڈراموں اور تھیٹروں کو ایک طرح سے سرکاری سرپرستی حاصل ہونے کے سبب ڈراموں کی روایت کو اہمیت حاصل ہوگئی۔ کسی زمانے میں جو چیز بھانڈوں، نقالوں کا مشغلہ ہوا کرتی تھی، اب اسے اعتبار حاصل ہوگیا۔ یہی وہ زمانہ ہے جب طباعت واشاعت اور چھاپے خانے کی بھی شروعات ہوئی اور لوگوں کے تفریح کا ایک اور میدان سامنے تھا۔ جو داستانیں اور قصے کہانیاں سینہ بہ سینہ زبانی منتقل ہوتی آرہی تھیں اب مطبوعہ صورت میں مہیا ہونے لگیں۔ اخبار بھی تفریح کے ساتھ ساتھ جانکاری اور واقفیت کا اچھا ذریعہ تھا۔ مشاعرے بھی عوامی تفریح کا بہترین ذریعہ تھے۔

اس طرح ہم دیکھتے ہیں کہ انسان نے ہر دور میں اپنی تفریح کے لیے مختلف، متعدد اور متنوع ذرائع بڑے ہی فطری اور نیچرل انداز میں ایجاد کیے۔ آج ریڈیو، فلم، ٹیلی ویژن اور انٹرنیٹ کا زمانہ ہے۔ بہ الفاظ دیگر ہم گلوبلائزیشن کے دور میں جی رہے ہیں۔ ساری دنیا ہمارے کمپیوٹر سیٹ پر ہمارے گھروں میں چلتی

پھرتی موجود ہے۔ پوری دنیا ایک عالمی گاؤں میں تبدیل ہو چکی ہے۔ لیکن ریڈیو ہو یا فلم، ٹی وی ہو یا کمپیوٹر، ان سب کی بنیاد میں ناٹک اور تھیٹر کا خمیر کہیں نہ کہیں ضرور نظر آتا ہے۔ ناٹک اور تھیٹر جو انیسویں صدی میں تفریح کا بہترین ذریعہ تھا، بیسویں صدی کے شروع ہوتے ہی نقطۂ عروج پر پہنچ کر کچھ تھم سا گیا۔ انیسویں صدی کے آخر میں تھیٹر کو بھارتیندو ہریش چندر نے اعتبار بخشا تھا اور ان کے بعد آغا حشر کاشمیری نے اسے جلا دی اور جب بیسویں صدی میں فلم نے قدم جمانا شروع کیا تو آغا حشر نے فلموں میں بھی قسمت آزمائی کی اور یہی وہ ٹرننگ پوائنٹ ہے جب تھیٹر کا زوال شروع ہوا۔ لیکن اس زوال سے پہلے پہلے ڈراموں اور ناٹکوں نے اپنی مضبوط ادبی، تہذیبی اور تاریخی روایت کے سبب اہمیت حاصل کر لی۔

آج فلم، ریڈیو اور ٹیلی ویژن کا دور دورہ ہے۔ لیکن اس کے آغاز میں خام مال کے طور پر یہی ڈرامے اور ناٹک ایک عرصے تک کام آتے رہے۔ بایں وجہ ناٹک کے زوال کے باوجود اپنی ادبی، تہذیبی اور تاریخی نوعیت کے سبب ان ڈراموں کی اہمیت ہنوز برقرار ہے۔

دوسری طرف ٹیلی ویژن جو آج ہماری تفریح طبع کا سب سے بڑا ذریعہ بن چکا ہے اور ہمارے قیمتی اوقات کا سب سے بڑا قاتل بھی۔ ٹی وی پر پیش کیے جانے والے پروگراموں کی بات کریں تو خواہ وہ سیریلس ہوں یا نیوز بلیٹن، سب کا مقصد تفریح مہیا کرنا ہی رہ گیا ہے۔ چنانچہ آج ہم دیکھتے ہیں کہ ایک ایک سیریل کا سالوں تک ایک لامتناہی سلسلہ ہے جو شیطان کی آنت پر مشتمل نظر آتا ہے۔ جو ہمارے گھروں میں عورتوں اور بچوں بلکہ اب تو مردوں کے قیمتی اوقات بھی برباد کرنے کے لیے کافی ہیں۔ ٹی وی کی ایک اہم چیز نیوز بلیٹن ہے اور یہاں بھی ڈرامہ، ناٹک اور تفریح کو اولیت حاصل ہو گئی ہے۔ اب خبر پر ناخبر یا غیر خبر کو ترجیح دی جاتی ہے۔ خبروں کو ڈرامائی شکل میں پیش کر کے بعض چینل اپنے ناظرین کا حلقہ بڑھانے کی جگت میں لگے رہتے ہیں اور اس طرح دونوں ہاتھوں سے پیسے بٹورتے رہتے ہیں۔ سیریلس میں ناظرین کو زیادہ سے زیادہ اپنی طرف ملتفت کرنے کے لیے ایسے ایسے مناظر اور مکالمے دیے جانے لگے ہیں کہ ہمیں بے ساختہ ماقبل تاریخ کا زمانہ یاد آنے لگتا ہے۔ جب انسان بے حجاب اور بے لباس ہوا کرتا تھا۔ یعنی:

پھر آ گئے وہیں پہ چلے تھے جہاں سے ہم

(جون 2006)

اردو فکشن کا بادشاہ

یہ اردو کی عین خوش نصیبی ہے کہ اسے میر، غالب، اقبال اور پریم چند جیسے ادیب و شاعر ملے۔ جو اپنی تخلیقات کے سبب ادبیات عالم سے آنکھیں چار کرنے کے لائق ہو سکی۔ بلاشبہ یہ ادیب بھی صرف اردو کے بل بوتے پر ہی عالمی شہرت یافتہ ادیب ہوئے۔ یہی وہ ادیب ہیں جن کی وجہ سے اردو کا بھی عالمی ادب میں ایک اہم مقام ہے۔

اردو ناول و افسانہ کے شہنشاہ نواب رائے پریم چند اردو فکشن کا پہلا بڑا نام ہے جس نے اردو میں حقیقت نگاری کی شروعات کی۔ یوں تو اردو میں پریم چند کے پہلے سے ہی قصے، کہانیاں اور داستانیں لکھی جا رہی تھیں لیکن ان کا حقیقت سے کوئی واسطہ نہ تھا۔ تخیلات، تصورات اور جذبات کے سہارے انتہائی مصنوعی فضا میں کہانیوں اور داستانوں کے تانے بانے بنے جاتے تھے۔ جن میں ایک راجا ہوتا، ایک رانی ہوتی اور ان دونوں کے ایک شہزادہ ہوتا تھا۔ پھر کسی دور دراز علاقے کی کسی شہزادی سے اس شہزادے کی آنکھیں چار ہوتیں۔ معاشقہ چلتا اور ہجر کی راتوں میں تارے گننے کا عمل شروع ہو جاتا اور مصاحبین اس تگ و دو میں لگ جاتے کہ کسی طرح ان کا وصال ہو جائے۔ اسی بیچ کوئی رقیب روسیاہ ضرور نمودار ہوتا جو ان دونوں کے بیچ کسی پہاڑ یا خلیج کی طرح حائل ہو جاتا اور اس طرح یہ داستان معاشقہ کسی شیطان کی آنت کی طرح طویل ہوتی جاتی۔ کبھی کبھی تو یہ رقیب روسیاہ انسان کی ذات سے آگے بڑھ کر کسی مافوق الفطری عناصر سے متعلق ہوتا۔ کبھی یہ بھوت کی شکل میں نمودار ہوتا اور کبھی یہ چڑیل کی صورت میں قارئین کو بدمزہ کرتا۔ عرصۂ دراز تک یہ داستان اسی بندھی ٹکی لکیر پر یوں ہی چلتی رہی۔ پریم چند اردو فکشن کا خط فاصل ہے۔ جو رومانویت اور حقیقت پسندی کے بیچ واضح اور نمایاں طور پر نظر آتا ہے۔ پریم چند کا

عہد ایک ایسا عہد تھا جو تہذیب وثقافت کی سطح پر شکست وریخت سے دو چار تھا۔ ایسے میں ادیب وشاعر کا ایک طبقہ رومانویت کے آغوش میں چھپ کر اپنا غم واندوہ اور اپنا فرسٹریشن سب کچھ بھلا دینا چاہتا تھا۔ لیکن ادیبوں کا ایک طبقہ ایسا بھی تھا جو یقیناً حساس تھا اور اپنے گردونواح اور اپنے ماحول سے نظریں نہیں چرا سکتا تھا۔ پریم چند اسی دوسرے گروہ کے سرخیل تھے۔ جو اپنے وطن کے بگڑتے حالات اور اپنی قوم کی زبوں حالی پر نہ صرف مغموم تھے بلکہ انہوں نے ان موضوعات پر کہانیاں اور افسانے بھی لکھے، واضح اور دوٹوک انداز کے مضامین بھی تحریر کیے۔ جو اس وقت کے رسائل وجرائد اور اخبارات کی زینت بنتے رہے۔ 'سوز وطن' ان کی کہانیوں کا ایک ایسا ہی مجموعہ تھا جو حب وطن کے جذبات سے مملو تھا۔ جسے پڑھ کر اہل وطن میں کچھ کر گزرنے کا جذبہ ٹھاٹھیں مارنے لگا تھا۔ چنانچہ انگریز حکمرانوں نے اسے کسی ضابطے کے بغیر ہی ضبط کر لیا۔ یہ اپنے آپ میں ایک انوکھا واقعہ تھا۔ جو اس سے پہلے شاید کبھی وقوع پذیر نہیں ہوا تھا۔ واضح ہو کہ پریم چند کی کتاب 'سوز وطن' کی ضبطی کے بعد ہی پریس انڈیا ایکٹ کے تحت ضبطی کا یہ قانون وضع کیا گیا۔

بہر حال دھنپت رائے جو اس وقت تک نواب رائے کے قلمی نام سے لکھتے رہے تھے اب اپنے دوست 'زمانہ' کے ایڈیٹر دیانارائن نگم کے مشورے پر 'پریم چند' کا نام اختیار کر کے لکھنا شروع کیا اور ایک قت ایسا آیا کہ جب گاندھی جی کی ایک تقریر سے متاثر ہو کر مدرسی کے پیشے سے استعفیٰ دے دیا اور آزادانہ لکھنا پڑھنا شروع کیا اور اس طرح اپنے وطن ہندوستان جنت نشان کی شایان شان طریقے سے خدمت انجام دینا شروع کی۔ پریم چند گاندھی جی سے متاثر تھے اور بعد میں مارکسزم کے زیر اثر بھی لکھنے لگے۔ چنانچہ کچھ لوگ اس مناسبت سے پریم چند کو ساہتیہ کا گاندھی اور مارکس بھی کہنے لگے تھے۔ یہ صحیح ہے کہ پریم چند گاندھی سے بھی متاثر تھے اور مارکس سے بھی لیکن وہ ان سب سے آگے اور اوپر ایک آفاقی ادیب تھے۔ جس کی نظر وسیع ہوتی ہے جو بہت دور اندیش ہوتا ہے۔ جو ان حالات وواقعات کے پس پردہ چھپے اسباب ونتائج کو بھی دیکھ لیتا ہے جہاں عام ادیب کی رسائی نہیں ہوتی۔ پریم چند کی کہانیوں کے مطالعے سے اس بات کی تصدیق ہو جاتی ہے کہ وہ کس قدر حساس، دوررس اور دور اندیش ادیب تھے۔

حقیقت یہ ہے کہ پریم چند اردو فکشن کا ایک لیجنڈ ہے جس نے اپنی کہانیوں اور افسانوں

ہے اردو فکشن میں بیش بہا اضافے کیے۔ ایک ایسا اضافہ جو ناقابل تنسیخ ہے۔ ایک ایسا اضافہ جو ناقابل فراموش ہے۔ ایک ایسا اضافہ جس کے ذکر کے بغیر اردو فکشن کی تاریخ مکمل نہیں ہوتی۔ ایک ایسا اضافہ جو اردو فکشن کی تاریخ کا آغاز بھی ہے اور انجام بھی۔ اردو فکشن کے اس قد آور لیجنڈری پرسنالٹی کے آگے ان کے ہم عصر ادیب وشاعر ذرا کم کم ہی نمایاں ہو پاتے تھے۔ چنانچہ اس دور میں اور خاص طور پر پریم چند کے آخری دور میں ان کے خلاف ذرا دھیمے لہجے میں سرگوشیاں اور چہ می گوئیاں کی جانے لگیں اور ان کے انتقال کے بعد تو ایک طبقہ کھلے عام 'پریم چند' کے خلاف زہر اگلنے لگا اور ان کے ادب کو 'پریم چندی ادب' یا 'پریم چندیت' کہہ کر مذاق اڑانے لگا۔ لیکن ایسے حاسدین کو جلد ہی اپنی اوقات کا پتہ چل گیا۔

پریم چند اردو کے ساتھ ساتھ ہندی میں بھی لکھتے تھے۔ وہ اردو کے اتنے ہی مقبول ادیب تھے جتنے کہ ہندی کے۔ وہ 'ہندوستانی' کے سب سے بڑے نقیب بھی تھے اور ادیب بھی۔ یہ صحیح ہے کہ پریم چند نے اردو میں لکھنا شروع کیا لیکن اپنی معاشی مجبوریوں کے سبب وہ ہندی کی طرف مائل ہوئے اور ہندی میں بھی لکھنا شروع کیا۔ ان کے خطوط سے ظاہر ہے کہ وہ کبھی پہلے اردو میں لکھتے تھے اور کبھی ہندی میں۔ بعد میں کبھی خود ایک سے دوسری زبان میں منتقل کرتے اور کبھی کسی دوست یا پیشہ ور سے پیسے دے کر ترجمہ کرواتے۔ لیکن انہیں آمدنی ہندی سے زیادہ ہوتی تھی۔ ہم اردو والوں کے لیے یہ ایک لمحۂ فکریہ ہے کہ پریم چند جیسا بے لوث اور بے غرض ادیب بھی آخر کیوں کر ہندی کی طرف راغب ہوا؟

پریم چند کی 125 ویں سالگرہ کے موقع سے شائقین فکشن اور عاشقین پریم چند ایک بار پھر پریم چند ادب کی طرف بھرپور طریقے سے متوجہ ہوئے۔ بیشتر سرکاری اور غیر سرکاری اداروں اور ناشروں نے پریم چند پر پروگرام منعقد کیے اور ان کے ادب کو نئی سج دھج کے ساتھ پیش کر کے انہیں اپنا خراج عقیدت پیش کیا اور اب اس کے اختتام پر ہم پھر ایک نئے انداز کا اور ذرا ایک سے ہٹ کر ایک گوشہ پیش کر رہے ہیں۔ اس موقع سے ہم پریم چند پر ایک کتاب بھی "آجکل اور پریم چند" پیش کر رہے ہیں۔

زیر نظر شمارے میں ہم اس عظیم فکشن رائٹر کے ان چند مضامین کو پیش کر رہے ہیں جو پریم چند کی تخلیقی و تصنیفی اور صحافتی زندگی کے ایک دوسرے پہلو کو اجاگر کرتے ہیں۔ یہ مضامین شائع ضرور

ہوئے تھے لیکن آج کی نسل ان سے اکثر و بیشتر لاعلم ہے۔ مدن گوپال نے اپنی تحقیق و جستجو کے بعد اس طرح کے متعدد مضامین ڈھونڈ نکالے ہیں جو کلیات پریم چند کی 25 ویں جلد میں شامل کیے جائیں گے۔ ہم ان میں سے صرف تین مضامین یہاں پیش کر رہے ہیں۔

اس کے علاوہ ہم پریم چند کے مشہور زمانہ کردار 'ہوری' پر ایک بھرپور اور جامع مضمون بھی پیش کر رہے ہیں۔ ساتھ ہی پریم چند کے خطوط پر ایک مختصر مضمون بھی شامل اشاعت ہے جس سے ہم پریم چند کی زندگی کے کچھ نہاں خانوں سے واقف ہو سکیں گے۔

(جولائی 2006)

غالب اردو ادب کے ان چند عبقری اور لیجنڈری شخصیات میں سے ایک ہیں جن کے نام وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ اور تابناک ہوتے جاتے ہیں۔ ایسی شخصیات پر لکھنا اور لکھے پر لکھتے جانا ایک فیشن سا بن گیا ہے۔ لیکن اس سے بھی انکار ممکن نہیں کہ ایسے ادیبوں پر لکھے اور پڑھے بغیر رہا بھی نہیں جاتا۔ بنتی نہیں ہے بادہ و ساغر کہے بغیر۔ یہیں ایک دانشور کا قول بہت برمحل نظر آتا ہے کہ "غالب و اقبال اردو کے ایسے شاعر ہیں جن پر کچھ لکھنا آسان بھی ہے اور مشکل بھی۔ آسان اس لیے کہ ان پر اتنا کچھ لکھا جا چکا ہے کہ جو چاہے اس کے انبار سے کوئی چیز نکال کر کچھ نہ کچھ پیش کر سکتا ہے۔ مگر ان کے متعلق کوئی نئی چیز پیش کرنا آسان نہیں بلکہ بہت مشکل ہے۔"

ذرا یاد کرو قربانی

اگست ہندوستان کی تاریخ کا ایک اہم مہینہ ہے۔ یہ وہ مہینہ ہے جب ہم غیر ملکی غلامی اور ظلم و استبداد سے آزاد ہوئے۔ کم و بیش دو سو سال کی طویل غلامی کے بعد 15 راگست 1947ء کو آزادی کا سورج طلوع ہوا۔ یہ ہماری خوش نصیبی ہے کہ ہم آج آزاد فضا میں سانس لے رہے ہیں۔ لیکن اس آزادی کے حصول کے لیے ہمارے عمائدین اور بے غرض بزرگوں نے جو قربانیاں دیں اور اس کے لیے جس جد و جہد کا مظاہرہ کیا وہ ہمارے لیے مشعل راہ ہے۔ آج ہم اس کی روشنی میں آئندہ کے لیے لائحہ عمل تیار کر سکتے ہیں۔ لیکن افسوس آج ہم خود غرضی کے دلدل میں پھنستے جا رہے ہیں۔

اس میں کوئی شک نہیں کہ ہم ہر سال یوم آزادی کو ایک قومی تہوار کے طور پر بڑے جوش و خروش سے مناتے ہیں اور بڑے والہانہ انداز میں گاتے ہیں:

اے میرے وطن کے لوگو! ذرا آنکھ میں بھر لو پانی
جو شہید ہوئے ہیں ان کی، ذرا یاد کرو قربانی

لیکن ہمارا یہ عمل بڑے ہی مشینی انداز کا ہوتا ہے جو روح سے یکسر خالی ہوتا ہے۔ جھنڈے پھہرائے جاتے ہیں، ترانے گائے جاتے ہیں اور ان شہیدوں کو یاد بھی کیا جاتا ہے، جنھوں نے دیس کے لیے قربانیاں دیں لیکن یہ سب آمدن، نشستن، گفتن، خوردن اور برخاستن تک محدود ہوتا ہے۔ اس کے آگے باقی سب خیریت ہے۔ ہونا تو یہ چاہئے تھا کہ ہم غلامی کے اس پورے دور کو اس کی روح کے ساتھ یاد کرتے، اس کی ذلتوں کو محسوس کرتے، آزادی کے لیے جس جوش اور جذبے کا ہمارے بزرگوں نے مظاہرہ کیا اس کی روح تک پہنچنے کی کوشش کرتے، جس سادگی،

بےلوثی اور خلوص سے ہمارے بزرگوں نے جدوجہد کی تھی اس کو ہم اپنا شعار بناتے۔
دراصل ہم آج بھی غلامی کی زندگی جی رہے ہیں۔ جہالت کی تاریکی، غربت کی نکبت، غرض کی بندگی اور اپنے نفس کی غلامی، یہی کچھ ہے آج کی ہماری زندگی۔ یادرکھیں جب تک ہم ان سب برائیوں سے نجات حاصل نہیں کریں گے ہم صحیح معنوں میں آزادی کی برکتوں سے فیضیاب نہیں ہو سکتے۔

جدوجہد آزادی میں ہمارے بزرگوں نے اپنے اپنے انداز میں شرکت کی تھی۔ کسی نے تلوار اور گولہ بارود کا سہارا لیا تھا تو کسی نے اس کے بغیر اہنسا کے سہارے جنگ کی۔ لیکن ایک طبقہ ایسا بھی تھا جس نے ان سب سے الگ اپنے قلم سے جہاد کیا تھا۔ ایسے ایک دو نہیں ہزاروں نام ہیں جن میں سے آج ہم کچھ کو تو جانتے ہیں لیکن بہت سے ایسے ہیں جو گمنام شہید ہو گئے مگر ان کے نغمے اور ترانے جو تحریک آزادی میں لہو کو گرم رکھنے کا سبب بنتے تھے۔ آج بھی بے نامی، گمنامی ،آوارگی نیز بے سروسامانی کا طوق پہنے ادھر ادھر بھٹک رہے ہیں۔
ستم ظریفی یہ ہے کہ ہر سال یوم آزادی کے موقع سے ''جنگ آزادی میں اردو/ ہندی شاعری کا حصہ'' یا ''اردو رہندی شاعری اور جنگ آزادی'' نام سے بیسیوں مضامین لکھے جاتے ہیں اور چھپوائے جاتے ہیں، لیکن ہر مضمون اپنے ماقبل مضامین کا چربہ ہوتا ہے، اس میں کوئی نئی بات نہیں ہوتی۔ مزے کی بات یہ ہے کہ چربہ بھی انتہائی مضحکہ خیز انداز میں غلطیوں کی نقل درنقل ہوتا ہے۔ یہ تو رہی مضمون کی بات۔ کتاب کی سطح پر بھی اس طرح کی غلطیاں عام ہیں۔ آزادی سے متعلق بہت سے نغمے اور ترانے لکھے گئے تھے جنہیں انگریز حکمرانوں نے ضبط کرلیا۔ آج صورت حال یہ ہے کہ کئی لوگ/ ادارے ''ضبط شدہ ترانے، ضبط شدہ نظمیں'' یا اس قبیل کے دوسرے عنوان کے تحت کتابیں شائع کررہے ہیں جو سب کے سب ایک ہی مواد پر مبنی ہوتی ہیں یعنی کچھ ترانے/ نغمے ان کے خالق کے نام کے ساتھ اور باقی نامعلوم کے کھاتے میں اور کچھ اشعار کسی دوسرے کے نام غلط طور پر منسوب کردیے گئے۔ مزے کی بات یہ ہے کہ اس طرح کے موضوعات پر پی ایچ ڈی کی ڈگری بھی عطا کردی جاتی ہیں۔

ضرورت اس بات کی ہے کہ ایسے تمام اشعار/ ترانے/ نغمے جواب تک نامعلوم زمرے کے

تحت درج ہوتے چلے آئے ہیں ان سب کی اس نہج پر تلاش وجستجو اور تحقیق ہونی چاہئے کہ ان تخلیقات کے خالق کون ہیں، ان کے احوال وکوائف کیا ہیں اور وہ کون سے اسباب وعلل تھے کہ جن کی وجہ سے یہ گمنام اور نامعلوم رہے۔ یہ صحیح ہے کہ یہ کام آسان نہیں لیکن یہ سوچ کر چھوڑ دینا اور ایک ہی بات کی تکرار کرتے جانا تن آسانی کے سوا کچھ نہیں۔ایک شعر ہے:

غزالاں تم تو واقف ہو کہو مجنوں کے مرنے کی
دوانہ مرگیا آخر کو ویرانے پر کیا گزری

اب تک یہ شعر رام نرائن موزوں سے منسوب ہے جو مختلف قرأتوں کے ساتھ مشہور ہے لیکن اب یہ شعر بنی نرائن جہاں کے ساتھ بھی منسوب کیا جارہا ہے۔اسی طرح:

سرفروشی کی تمنا اب ہمارے دل میں ہے
دیکھنا ہے زور کتنا بازوئے قاتل میں ہے

عام طور پر یہ رام پرساد بسمل سے منسوب ہے لیکن کچھ لوگ اسے بسمل عظیم آبادی سے بھی منسوب کرتے ہیں۔ حقیقت کیا ہے یہ معلوم کرنا ان اسکالرز اور مقالہ نگاروں کا فرض ہے جو اس موضوع پر لکھتے رہتے ہیں یا لکھنا چاہتے ہیں۔اس کے علاوہ نیشنل آرکائیوز میں ایسی سیکڑوں تخلیقات محفوظ ہیں جو اب تک گمنام اور بے نام ہیں۔ہم ان میں سے کچھ کو یہاں درج کرتے ہیں۔ایک غزل جس کا مطلع ہے:

وہ قتیل تیغ ستم ہوں میں کہ فلک نے مجھ کو مٹا دیا
نہ نکلنے پائی تھی اُف تلک کہ گلا ہی آ کے دبا دیا

ایک نظم ہے''چلو جیل خانے''جس کا پہلا بند ہے:

سنو گوشۂ دل سے ذرا یہ ترانے
انوکھے نرالے ہیں جنگی فسانے
کہیں شورِ ماتم، کہیں شادیانے
اسی طرح کٹتے رہیں گے زمانے
کرو تھوڑی ہمت نہ ڈھونڈو بہانے
چلو جیل خانے! چلو جیل خانے!

'حب وطن' کے عنوان سے ایک نظم کا پہلا شعر ہے:

آہِ شرر افشاں کی تاثیر دکھادیں گے
احساس کی دنیامیں اک آگ لگادیں گے

'بھارت ہے جان ہماری' کا پہلا شعر ہے:

بھارت ہے جان ہماری اور جان ہے تو سب کچھ
ایمان ہے ہمارا، ایمان ہے تو سب کچھ

'شہید وطن کی آرزو' کے تحت گمنام شاعر کہتا ہے:

آرزو ہے کہ چلے ایسی ہوا میرے بعد
اپنی ہستی سے ہو بیزار جفا میرے بعد

'مقدمہ سازش لاہور' کا یہ شعر کس کو یاد نہیں:

شہیدوں کی چتاؤں پرلگیں گے ہر برس میلے
وطن پر مرنے والوں کا یہی باقی نشاں ہوگا

'بھگت سنگھ اور دت' نظم کا یہ شعر بھی گمنام شاعر سے منسوب ہے:

سختیوں سے باز آ او حاکم بیداد گر
دردِ دل اس طرح دردِ لا دوا ہو جائے گا

'دار پر چڑھ کر دکھادیں گے' نظم کا یہ شعر بھی مجاہدین آزادی کے دلوں کو برماتا رہا ہے:

ہمارے سامنے سختی ہے کیا ان جیل خانوں کی
وطن کے واسطے ہم دار پر چڑھ کر دکھادیں گے

بدیسی حکومت کے خلاف نفرت کو بڑھاوا دینے اور حب وطن کے جذبے کو بیدار کرنے کے لیے غیر ملکی مصنوعات اور کپڑوں کے بائیکاٹ کا نعرہ بھی دیا گیا تھا:

ہے پھیلی کاہلی دنیا جہاں میں سارے
اسی خیال سے میرے خیال ہیں نیارے
تمام دن میرا بیکار گزرے ہے پیارے

میں تو کاتوں گی چرخہ کروں گی بھجن
مجھے گاڑھا سودیشی منگادو سجن

'پیغام حیات' دیتے ہوئے ایک گمنام شاعر کہتا ہے:

اٹھ اے ہندی، گیا اب وقت تیرے خوابِ راحت کا
کہ ہے رقصاں تیری بالی پہ ہنگامہ قیامت کا

'دیوانے بہت' کے تحت ایک اور نامعلوم شاعر اعلان کرتا ہے:

ہیں ابھی تیار مرمٹنے کو مستانے بہت
لکھے جائیں گے ہمارے خوں سے افسانے بہت

'اے خفتہ بخت ہندی' کے عنوان سے غافل وطن پرستوں کو شاعر یوں جگاتا ہے:

میرٹھ کی سرزمیں سے آتی ہیں یہ صدائیں
اے خفتہ بخت ہندی کب تک تجھے جگائیں

'اسمبلی میں بم کا واقعہ' جدوجہد آزادی کا ایک اہم اور مشہور واقعہ ہے۔ شاعر نے اس واقعہ کو اپنی نظم میں کچھ اس طرح بیان کیا ہے:

ڈرے نہ کچھ بھی جہاں کی چلا چلی سے ہم
گرا کے بھاگے بھی نہ بم اسمبلی سے ہم

مجاہدین آزادی کو ہراساں اور پریشان کرنے کے لیے فرنگیوں نے مختلف ہتھکنڈے اپنائے تھے۔ صحافیوں اور رپورٹروں تک کو نہیں چھوڑا۔ اس واقعہ کی عکاسی ایک گمنام شاعر نے اپنی نظم 'دفتر کی تلاشی' میں کچھ اس طرح کی ہے:

اندر کی تلاشی، کبھی باہر کی تلاشی
لے لیتے ہیں ہر روز وہ دفتر کی تلاشی

ان حالات سے اکتا کر ایک شاعر فرنگیوں کو چیتاونی دیتا ہے:

باز آ اب تو جفا سے، اے فرنگی باز آ
پھونک ڈالے گی تجھے ہی یہ شرر باری تیری

اور ''کردیں گے ظالموں کا اب بند ظلم ڈھانا'' کے اعلان کے ساتھ ہی شاعر کہتا ہے:

بھارت کے ہم ہیں بچے، بھارت ہماری ماتا

اس کے ہی واسطے ہے منظور سر کٹانا

ایسے نغموں، ترانوں اور دیگر تخلیقات کی ایک لمبی فہرست ہے، جن کے خالق کا اب تک پتہ نہیں چل سکا ہے۔ جو ہنوز یتیمی اور یسیری کی لعنت جھیل رہے ہیں۔ کیا ہمارے ریسرچ اسکالر اور محققین اس طرف توجہ دیں گے؟

(اگست 2006)

''.....خان بہادر مولوی سید اکبر حسین اکبر سیشن جج الہ آباد کی برجستہ سخنوری کا ایک زمانہ قائل ہے۔ کچھ عرصہ ہوا انہوں نے انگریزی کی ایک نادر نظم 'موسوم بہ 'روانی آب' کا ترجمہ بذریعہ معارف شائع کیا تھا جسے دیکھ کر ہر سخن فہم تصویر حیرت بن گیا تھا۔ وہ ترجمہ اس قدر پسند ہے کہ ہم اسے آئندہ کسی پرچہ میں منقولات کے صیغہ میں درج کریں گے..... سردست انہوں نے ایک ایسی نظم عنایت کی ہے جو انہوں نے بہ فرمائش نواب محسن الملک مولوی سید مہدی علی صاحب بہادر کلکتہ کانفرنس کے لئے تیار کی تھی مگر چونکہ وہ شریک نہ ہو سکے اس لئے نہ کبھی پڑھی گئی اور نہ شائع ہوئی۔ ہر چند کہ اس کا خطاب مسلمانوں کی طرف ہے مگر اس میں زور قلم ایسا دکھایا گیا ہے کہ ہمارے ہندو ناظرین بھی اسے یقیناً قدر کی نگاہ سے دیکھیں گے.....عبدالقادر'' (مخزن، اکتوبر 1902ء)

''میرے محترم دوست مولانا محمد یوسف صاحب جعفری رنجور نے خواجہ حالی کی اس نفیس غزل پر مصرعے لگائے ہیں جن میں حضرت نے ایک ایک کر کے عشق کے سارے ہتھکنڈے گن دیئے ہیں۔ مگر وہ تو دو ہی دو تھے خیر سے یہ تین تین مصرعے اور چسپاں ہو گئے ہیں ایک اچھا خاصا ضمیمہ ہو گیا۔ اب اس کے 'کارنامہ عشق' ہونے میں کوئی کسر باقی نہیں رہی۔ خواجہ صاحب کا کلام اس پر حضرت رنجور کے مصرعے سونے میں سہاگہ۔ نذر کرتا ہوں۔'' (مخزن، مارچ 1904)

ایک ہشت پہلو ادیب

موت برحق ہے۔ ایک دن سب کو آنی ہے۔ موت سے کس کو رستگاری ہے، آج وہ کل ہماری باری ہے۔ سو موت بزرگ ادیب اور صحافی احمد ندیم قاسمی کو بھی گلے لگا گئی۔ غم منانا اور ماتم کرنا رسم دنیا ہے۔ سو دنیا نے اپنے اپنے طور پر تعزیتیں کیں۔ تعزیت ہم بھی کرتے ہیں لیکن ساتھ ہی اس بات پر خوشی اور رشک کا اظہار بھی کرتے ہیں کہ ایک شخص اپنی عمر طبعی بھرپور طریقے سے گزار کر واصل حق ہوا۔ احمد ندیم قاسمی صاحب اپنی زندگی کے آخری لمحوں تک مصروف عمل رہے۔

احمد ندیم قاسمی (20/نومبر 1916ء۔10/جولائی 2006) اردو فکشن میں اس مضبوط روایت کی اگلی کڑی ہیں جس کی بنا شہنشاہ فکشن پریم چند نے بیسویں صدی کے آغاز میں ڈالی تھی۔ پریم چند نے اردو فکشن میں حقیقت نگاری کی شروعات کی تھی۔ ساتھ ہی انہوں نے اپنے افسانوں میں دیہی ماحول اور ثقافت کی عکاسی اور پیش کش شدومد سے کی تھی۔ احمد ندیم قاسمی کے ہاں یہ ساری خوبیاں بدرجۂ اتم موجود ہیں۔ اس طرح اردو فکشن میں قاسمی پریم چند کے سچے جانشین قرار پاتے ہیں۔ یہ بھی حسن اتفاق ہے کہ پریم چند کا انتقال اس وقت ہوا جب قاسمی کے ادبی کیریئر کی شروعات ہو رہی تھی۔ پریم چند نے جو بنیاد ڈالی تھی اس کو احمد ندیم قاسمی نے اپنے افسانوں سے مزید استحکام بخشا۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ پریم چند کے بعد منٹو، کرشن چندر، عصمت چغتائی اور بیدی سمیت حقیقت نگاروں کی ایک فوج سامنے نظر آتی ہے لیکن ان میں سے بیشتر کا تعلق شہروں کی چمک دمک اور شہروں کے مسائل سے رہا۔ ہمارے ملک کی اکثریت دیہاتوں میں بستی ہے۔ ان دیہاتوں میں جہاں کے پیڑ پودے، لہلہاتے کھیت، ان کی مٹی کی سوندھی خوشبو اور فلیورا گر پریم چند کے بعد کسی کے یہاں نظر آتا ہے تو وہ احمد ندیم قاسمی ہیں جو اس

روایت کے سچے امین کی حیثیت سے اس کی پاسداری کرتے رہے۔

احمد ندیم قاسمی ایک فکشن نگار، شاعر اور کامیاب صحافی بھی تھے اور تینوں ہی میدان میں انہوں نے اپنا دستخط ثبت کیا۔ جہاں تک سوال اس بات کا ہے کہ ان تینوں حیثیتوں میں ان کی سب سے نمایاں حیثیت کون سی ہے تو عام طور پر بطور فکشن رائٹر انہیں قبول عام حاصل ہے اور یہی ان کی پہچان بھی ہے۔ واقعہ ہے کہ چین کے دورے پر وہاں کی جرنلسٹ یونین کے ارکان سے قاسمی صاحب کا تعارف کراتے ہوئے وفد کے سربراہ فیض احمد فیض جب بھی کہتے: He is the Editor of a vernacular daily' Imroze' which means 'today" تو احمد ندیم قاسمی کو ناگوار گزرتا، وہ چاہتے تھے کہ روزنامہ کے ایڈیٹر سے پہلے شاعر اور افسانہ نگار کی حیثیت سے تعارف کرایا جائے۔ حالانکہ کیریئر کا آغاز ہی انہوں نے رسائل و جرائد کی ادارت سے کیا۔ سب سے پہلے وہ معروف معیاری رسالہ 'ادب لطیف' لاہور سے وابستہ ہوئے جہاں وہ 1943 تک مدیر رہے۔ تقسیم ہند کے بعد جب پاکستان کا وجود عمل میں آیا تو 1947 میں 'سویرا' کے مدیر بنائے گئے۔ مشہور و معروف رسالہ 'نقوش' کے تو پہلے ایڈیٹر ہوئے۔ 1963 میں اپنا رسالہ فنون جاری کیا جو 43 سال سے مستقل نکل رہا ہے۔ اس کے علاوہ امتیاز علی تاج کے رسالے 'پھول' اور 'تہذیب نسواں' کی ادارت سے بھی منسلک رہ چکے ہیں۔ احمد ندیم قاسمی صاحب ادبی صحافت کے ساتھ ساتھ سیاسی صحافت سے بھی وابستہ رہے۔ 'امروز' کے فکاہی کالم 'پنج دریا' سے انہیں کافی شہرت ملی اور جب جنرل ایوب خاں نے 'امروز' پر پابندی لگادی تو قاسمی کراچی سے نکلنے والے روزنامے 'جنگ' اور 'حریت' میں لکھنے لگے۔ جنگ میں 'رواں دواں' کے عنوان سے ان کا کالم کافی پسند کیا جاتا تھا، جو وہ آخری عمر تک لکھتے رہے۔

اتنے سارے ادبی رسائل و جرائد اور اخبارات سے جڑے رہنے کے بعد ظاہر ہے کہ بطور صحافی احمد ندیم قاسمی کی حیثیت مستحکم ہو چکی تھی۔ لیکن ایک صاحب قلم کو تادیر زندہ رکھنے کے لیے جو چیز زیادہ کارآمد اور سودمند ہوتی ہے وہ صحافت نہیں ادب ہے۔ کہتے ہیں صحافت ایک عارضی چیز ہے جب کہ ادب کی حیثیت مستقل ہوتی ہے۔ چنانچہ احمد ندیم قاسمی چاہتے تھے کہ ان کا تعارف صحافی کے ساتھ ساتھ بحیثیت ادیب بھی ہو بلکہ ان کی اصل شناخت شعر و ادب ہی بنے۔

جس زمانے میں احمد ندیم قاسمی نے لکھنا شروع کیا تھا اس وقت بیدی، عصمت، کرشن چندر اور منٹو کا طوطی بولتا تھا۔ سعادت حسن منٹو کی تو ہر تحریر بکتی تھی۔ احمد ندیم قاسمی کا اختصاص یہ ہے کہ منٹو جیسا جینئس اور سر کردہ رائٹر نہ صرف انہیں دوست رکھتا تھا بلکہ اہم معاملات میں ان سے مشورے بھی کرتا تھا۔ منٹو جب بمبئی میں تھے تو وہاں سے ندیم کو لاہور میں خط لکھ کر اپنی مشکلات اور پریشانیاں شیئر کرتے۔ منٹو کے افسانوں کی جھلک ندیم کے افسانوں میں کہیں کہیں نظر آجاتی ہے۔ ندیم کے افسانوں میں ہیروشیما سے پہلے ہیروشیما کے بعد، پرمیشر سنگھ، بین، گھر سے گھر تک، کنجری، رئیس خانہ، سیلاب وگرداب، موت اور سناٹا نا قابل فراموش افسانے ہیں۔ 'موت' ان کے ابتدائی افسانوں میں سے ایک ہے جو ماہنامہ 'آجکل' کے یکم اکتوبر 1946 کے شمارے میں شائع ہوا تھا۔ جہاں تک ماہنامہ 'آجکل' سے احمد ندیم قاسمی کے تعلق کا سوال ہے تو احمد ندیم شروع سے ہی 'آجکل' کے مستقل قاری اور قلم کار رہے اور اپنی کوئی بھی چیز خواہ وہ نثری ہو یا شعری ترجیحاً آجکل کو ارسال کرتے تھے اور کبھی کسی خاص نمبر یا سالنامہ میں شامل نہ ہو پانے کا انہیں افسوس ہوتا جس کا وہ برملا اظہار بھی کرتے تھے۔

1947 کا سالنامہ جو جون میں شائع ہوا تھا، اس پر اپنے تاثرات کا اظہار کرتے ہوئے احمد ندیم قاسمی نے لکھا "سالنامہ آجکل مل گیا تھا۔ مجھے افسوس ہے کہ میں بہ حیثیت افسانہ نگار اس میں شامل نہ ہوسکا۔ آج کل کے سالنامے علم وادب کی دنیا میں ہمیشہ کوئی نہ کوئی نئی چیز پیش کرتے آئے ہیں، مگر اب کے آپ نے تو رسالہ کی ترتیب اور اعلیٰ مضامین کی فراہمی میں کمال کر دکھایا ہے۔ مستند لکھنے والوں کا اتنا انبوہ مجھے پہلے اس رسالے میں کبھی نظر نہیں آیا۔ مضامین کی افادیت اور ٹھوس مگر دلچسپ موضوعات مکمل افسانے اور دلنواز نظموں کا یہ خوبصورت انبار اردو ادب میں یادگار رہے گا۔ خدا آپ کو اردو کی ترقی وترویج کی بیش از بیش توفیق بخشے۔" احمد ندیم قاسمی کا 'آجکل' سے یہ تعلق آزادیٔ وطن اور تقسیم ملک کے بعد بھی 1948 تک قائم رہا۔

احمد ندیم قاسمی کو پاکستان میں وہی مرتبہ اور حیثیت حاصل تھی جو ہندوستان میں قرۃ العین حیدر کو ابھی حاصل ہے۔ وہ ادب وصحافت کے اس اعلیٰ مقام پر متمکن تھے جہاں سے ان کی غیر موجودگی واضح طور پر دیر تک محسوس کی جاتی رہے گی۔

(ستمبر 2006)

نایاب گمشدہ تخلیقات کی بازیافت

قارئین کرام! ایک بار پھر ہم ہندوستانی فکشن لیجنڈ پریم چند پر ایک بھرپور اور نایاب گوشہ پیش کرنے کی سعادت حاصل کر رہے ہیں۔ پریم چند ہندوستانی فکشن کے سب سے درخشاں ہیرو بلکہ ہیرا ہیں۔ انہوں نے جس قدر چیزیں تخلیق کی ہیں اور جس تواتر سے کی ہیں وہ اپنی مثال آپ ہیں۔ جو اس زمانے کے مختلف رسائل و جرائد اور اخبارات میں ہنوز دبی پڑی ہیں اور دھیرے دھیرے یہ چیزیں عاشقین پریم چند کے ذریعے سامنے آرہی ہیں۔ تحقیق میں کچھ حرف آخر نہیں ہوتا۔ آج کی تحقیق کل کو غلط ثابت ہوسکتی ہے اور مزید تحقیق ایک دوسرے پہلو کو سامنے لاسکتی ہے۔ اسی طرح محققین میں بھی اختلاف رائے ہوسکتا ہے۔ ایک کو فلاں چیز، فلاں ادیب کی معلوم ہوتی ہے تو دوسرے کو وہی چیز کسی دوسرے صاحب کی معلوم ہوسکتی ہے اور دونوں محققین کی اپنی اپنی منطق اور اپنے اپنے جواز ہوں گے۔ کبھی کبھی ایسا بھی دیکھنے میں آیا ہے کہ محقق کی جلد بازی اور تن آسانی کے سبب گمراہی کا ایک طویل اور لامتناہی سلسلہ شروع ہو جاتا ہے۔ ایسے محققین ''کاتا اور لے دوڑی'' کے مصداق ادب میں فوراً معروف و مشہور ہو جانے کی ہوڑ میں اس طرح کی حرکتیں کر بیٹھتے ہیں۔

پریم چند کے سلسلے میں کچھ ایسے تنازعات اس لیے کھڑے ہو گئے کہ پریم چند نے بیک وقت اپنی تحریروں میں مصلحتاً کئی قلمی اور فرضی ناموں کا استعمال کیا۔ پریم چند جس دور میں لکھ رہے تھے وہ ظلم و جبر اور انگریزی سامراج کا دور تھا جس کے خلاف پریم چند جیسا حساس اور باشعور ادیب خاموش ہاتھ پر ہاتھ دھرے بیٹھا نہیں رہ سکتا تھا۔ پریم چند اس سیل رواں کی مانند تھے کہ جس کے سامنے کا ایک راستہ اگر بند کر دیا جائے تو وہ دوسری طرف بہہ نکلتا ہے۔ چنانچہ ہم دیکھتے ہیں کہ

'سوز وطن' کی بے ضابطہ ضبطی کے بعد بھی ان کا قلم رواں دواں رہا۔ یہ اور بات ہے کہ انہیں مختلف مخففات یا فرضی ناموں کبھی د۔ر، کبھی ن۔ راور کبھی بمبوق کا سہارا لینا پڑا۔

زیر نظر شمارہ میں ہم پریم چند کی کچھ ایسی ہی گم شدہ اور نایاب تخلیقات شائع کرنے کا شرف حاصل کر رہے ہیں۔ جو انہی مخففات یا فرضی ناموں سے شائع ہوئیں اور جو اب تک پچھلے سو سالوں سے بوسیدہ رسائل کے اوراق میں دفن تھیں۔ ان تخلیقات میں 'زمانہ' کانپور، جولائی 1908 کے شمارہ میں د۔ر۔ از انبالہ کے نام سے 'آبشار نیا گرا' پر پریم چند نے ایک بہترین مضمون قلم بند کیا تھا۔ آبشار نیا گرا سے متعلق پریم چند کی منظر کشی دیکھتے ہی بنتی ہے۔ "جب پانی پر رنگین کرنیں پڑتی ہیں تو بلب کے چند گولے چھوڑ دیے جاتے ہیں۔ جن کے چھوٹتے ہی دھوئیں دار بادل بن جاتے ہیں۔ جن پر مصنوعی روشنی پہنچائی جاتی ہے اور آسمان پر اڑتا ہوا دھواں ایک مصنوعی بادل کی شکل اختیار کر لیتا ہے۔ جس پر مختلف رنگوں کا عکس پڑتا ہے۔ بعض دفعہ یہ بادل ستاروں کے مشابہ ہوتے ہیں اور بہت عجیب اور خوبصورت معلوم ہوتے ہیں۔ کبھی کبھی برقی روشنی کی کرنیں اس بڑے فولادی پل پر ڈالی جاتی ہیں جو آبشاروں کے نیچے بنا ہوا ہے۔ یہاں سے تماشائیوں کے جھنڈ کے جھنڈ صاف نظر آتے ہیں۔ یہ روشنی کی شعاعیں سو میل اور کبھی کبھی ڈیڑھ سو میل کے فاصلے سے نظر آتی ہیں۔"

دوسرا مضمون 'دو انگریزی فلاسفر' کے نام سے ہے جس میں پریم چند نے بیکن اور ہربرٹ اسپنسر کے خیالات اور اقوال کی روشنی میں ان کا تقابلی مطالعہ پیش کیا ہے۔ تقابلی مطالعہ کے شعبے میں یہ ایک اہم مضمون ہے۔

منشی پریم چند نثر نگار تھے شاعر نہ تھے۔ لیکن ایسا بھی نہ تھا کہ وہ شاعری کی سوجھ بوجھ سے بالکل ہی نابلد تھے۔ وہ اچھی شاعری کو پسند بھی کرتے تھے اور داد بھی دیتے تھے۔ اقبال، غالب، حالی، سرور اور نادران کے پسندیدہ شاعروں میں سے تھے۔ "کلام سرور" جو زمانہ کانپور کے جولائی 1911 کے شمارے میں شائع ہوا تھا جس میں پریم چند نے منشی درگا سہائے سرور کی وفات پر ایک بھرپور تنقیدی اور تجزیاتی مضمون لکھا ہے۔ جس میں تعزیت بھی کی گئی ہے، دوستی کا حق بھی ادا کیا گیا ہے اور اچھے اشعار پر داد بھی دی گئی ہے۔

ایک مضمون ''سوئٹزر لینڈ'' کے عنوان سے 'زمانہ' کانپور میں ہی جنوری 1916ء میں شائع ہوا تھا۔ جس میں سوئٹزر لینڈ کا جغرافیہ اور کوہ آلپس کی ایسی منظر کشی کی گئی ہے گویا ہم چلتی پھرتی کوئی فلم دیکھ رہے ہوں۔ حالانکہ اس مضمون کے متعلق خیال کیا جاتا ہے کہ یہ ناگری پرچارنی پتریکا میں شائع کسی مضمون کا ترجمہ ہے۔ اگر یہ ترجمہ ہے تو اس خوبصورت اور طبع زاد ترجمے کے قربان جایئے۔

'مہری' ایک انتہائی خوبصورت مزاحیہ اور طنزیہ افسانہ ہے۔ جسے پریم چند نے 'زمانہ' کانپور، نومبر 1926 کے شمارے میں 'بمبوق' کے فرضی نام سے شائع کرایا تھا۔ کہانی کم وبیش 80 سال پرانی ہونے کے باوجود آج کی معلوم ہوتی ہے اور پڑھنے سے تعلق رکھتی ہے۔ ''اشک ندامت'' ڈکنس کی تحریر سے ماخوذ کہانی ہے جو 'کہکشاں' لاہور کے شمارہ جنوری 1920 میں شائع ہوئی تھی۔ کہانی انتہائی خوبصورت اور جذبات سے مملو ہے۔ ان چھ گمشدہ اور نایاب تخلیقات کے مطالعے سے ہی پریم چند کی تخلیقی زندگی کے تمام پہلو نمایاں ہو جاتے ہیں۔ یعنی وہ ایک اچھے صحافی، ایک اچھے مترجم، ایک اچھے کہانی کار اور ایک اچھے طنز و مزاح نگار بھی کچھ تھے۔ وہ ایک ہمہ پہلو ادیب تھے، وہ ایک ایسے ادیب تھے جن کا تتبع ان کے دور میں بھی کیا گیا اور ان کے بعد بھی۔

یہ چھ کی چھ تخلیقات وہ ہیں جو اب تک محققین پریم چند کی نظروں سے اوجھل رہی ہیں۔ اس طرح کی کچھ اور چیزیں دستیاب ہونے کی اطلاعات ملی ہیں۔ جس میں ایک افسانہ 'کہن' بھی شامل ہے۔

● پریم چند کی 70ویں برسی پر انہیں بطور خراج عقیدت یہ گوشہ پیش کرتے ہوئے مجھے ایک شعر بار بار یاد آ رہا ہے:

کر رہا تھا غم جہاں کا حساب
آج تم یاد بے حساب آئے

یہ یاد کسی اور کی نہیں بلکہ میری ماں کی ہے۔ یکم ستمبر کو میری والدہ محترمہ کا اس سرائے فانی سے انتقال پرملال ہو گیا۔ والدہ ماجدہ کا سایہ سر سے اٹھ جانے کا غم ہمیشہ ستاتا رہے گا۔ یہ وہ خلا ہے جو کسی صورت پُر نہیں ہو سکتا۔ سنا ہے اور مجھے یقین بھی ہے کہ ماں کے قدموں تلے جنت ہوتی ہے۔ ہم تو جیتے جی اس جنت سے محروم ہو گئے۔

(اکتوبر 2006)

اردو ادب کا سعد مہینہ

نومبر کا مہینہ ان معنوں میں اردو ادب کے لیے سعد ہے کہ اس مہینہ میں اردو کے کئی مشہور و معروف اور اعلیٰ پایہ کے ادیب و شاعر پیدا ہوئے۔ اس لحاظ سے یہ اعزاز کسی اور مہینہ کو حاصل نہیں۔ ان میں علامہ اقبالؒ (9 ر نومبر)، مولانا ابوالکلام آزاد (11 ر نومبر)، علی سردار جعفری (29 ر نومبر) اور سجاد ظہیر (5 ر نومبر) کے علاوہ احمد ندیم قاسمی (20 ر نومبر) خاص ہیں۔ ان کے علاوہ اور نہ جانے کتنے ادیب ہوں گے، جنہوں نے اپنی بیش بہا تحریروں اور فن پاروں سے اردو ادب کو مالا مال کیا ہوگا۔ ہم ان حضرات کی سالگرہ کے موقع پر ان میں سے صرف تین انتہائی اہم اور اعلیٰ پایہ کے ادیب و شاعر کی علمی و ادبی خدمات کے اعتراف میں ایک خصوصی شمارہ پیش کرنے کی سعادت حاصل کر رہے ہیں۔

علامہ اقبال اور مولانا آزاد پر ہم اکثر و بیشتر خصوصی گوشہ پیش کرتے رہے ہیں۔ یہ دونوں اردو ادب کی اتنی عظیم شخصیتیں ہیں کہ ہم انہیں کسی طور فراموش نہیں کر پاتے۔ ان کی تخلیقات میں اتنی گہرائی، گیرائی اور تہہ داری ہے کہ ہمیشہ کوئی نہ کوئی نیا پہلو یا نیا گوشہ سامنے آتا رہتا ہے اور باذوق اور ذی علم ادیب و نقاد کے لیے موضوع بحث تحریر فراہم کرتا رہتا ہے۔ اس بار بھی ہم حسب معمول ان دونوں شخصیات پر گوشے شائع کر کے انہیں تہنیت پیش کر رہے ہیں۔

زیر نظر شمارہ کی خاص بات یہ ہے ان دو عبقری شخصیات کے ساتھ ایک اور جانے مانے ادیب و شاعر اور صحافی احمد ندیم قاسمی پر بھی گوشہ پیش کر رہے ہیں، جن کا ابھی حال ہی میں (10 ر جولائی 2006) انتقال ہوا ہے۔ جب 1938ء میں اقبال کا انتقال ہوا تو احمد ندیم قاسمی کا قلم پاؤں پاؤں چلنا سیکھ رہا تھا اور جب مولانا آزاد کا 1958ء میں وصال ہوا تو احمد ندیم کا قلم شباب پر تھا۔ اس طرح انہیں ان دونوں سینئر معاصرین کو دیکھنے اور کچھ سیکھنے کا شرف حاصل ہوا۔ احمد ندیم قاسمی دور حاضر کے سب سے قد آور ادیب تھے۔ کم سے کم پاکستان میں ان سے بڑا کوئی

ادیب نہ تھا۔ گروہ بندی اور گروپ بازی کے اس دور میں بھی احمد ندیم قاسمی کو جو احترام حاصل تھا وہ کسی اور کے حصہ میں نہیں آیا۔

جیسا کہ ہم سبھی جانتے ہیں کہ احمد ندیم قاسمی کی ادبی شخصیت کے تین جہات ہیں۔ ایک کہانی کار کی حیثیت سے وہ پریم چند کی روایت کے امین و پاسدار رہے۔ دوسرے شاعر کی حیثیت سے اور تیسرے ایک بے باک صحافی کی حیثیت سے۔ کبھی کبھار منہ کا مزہ بدلنے کے لیے وہ تنقید اور طنز و مزاح بھی لکھ لیا کرتے تھے۔ لیکن کوئی انہیں کہانی کار کی حیثیت سے زیادہ اہمیت دیتا ہے تو کوئی انہیں بڑا شاعر مانتا ہے اور کوئی انہیں صحافت کے میدان میں زیادہ رواں دواں دیکھتا ہے کیونکہ ان تینوں شعبوں میں انہوں نے اپنے قلم کے جوہر کا بھرپور مظاہرہ کیا ہے اور یہ فیصلہ کرنا مشکل معلوم ہوتا ہے کہ کس کا پلہ بھاری ہے۔ لیکن خود احمد ندیم قاسمی اپنی ادبی شخصیت کے شاعر کو زیادہ اہمیت دیتے ہیں۔ شاید اس لیے کہ اس میں انہوں نے اپنی ایک الگ راہ نکالی ہے۔ کہانی کار کی حیثیت سے خود کو پریم چند کی روایت کا امین تو مانتے ہیں لیکن شاید اسی وجہ سے خود کو بہت اہمیت نہیں دیتے۔ جہاں تک صحافی کی حیثیت کا سوال ہے تو وہ اس میدان میں بھی یکساں مقام حاصل کرنے کے باوجود اسے اہمیت اس لیے نہیں دیتے کہ شاید وہ صحافت کو ادب کے مقابلے دوسرے درجے کی چیز سمجھتے ہیں۔ چنانچہ اگر کوئی ان کو صرف صحافی کی حیثیت سے اہمیت دیتا اور شاعر و کہانی کار کی حیثیت کو نظر انداز کرتا تو وہ ناراضگی کا اظہار کرتے۔

زیرِ نظر شمارہ میں ہم نے ان کی ان تینوں حیثیتوں پر بھرپور مضامین پیش کرنے کی کوشش کی ہے۔ ان میں بطور صحافی خاص کر کالم نگار کی حیثیت سے، کہانی کار کی حیثیت سے اور شاعر کی حیثیت سے ان کے اشہب قلم کی جولانی اور بے باکی کا اعتراف کیا گیا ہے۔ بطور صحافی ان کی حیثیت کا زمانہ قائل ہے کہ انہوں نے سرکار میں رہ کر بھی حق گوئی و بے باکی کا بھرپور مظاہرہ کیا اور جب اپنے اصولوں کے ساتھ سمجھوتہ کرنے کی مجبوری آئی تو اس جگہ کو ہی خیر باد کہہ دیا۔ حق گوئی کی پاداش میں جیل جانے کی بھی نوبت آئی:

''مجھے ایوب خاں کے دورِ حکومت کا آغاز یاد آرہا ہے، جب بہت سے وہ لوگ جو ملکی ترقی و خوشحالی کے سلسلے میں تعمیری سوچ رکھتے تھے، جیلوں میں نظر بند کر دیے گئے تھے۔ میں بھی ان

لوگوں میں شامل تھا۔ میں اس زمانے میں روزنامہ 'امروز' کا ایڈیٹر تھا۔ اسکندر مرزا اور ایوب خاں کی ملی بھگت کے آغاز ہی میں بہت سے تعمیری سوچ رکھنے والے افراد جیلوں میں بند کر دیے گئے تھے۔ بہت دنوں تک مجھے معاف رکھا گیا تھا اور میں سوچتا تھا کہ میں چونکہ ایک بڑے روزنامے کا مدیر ہوں اس لیے مجھ پر ہاتھ ڈالنے سے گریز کیا گیا ہے۔ پھر چند ہی روز بعد میں اپنے دفتر میں بیٹھا تھا تو ایک صاحب عام سے سیدھے سادے لباس میں میرے پاس تشریف لائے۔ میں سمجھا کہ یہ صاحب اخبار میں کوئی مراسلہ چھپوانے آئے ہوں گے۔ سو میں نے پوچھا کہ فرمایئے۔ جواب ملا کہ میرے پاس سیفٹی ایکٹ کے تحت آپ کی گرفتاری کے وارنٹ ہیں، چنانچہ میں روزنامے کے دفتر سے لاہور جیل کی ایک کوٹھری میں بحیثیت 'سی کلاس نظر بند' پہنچ گیا۔"

بحیثیت افسانہ نگار ایک زمانہ ان کا قائل ہے۔ متعدد یادگار کہانیاں ان کی حیثیت مسلم کرتی ہیں۔ افسانہ نگاری میں انہوں نے خود کو پریم چند کا پیرو قرار دیا ہے۔ بڑی حد تک یہ بات صحیح بھی ہے لیکن ان کی بہت سی کہانیاں ایسی ہیں جو ان کی حیثیت کو منفرد بناتی ہیں۔ 'موت' ایک ایسی ہی کہانی ہے جس میں وہ انگریزی ادیب جانسن کا تتبع کرتے نظر آتے ہیں لیکن موضوع کے لحاظ سے وہ جانسن سے بہت آگے دکھائی دیتے ہیں۔ 'موت' کو احمد ندیم قاسمی نے جس بھرپور طریقے سے متشکل کر کے پیش کیا وہ انہیں کا حصہ ہے۔ گویا 'موت' کہانی کار کی محبوبہ ہے اور کہانی کار والہانہ اسے گلے لگانے کے لیے بے تاب ہے۔ شاعری میں بھی احمد ندیم قاسمی نے کئی مجموعے یادگار چھوڑے ہیں۔ انہوں نے نظمیں بھی کہی ہیں اور غزلیں بھی، لیکن غزلوں میں ان کا پلہ بھاری نظر آتا ہے۔ گو کہ انہوں نے کئی بے حد اچھی اور خوبصورت نظمیں بھی کہی ہیں۔

ادب اور صحافت میں اتنا کچھ کارنامہ انجام دینے کے باوجود انہیں دو چیزیں نہ لکھ پانے کا قلق رہا۔ ایک ناول نہ لکھ پانے کا اور دوسرے اپنی خودنوشت سوانح کا۔ اخیر عمر میں وہ اپنی یہ خواہش بھی پوری کرنے کے متمنی تھے لیکن ان کی محبوبہ 'موت' نے انہیں مہلت نہ دی۔ لیکن ان کی کچھ طویل کہانیاں ایسی ہیں جو ناولٹ اور ناول کا درجہ رکھتی ہیں۔ اسی طرح اخبارات میں لکھے ان کے کالم خاص طور پر 'رواں دواں' ان کی خودنوشت کے ایسے منتشر اوراق ہیں جنہیں کوئی چاہے تو ترتیب دے کر ان کی سوانح لکھنے کا خواب شرمندۂ تعبیر کر سکتا ہے۔ ('آجکل' نومبر 2006)

آب حیات کے 125 سال

آب حیات محمد حسین آزاد کا شناخت نامہ ہے اور اکثر و بیشتر آزاد کا ذکر آب حیات کے حوالہ سے ہی کیا جاتا ہے جب کہ مولوی محمد حسین آزاد ایک ہمہ جہت شخصیت کے مالک تھے۔ انہوں نے بحیثیت ادیب کئی شعبوں میں کارہائے نمایاں انجام دیے۔ وہ بیک وقت ایک اچھے تذکرہ نگار/تنقید نگار، مورخ اردو ادب، نظم نگار بلکہ نئی نظم کے روح رواں اور ماہر لسانیات بھی تھے۔

محمد حسین آزاد کا تذکرہ ’آب حیات‘ 1880 میں شائع ہوا جس میں آزاد نے اپنے عہد کے تقاضے کے تحت انگریزی لالٹین سے روشنی حاصل کرنے کی کوشش کی ہے۔ آزاد کو اپنے سرمایہ تنقید کی کمی اور کم مائیگی کا (جو تذکروں کی شکل میں ان کے سامنے تھا) پورا احساس تھا۔ انہیں یہ بھی احساس تھا کہ ان کے سرمایہ تنقید کی کم مائیگی مغربی علوم سے استفادہ کے بغیر دور نہ ہوگی۔ چنانچہ آزاد نے اپنے اس تذکرے میں کوشش کی ہے کہ مذکورہ خامیاں دور کی جاسکیں لیکن وہ اس میں پورے طور پر کامیاب نہ ہو سکے۔ اس کی سب سے بڑی وجہ محمد حسین آزاد کی رنگین بیانی اور انشا پردازی ہے۔ آزاد نے اپنے ماقبل کے تذکروں سے استفادہ کرتے ہوئے انہیں باتوں کو اپنے رنگین پیرایہ اظہار میں پیش کر دیا ہے۔ بعض مقامات پر تو انہوں نے تحقیق سے بھی کام نہیں لیا بلکہ سنی سنائی باتوں کو اپنے الفاظ میں پیش کر دیا ہے۔

اسی طرح آزاد کی ایک خامی ان کا ’تعصب‘ ہے وہ جسے اونچا ثابت کرنے پر آمادہ ہوں تو زمین و آسمان کے قلابے ملا دیتے ہیں اور احتیاط کا دامن بھی چھوڑ دیتے ہیں۔ چنانچہ ذوقؔ کو برتر ثابت کرنے کی دھن میں غالبؔ اور مومنؔ کا معمولی انداز میں تذکرہ کیا ہے بلکہ غالبؔ کے متعلق تو منفی رویہ اختیار کیا ہے جب کہ مومنؔ کو سرے سے ہی نظر انداز کرنے کی کوشش کی۔

تعصب، تحقیق کی کمی اور انشا پردازی آزاد کی تنقید کو مجروح کرتے ہیں تاہم آب حیات میں کچھ خوبیاں بھی ہیں جنہیں نظر انداز نہیں کیا جاسکتا۔ آزاد نے اردو شاعروں کو مختلف ادوار میں تقسیم کیا ہے۔ جیسے پہلے دور میں ولی، آبرو، مضمون، ناجی، احسن اور یکرنگ کو رکھا ہے۔ دوسرے دور میں شاہ حاتم، آرزو اور فغاں کو جگہ دی ہے، تیسرے دور میں مرزا مظہر جان جاناں، تاباں، سودا، میر ضاحک، درد، سوز اور میر تقی میر کو رکھتے ہیں۔ چوتھے دور میں جرأت، انشا، مصحفی اور رنگین کو رکھا ہے اور اسی طرح پانچویں دور میں ناسخ، آتش، ذوق، مومن، غالب، انیس اور دبیر کا ذکر کیا ہے۔ ساتھ ہی ہر دور کے ساتھ اس دور کی خصوصیات اور تاریخی ارتقا پر بھی نظر ڈالی ہے۔

اس کے علاوہ آب حیات کے شروع میں 'زبان اردو کی تاریخ' برج بھاشا پر عربی اور فارسی کے اثرات اور نظم اردو کی تاریخ پر بھی بھرپور روشنی ڈالی ہے۔ آب حیات کی ان خصوصیات کی بنا پر ہم اسے تذکرہ کے ساتھ ساتھ 'تاریخ اردو ادب' کے ضمن میں بھی رکھتے ہیں۔

نظم میں ان کا سب سے بڑا اور اہم کارنامہ انجمن پنجاب (1874ء) کا قیام ہے۔ جس کے تحت کسی بھی موضوع پر حقیقت نگاری اور فطرت نگاری کی جاتی تھی۔ کہہ سکتے ہیں کہ یہ اردو نظم میں ایک نئے رجحان کی بنیاد تھی۔ بلاشبہ آزاد کی ادبی زندگی کا یہ ایک اہم پڑاؤ ہے۔

آزاد کی نظموں کے مطالعہ سے پتہ چلتا ہے کہ انہیں تصویر کشی میں کمال حاصل تھا۔ تخئیل کی بلند پروازی، الفاظ کی شان و شوکت ان کے یہاں پورے آب و تاب سے نظر آتی ہے۔ اس کے علاوہ آزاد نے بھی مغرب کی مادی ترقی سے روشنی لے کر قومیت کے نئے تصور کو ابھارنے کی کوشش کی ہے۔ آزاد کی نظم 'حب وطن' ان کے قوم پرور اور وطن پرست ہونے پر دال ہے۔

آزاد کی ادبی زندگی کی ایک اور منزل ان کی فارسی دانی ہے۔ جس کے تحت انہوں نے 'سخن دان فارس' جیسی کارآمد اور ضخیم کتاب تحریر کی۔ 'آب حیات' بلاشبہ ان کا لازوال اور بے مثال کارنامہ ہے۔ اپنی بعض خامیوں کے باوجود یہ آج بھی انتہائی مقبول ہے۔ 'آب حیات' کی اسی مقبولیت اور شہرت کے سبب ان کے اہم کارنامے 'سخن دان فارس' کو ذرا کم شہرت اور توجہ ملی۔ حالانکہ 'سخن دان فارس' بھی اپنے موضوع پر ایک اہم اور کارآمد تصنیف ہے۔ جس طرح 'آب حیات' اردو زبان کی ابتدا اور تاریخ پر ایک اہم کتاب ہے، اسی طرح 'سخن دان فارس' فارس اور فارسی کے موضوع پر ایک

مبسوط کتاب ہے۔ جیسا کہ نام سے ظاہر ہے، اس تصنیف میں فارسی اور اس سے متعلق سخن دانوں کا تذکرہ ہے اور فارسی کے طلبہ آج بھی 'سخن دان فارس' کو مفید مطلب سمجھ کر اس کا مطالعہ کرتے ہیں۔

'سخن دان فارس' دو حصوں پر مشتمل ہے۔ حصہ اول میں عام مباحث جیسے فیلالوجیا یعنی لغات اور زبانوں کے فلسفی تحقیقات کے اصول، الفاظ جن سے زبان کا کام چلتا ہے، زبان کا جینا اور مرنا، سنسکرت کی زندگی، فارس کی قدیمی زبان، سنسکرت اور فارسی زبان کی فیلالوجیا، آغاز مقصد، اشکال حروف، فارسی اور سنسکرت کے متحد الاصل لفظوں میں کن اصول کے بموجب تبدیلیاں ہوئیں، حرکات، افعال، باب حروف اور حروف متفرقہ وغیرہ پر روشنی ڈالی گئی ہے۔

حصہ دوم 'سخن دان فارس' کا اہم اور خاص حصہ ہے۔ اس حصہ میں فارس اور فارسی سے تعلق گیارہ عنوانات کے تحت گیارہ لکچر اس طرح دیے گئے ہیں: فارس قدیم کی تاریخ، ملک فارس کی پرانی زبانوں کے حالات، زبان فارسی نے اسلام کے بعد کیا کیا رنگ بدلے، فارس کی زبان مروجہ میں دوسرا انقلاب، قدمائے فارس کے اصولی شرعی اور رسوم عرفی، اسلام کے بعد اہل ایران کے آداب و رسوم اور رہنے سہنے کے طریق، ہر ایک سرزمین اور اس کے موسموں کی بہار انشا پردازی پر کیا اثر کرتی ہے، زبان فارسی کا انداز اور زبانوں کے انداز سے کیا نسبت رکھتا ہے، زبان عربی سے مل کر زبان فارسی نے کیا کیا رنگ بدلے، فارسی پر ہندوستان میں آ کر کیا کیا رنگ چڑھے اور نظم فارسی کی تاریخ پر مفصل گفتگو کی گئی ہے۔

آزاد کا ایک بڑا کارنامہ اردو میں تمثیل نگاری کی روایت کو فروغ دینا ہے۔ گو کہ اردو میں تمثیل نگاری پہلے سے ہو رہی تھی لیکن آزاد نے اپنی تمثیلوں سے اس صنف کو کافی جلا بخشی۔ آزاد کی انشا پردازی اور زبان پر قدرت نے اس صنف میں انہیں کامیابی سے ہمکنار کیا۔ کسی بھی بے جان، بے روح اور کبھی کبھی تصوراتی اور خیالی چیز پر وہ کچھ اس طرح تمثیل کا پیراہن ڈالتے ہیں کہ وہ ہمارے سامنے چلتی پھرتی متشکل اور متحرک نظر آنے لگتی ہے اور جو چیز اپنی اصل میں خشک، بے مزہ، بے روح اور ادق نظر آتی تھی وہ بھی پر لطف اور قابل مطالعہ ہو جاتی ہے۔ نیرنگ خیال (1883ء) آزاد کی تمثیل نگاری پر ید طولیٰ کا ثبوت ہے۔

آب حیات کی 125 ویں سالگرہ پر ہم بطور خراج عقیدت ایک مختصر گوشہ پیش کر رہے ہیں۔

('آجکل' دسمبر 2006)

نوبل انعامات 2006

2006 کے نوبل انعامات کا اعلان کر دیا گیا ہے۔ امسال ادب کا نوبل انعام ترکی کے ارہان پامک کو دیا گیا ہے۔ ہر سال کی طرح اس سال بھی یہ انعام تنازع سے خالی نہیں رہا۔ نوبل انعامات کی تاریخ میں پہلی بار یہ انعام ترکی جیسی محدود زبان کے لیے ارہان پامک کو دیا گیا ہے۔ سویڈش اکادمی نے اپنے توصیف نامے میں پامک کے بارے میں کہا ہے: ''وہ تخلیق کار جس نے اپنے آبائی شہر (استنبول) کی جڑوں کی تلاش میں تہذیبوں کے میل ملاپ اور آپسی تصادم کے نئے محاورے اور بالکل نئے استعاروں کو خلق کیا ہے۔''

ہر سال کی طرح اس سال بھی اس انعام کے اعلان کے ساتھ ہی چہ می گوئیاں شروع ہو گئیں اور انعام دیے جانے کے پس پردہ ذہنیت اور سیاست پر دبی اور کھلی زبان میں گفتگو ہونے لگی۔ ایسا کہا جا رہا ہے کہ ادب کا نوبل انعام کا پیمانہ ادیب ہو گیا ہے۔ اب یہ بڑی تخلیق کی بنیاد پر نہیں بلکہ ادیب کی سیاسی سرگرمی کی بنیاد پر دیا جاتا ہے۔ دنیا کے سب سے بڑے انعام پر اس طرح کی گفتگو فطری بھی ہے لیکن وہیں وہ رقابت، حسد اور سیاست کو بھی ظاہر کرتا ہے۔ یہ لگاتار تیسرا سال ہے جب کسی ایسے ادیب کو نوازا گیا ہے جس نے اپنے ہی ملک یا حکومت کے خلاف آواز اٹھائی ہے۔ اس سے پہلے برطانیہ کے ہیرالڈ پنٹر کو اس انعام سے نوازا گیا تھا بلکہ عراق جنگ کے لیے بش اور بلیئر کو مجرم ٹھہراتے ہوئے ان پر مقدمہ چلانے کا پرزور مطالبہ بھی کیا تھا۔ واضح ہو کہ پنٹر نے یہ بات انعامی تقریب میں تقریر کرتے ہوئے بھی کہی تھی۔ اس سے پہلے بھی اس کی مثالیں موجود ہیں۔ یہ بات یقیناً قابل تعریف ہے۔ لیکن کبھی کبھی پس پردہ چل رہی سیاست جھلک ہی جاتی ہے۔ مثال کے طور پر پانچ چھ سال پہلے ادب کا نوبل انعام ہند نژاد وی ایس نائپال کو دیا گیا تھا۔

جس نے کھلے عام ہندوستان کو پیشاب خانہ سے تعبیر کیا تھا اور گاندھی جی کا کھلے لفظوں میں مضحکہ اڑایا تھا۔ یہ اور بات ہے کہ اس نے خود کو بھی ایک مکروہ صورت انسان قرار دیا تھا۔

1988 میں جب مصر کے نجیب محفوظ کو نوبل انعام ملا تو عام تاثر یہی رہا کہ یہ تیسری دنیا کے کسی ادیب کو اس انعام سے اس لیے نوازا گیا تاکہ نوبل کمیٹی کی غیر جانبداری پر کوئی شک وشبہ کی گنجائش باقی نہ رہے جب کہ ایک طبقہ اس وقت نجیب محفوظ کو موقع پرست گردانتا تھا۔

نوبل انعام کے تنازعات سے جڑی ایسی باتیں یقیناً دلچسپ ہیں۔ ارہان پامک بھی ایک خاص مذہب کے خلاف لکھنے کے سبب سرخیوں میں آگئے اور یہ بات اب ڈھکی چھپی نہیں کہ 1986 میں ایران کے آیت اللہ خمینی نے سلمان رشدی کی دریدہ دہنی کے خلاف اس کے قتل کا جب فتویٰ جاری کیا تب یہ ارہان پامک ہی تھے جنہوں نے اس فتویٰ کی کھل کر مخالفت کی تھی۔

بہرحال سردست ہمارا یہ موضوع نہیں کہ ہم نوبل انعام کے پیچھے پنپ رہی سیاست پر گفتگو کریں۔ یہاں ہم صرف اس بات کی طرف اشارہ کرنا ضروری سمجھتے ہیں کہ یہ ترکی جیسی چھوٹی زبان کو ملنے والا دنیا کا سب سے بڑا اعزاز ہے۔ انعام کے اعلان کے بعد پامک نے ان الفاظ میں اپنی خوشی کا اظہار کیا: ''یہ بہت بڑا اعزاز ہے اور مجھے اس کی بہت خوشی ہے۔ مجھے لگتا ہے کہ سب سے پہلے تو یہ ترکی زبان، ترکی تہذیب اور ترکی کا اعزاز ہے، ساتھ ہی یہ میری محنت کا اعتراف بھی ہے۔ یہ اعزاز ناول جیسی ایک اہم صنف کے تئیں میری ریاضت کا اعتراف بھی ہے۔'' ترکی زبان کو دنیا کا سب سے بڑا اعزاز ملنے کے بعد ہمارے دل میں ایک کسک سی ہوتی ہے کہ کاش اس انعام سے اردو ہندی جیسی زبانیں بھی نوازی جاتیں۔ اردو اور ہندی جو بلاشبہ ترکی زبان کے مقابلے کئی گنا بڑی ہیں بلکہ اب تو یہ 'عالمی زبانیں' بن چکی ہیں۔ ایسے میں یہ ہمارے لیے لمحۂ فکر یہ ہے کہ ہمارے پاس اس عالمی معیار کی کوئی تخلیق کیوں نہیں؟ یہاں ہمیں مرحوم کلیم الدین احمد کی یاد آتی ہے کہ انہیں اپنی تخلیقات کے عالمی معیار کی نہ ہو پانے کا ہمیشہ قلق رہا اور ان کو اس طرح کی باتوں کے لیے لعن طعن بھی سہنے پڑے۔ وہیں دوسری طرف ہمیں یہ بات بھی ذہن میں رکھنی چاہئے کہ ہمارے ادب میں شاید عالمی معیار کی اس سیاست کا عمل دخل نہیں ہو پایا ہے جو راتوں رات کسی ادب کو سرخیوں میں لا دیتا ہے۔ ارہان پامک کی یہ بات ہمارے لیے یقیناً مشعل

راہ ہے کہ ''اگر فن پاروں کو دبائے رکھنے کی کوششیں کی جائیں گی تو کچھ نہ کچھ ہمیشہ لوٹ کر آئے گا۔ جیسے کہ میں.....''

نوبل کمیٹی کا ایک بڑا انعام 'امن' کے لیے ہوتا ہے اور اس سال امن کا یہ انعام بنگلہ دیش کے محمد یونس اور ان کے گرامین بینک کو مشترکہ طور پر دیا گیا ہے۔ عام طور پر ہر سال کی طرح امسال بھی یہ انعام غیر متنازعہ رہا۔ البتہ اس بات پر حیرت کا اظہار کیا جانا فطری ہے کہ ایک ماہر معاشیات کو امن کا انعام کیوں کر دیا گیا۔ جب ہم اس کی گہرائی میں جاتے ہیں تو ہمیں یہ بات سمجھ میں آتی ہے کہ نوبل کمیٹی نے امن کا انعام ایک ماہر معاشیات کو دے کر بڑی دانشمندی کا ثبوت دیا ہے کہ امن اور اقتصادیات کا چولی دامن کا ساتھ ہوتا ہے۔ بنگلہ دیش جیسے کثیر آبادی والے غریب ملک جہاں غربت اور بھکمری ہے وہاں محمد یونس کا تن تنہا چھوٹے پیمانے پر قرض فراہم کرنے اور عورتوں کو اپنے پیروں پر کھڑے ہونے کی ہمت دینا کسی کرشمہ سے کم نہیں۔ محمد یونس کا گرامین بینک پوری دنیا کے لیے یقیناً ایک مثال ہے جس نے نہ جانے کتنے لوگوں کو نہ صرف غربت کی لعنت سے چھٹکارا دلایا بلکہ جینے کا حوصلہ بھی دیا، ساتھ ہی ایمانداری اور محنت کا درس دیا اور اس طرح جو لوگ اپنی غربت کی وجہ سے کسی خلفشار اور انتشار کا شکار ہو کر کسی بدنظمی کا ذمہ دار بن سکتے تھے وہ امن کے پیامبر بن کر سامنے آئے۔

محمد یونس کے گرامین بینک کی ایک سب سے بڑی خوبی اس کی بلاسودی بینک کاری ہے۔ اس انعام کے اعلان کے بعد دنیا نے یہ سن کر دانتوں تلے انگلی دبالی کہ یہ بینک بغیر کسی سود اور گارنٹی کے قرض فراہم کرتا ہے۔ یہ بات کتنی عجیب ہے کہ کسی غریب سے سود اور گارنٹی کا مطالبہ کیا جائے۔ جو اپنے نان شبینہ کے لیے محتاج رہتا ہے۔ ایسی صورت میں محمد یونس کا گرامین بینک دنیا کے سامنے یقیناً ایک ماڈل کی حیثیت رکھتا ہے۔ (جنوری 2007)

''دہلی کے مشہور داستان گو میر باقر علی صاحب جن کے دم سے داستان گوئی کے مٹتے ہوئے فن کا نام اس شہر میں باقی ہے.....ذیل کا مضمون ایک ظریفانہ کہانی کا جزو ہے جو ہماری درخواست پر انہوں نے قلم بند کیا ہے۔ اس میں بھولے بھٹکے مسافر کی حالت کا نقشہ کھینچا گیا ہے جو کسی معمولی سرائے میں برسات کے موسم میں جا پھنسا ہے۔'' (مخزن، مئی 1908)

اردو بستی کا خدا رخصت ہوا

گزشتہ سال جاتے جاتے کئی اور مقتدر اور نامور ادبا، وشعرا ہم سے چھین لے گیا۔ ایک دو ہوں تو ہم ان کا نام بنام غم منائیں۔ یہاں تو ایک لمبی فہرست ہے۔ کس کس کو روئیں۔ ویسے بھی جو دنیا میں آیا ہے اسے ایک دن مرنا بھی ہے، لیکن بعض شخصیات ایسی ہوتی ہیں جو دیر تک اپنی رخصت یا اپنے نہ ہونے کا احساس دلاتی رہتی ہیں۔ شوکت صدیقی ایک ایسی ہی شخصیت کا نام ہے۔ 18/دسمبر کو جیسے ہی ان کے انتقال کی خبر ملی، بے ساختہ زبان سے یہ جملہ نکلا 'اردو بستی کا خدا ہی رخصت ہو گیا' ہو سکتا ہے آپ اسے ہماری مبالغہ آرائی قرار دیں اور آپ اس میں بیشک حق بجانب بھی ہوں گے۔ لیکن اس بات سے انکار نہیں کر سکتے کہ شوکت صدیقی کے ناول 'خدا کی بستی' نے عالمی ادب میں اردو کو استحکام بخشنے کی ایک کامیاب سعی کی ہے۔ دیوان غالب، کلیات اقبال اور کلام میر کے بعد شاید شوکت صدیقی کے مشہور زمانہ ناول 'خدا کی بستی' کو ہی یہ اعزاز حاصل ہے، جس کے اب تک 46/ایڈیشن شائع ہو چکے ہیں اور جس کا دنیا کی 46/زبانوں میں ترجمہ شائع ہو چکا ہے۔ 'خدا کی بستی' اپنی چند فنی خامیوں کے باوجود فکری لحاظ سے ایک کامیاب ترین ناول ہے اور اردو ناول کی تاریخ میں ایک لینڈ مارک کی حیثیت رکھتا ہے۔

'خدا کی بستی' دراصل اپنے وقت کا نوحہ ہے لیکن اس نوحے میں زندگی کی رمق صاف دکھائی دیتی ہے: ''نوشا جیل میں تھا اور خان بہادر فرزند علی کے فرزند ارجمند غیر ممالک میں تعلیم حاصل کر رہے ہیں۔ اپنی اپنی قسمت۔ شہید وزارت الحاج خواجہ ناظم الدین نے اپنی وزارت عظمیٰ کے عہد میں یوم آزادی پر قوم سے خطاب کرتے ہوئے یہ بات کہی تھی۔ ان کے اور بھائی بند بھی یہی بات کرتے ہیں اور عوام کے غم میں آٹھ آٹھ آنسو روتے ہیں اور عوام نوشا، راجہ، شامی اور انو کو جنم دیتے ہیں۔ ان میں سے کوئی قتل کر کے جیل چلا جاتا ہے، کوئی کوڑھی بن کر ایڑیاں رگڑ رگڑ کر موت

کا انتظار کرتا ہے، کوئی خون تھوکتا ہے اور رکشہ چلاتا ہے۔ اور کوئی ہجڑوں کے ساتھ کولہے مٹکاتا ہے۔ نعرۂ تکبیر اللہ اکبر۔"

اس اقتباس میں اس ضخیم ناول کے تقریباً تمام اہم کردار نوشا، خان بہادر فرزند علی، راجہ، شامی اور انو موجود ہیں۔ ان کے علاوہ بھی بہت سے چھوٹے چھوٹے کردار ہیں جیسے جعفری، رخشندہ وغیرہ لیکن بنیادی طور پر یہی وہ کردار ہیں جن کے اردگرد اس طویل ناول کی کہانی گھومتی ہے۔ پلاٹ چست اور زبان عام بول چال کی ہے، عام طور پر جیسا کردار ویسی ہی اس کی زبان ہے اور یہی اس ناول کی خوبی ہے۔ اس ناول کی ایک بڑی خوبی ہر لمحے تجسس کو جگانے اور اس تجسس میں آگے بڑھتے جانے اور اسی طرح اب کیا؟ آگے کیا؟ جیسے ذہن میں ابھرنے والے سوالات ہیں جو ایک قاری کو باندھے رکھنے میں کامیاب ہیں۔

عام طور پر 'خدا کی بستی' کو پاکستانی معاشرے کا نوحہ یا رزمیہ کہا گیا ہے لیکن میرا خیال ہے کہ یہ پورے برصغیر کا آئینہ ہے، یہ بھی سچ ہے کہ اس ناول کے لکھنے کی شروعات شوکت صدیقی نے لکھنؤ میں کی تھی لیکن اس کی تکمیل پاکستان میں ہوئی۔ سچی بات تو یہ ہے کہ یہ ہندو پاک کے معاشرے کا المیہ ہے۔

بات جب لکھنؤ کی آ ہی گئی ہے تو ایک نظر شوکت صدیقی کے کوائف پر بھی ڈالتے چلیں۔ شوکت صدیقی لکھنؤ میں ہی 20 / مارچ 1923ء کو پیدا ہوئے۔ 1946ء میں سیاسیات میں ایم اے کرنے کے بعد 1950ء میں پاکستان ہجرت کر گئے، وہیں 1952ء میں ثریا بیگم سے ان کی شادی ہوئی۔ گو کہ لکھنے پڑھنے کی بنیاد اور اپنے کیریئر کا شاندار آغاز انہوں نے لکھنؤ میں ہی کر دیا تھا، انہوں نے 1944ء میں ماہنامہ 'ترکش' بھی نکالا تھا۔ لیکن پاکستان جا کر انہوں نے اپنی تحریر اور اپنی صلاحیت کا بھرپور مظاہرہ کیا۔ شوکت صدیقی اردو کے صفحۂ اول کے افسانہ نگار اور ناول نگار ہی نہیں ایک ممتاز صحافی بھی تھے۔ وہ روزنامہ 'مساوات' کے بانی، مدیر اور روزنامہ 'انجام' کے مدیر اعلیٰ رہے۔

شوکت کی تصانیف میں ان کے متعدد افسانوی مجموعے اور ناول شامل ہیں۔ 1952ء میں تیسرا آدمی (افسانوی مجموعہ)، 1955ء میں اندھیرا اور اندھیرا (افسانوی مجموعہ) 1958ء میں خدا کی

بستی (ناول)، 1988ء میں جانگلوس (داستانی سلسلہ) اور 1990ء میں چار دیواری شائع ہوئی۔ ان کا ناول جانگلوس ایک معنی میں ایک طویل الف لیلوی سلسلہ تھا جس کی اب تک غالباً تین ضخیم حصے شائع ہو چکے ہیں۔ اگر شوکت صدیقی کی زندگی کچھ اور وفا کرتی اور جانگلوس اپنے منطقی اختتام کو پہنچتا تو یہ اپنی نوعیت کا ایک اہم کارنامہ شمار ہوتا۔ وہ کارنامہ جو قرۃ العین حیدر کے کارنامہ 'کار جہاں دراز ہے' کے مدمقابل رکھنے کے قابل ہوتا تاہم موجودہ صورت میں بھی یہ ان کا ایک اہم کارنامہ ہے جو سنگ میل کی حیثیت رکھتا ہے۔ جانگلوس کی کہانی منٹگمری جیل کے مجرمین سے شروع ہوتی ہے۔ انہیں مجرمین کے واقعات و حادثات اور تجربات و مشاہدات پر مشتمل یہ ناول طویل سے طویل تر ہوتا جاتا ہے۔ جاگیردار سماج میں کس طرح بڑے زمین دار کسانوں اور مزدوروں کا استحصال اور جور و ظلم کرتے ہیں۔ ناول کے اہم اور مرکزی کردار لالی اور رحیم دادا پورے ناول کی کہانی سے نبرد آزما اور دست و گریباں نظر آتے ہیں۔ انہیں دو مرکزی کرداروں کے گرد ناول کا پلاٹ بنا گیا ہے اور انہیں دونوں کرداروں کے ذریعے شوکت صدیقی نے اپنا پیغام دینے کی کامیاب کوشش کی ہے۔

شوکت صدیقی بنیادی طور پر ناول نگار ہیں لیکن انہوں نے مختصر افسانوں میں بھی اپنے جوہر کا بھرپور مظاہرہ کیا ہے۔ ناانصافی ہوگی اگر شوکت صدیقی کے ایک خوبصورت ناولٹ 'کمیں گاہ' کا ذکر نہ کیا جائے۔ یہ ناولٹ پہلی بار 'وہ اور اس کا سایہ' کے عنوان سے 'سیپ' ناولٹ نمبر میں شائع ہوا، بعد میں یہی ناولٹ شاہکار کے ناولٹ نمبر میں 'کمیں گاہ' کے نام سے شامل کیا گیا اور اسی نام سے ۱۹۶۹ء میں کتابی صورت میں طبع ہوا۔ مختصر کینوس کے اس ناول میں شوکت صدیقی نے بنیادی طور پر جہالت کے مسئلے کو پیش کیا ہے۔ اس کے کردار رام بلی، اللہ رکھی، ٹھاکر صاحب اور ان کے بھائی کی بیوہ بادی النظر میں مجہول کردار نظر آتے ہیں لیکن انہی کرداروں کے سہارے جہالت کے متعلق اپنے جذبات و خیالات پیش کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔ شوکت صدیقی کے فکر و فن پر اظہار خیال یہاں ہمارا مدعا نہیں اور نہ ہی اس مختصر تحریر میں شوکت کے فکر و فن کا احاطہ ممکن ہے۔ یہاں ہم صرف انہیں خراج عقیدت پیش کرتے ہوئے ان کی کاوشوں کو سلام کرتے ہیں اور تبرکاً پروفیسر محمد حسن اور کمال احمد صدیقی کے تاثراتی مضامین پیش کرتے ہیں۔ فکر و فن پر تفصیلی گفتگو پھر کبھی۔

(فروری 2007)

گاندھی کی بھرپائی

سال 2009 کے نوبل انعامات کا اعلان کیا جا چکا ہے۔ یہ انعامات اپنے اپنے میدان میں کارہائے نمایاں انجام دینے والوں کو دیے جاتے ہیں۔ اور امسال زیادہ تر انعامات اختلافات اور تنازع سے پاک وصاف رہے۔ ہاں کچھ ایک انعام پر حیرت کا اظہار ضرور کیا گیا۔ یوں تو یہ سبھی انعامات اہم ہیں لیکن ان میں سے تین بطور خاص ہمارے لیے توجہ کا مرکز ہیں۔ ادب ہمارا خاص موضوع ہے لہٰذا ادب کا انعام سب سے پہلے ہماری توجہ کھینچتا ہے۔ یہ انعام اس بار جرمن ادیبہ ہیرتا میولر کو دیا گیا ہے۔ جس کی تحریر محروموں، مجبوروں، بے کسوں اور ناداروں کو زبان عطا کرتی نظر آتی ہے۔ خلاف توقع اس بار اس انعام پر اختلاف رائے نظر نہیں آیا۔

کیمسٹری کے لیے اس بار مشترکہ طور پر تین سائنس دانوں کو اس انعام سے نوازا گیا ہے۔ امریکہ کے تھامس ای اسٹیٹز اور اسرائیل کی ادا نویوتھ کے ساتھ امریکہ میں مقیم ہندنژاد وینکٹ رمن رام کرشنن کو بھی اس انعام سے نوازا گیا ہے۔ تمل ناڈو میں 1952 میں پیدا ہوئے وینکٹ رمن کیمبرج یونیورسٹی میں کام کر رہے ہیں۔ ان کو یہ انعام پروٹین بنانے والے رائبوسومز کی تشکیل اور طریقہ کار کی تحقیق کے لیے مشترکہ طور پر دیا گیا ہے۔ نوبل کمیٹی نے اس انعام کا اعلان کرتے ہوئے بجا طور پر کہا ہے کہ ان سائنس دانوں نے ایکسرے، کرسٹلو گرافی نام کی تکنیک سے رائبوسومز بنانے والے ذرات کی حالت کا اندازہ کیا ہے۔ ان کی تحقیق اینٹی بائنگ دواؤں کے فروغ میں بے حد مفید ہے۔ واضح ہو کہ راما کرشنن نے سائنس کا اپنا سفر عالم طبعیات کے طور پر شروع کیا تھا۔ پھر وہ علم حیاتیات کی طرف مڑ گئے۔ جریدہ 'نیچر' کے 26 اگست 2000 کے شمارہ میں انہوں نے رائبوسومز کی تشکیل کا پہلی بار خلاصہ کیا اور اس طرح ان کا سفر کامیابی کی منزلیں طے کرتا ہوا

آگے کی طرف بڑھ رہا ہے۔ نوبل انعام یقینی طور پر ان کے اس سفر کی تھکان کو ہلکا کرنے میں معاون ثابت ہوگا۔ دوسری طرف یہ بھی حقیقت ہے کہ اس انعام کے ملنے پر وینکٹ رمن کو جس بڑی تعداد میں خطوط، ای میل اور فون کے ذریعہ مبارکبادیوں کے پیغامات مل رہے ہیں وہ ان کے قیمتی اوقات کو ضائع کرنے کا سبب بن رہے ہیں۔

ایسا نہیں ہے کہ سائنس کا یہ انعام پہلی بار کسی ہندوستانی سائنس داں کو ملا ہو۔ اس سے پہلے سائنس کے شعبہ میں 1930 میں چندر شیکھر وینکٹ رمن کو ان کی تاریخی تحقیق 'رمن ایفیکٹ' کے لیے فزکس کے نوبل انعام سے نوازا گیا۔ 1968 میں ہر گووند کھورانہ کی جینٹک کوڈ (D.N.A) اور پروٹین کی تعمیر میں اس کے رول کے راز کو اجاگر کرنے کے لیے میڈیسن کے شعبے میں نوبل انعام سے سرفراز کیا گیا۔ 1983 میں سی وی رمن کے بھتیجے سبرامنیم چندر شیکھر کو فزکس کا نوبل انعام ''ستاروں کی پیدائش اور اس کے ارتقا'' کے متعلق ان کی تحقیق کے لیے دیا گیا۔

نوبل انعامات میں سب سے اہم امن کا انعام مانا جاتا ہے اور اسی وجہ سے اس انعام پر لوگوں کی نظر ذرا تیز ہوتی ہے اور بہتوں کو اس میں تعصب، طرفداری اور سیاست کی کارفرمائی نظر آتی ہے۔ امسال بھی یہ انعام اس تنازعہ سے اچھوتا نہیں رہا۔ نوبل انعامات کے لیے انتخابی کمیٹی کو ہمیشہ اس بات کا پچھتاوا رہا ہے کہ وہ مہاتما گاندھی کو امن کا نوبل انعام نہیں دے سکی۔ یہ کمیٹی اپنی اس ہمالیائی غلطی کے لیے معافی بھی مانگ چکی ہے۔ لیکن اب پچھتائے کیا ہوت جب چڑیا چگ گئی کھیت! نوبل کمیٹی اپنی اس غلطی کی بھرپائی اس طرح کرنا چاہتی ہے کہ گاندھی کے نظریات اور خیالات کا تتبع اور پیروی کرنے والے شخص کا انتخاب کیا جائے۔ امریکہ کے صدر کا امن انعام کے لیے انتخاب شاید اسی جانب ایک قدم ہے۔ مہاتما گاندھی نے اپنی جدوجہد اور تمام تر لڑائیاں عدم تشدد کے ہتھیار سے لڑی تھیں اور اس میں جو کامیابی ملی وہ دنیا کے لیے ایک نظیر بن گئی۔ بعد میں حق کی لڑائی لڑنے والوں نے اس ہتھیار کو آزمایا بھی اور اس طرح انہوں نے گاندھی جی کو خراج تحسین بھی پیش کیا۔ امریکی صدر بارک اوبامہ بھی ایسے لوگوں میں شامل ہیں جنہوں نے گاندھی کو اپنا آئیڈیل اور ترغیب کا سرچشمہ مانا ہے، بلکہ اس کا برملا اظہار بھی کیا ہے۔ ایران، شمالی کوریا جیسے امریکہ کے کٹر مخالفین کو برائی کا محور کہنے کے بجائے ان سے ٹکراؤ دور کرنے اور گفت وشنید کو آگے

بڑھانے کے پیچھے ان کا یہی گاندھیائی ذہن کارفرما ہے۔ اوبامہ کی عالمی ڈپلومیسی کا خاص مرکز مسلم دنیا کی طرف ہاتھ بڑھانا رہا جو افغانستان اور عراق میں جنگ کے سبب لمبے عرصے سے امریکہ کو اپنا دشمن مانتے ہیں۔ واضح ہو کہ اوبامہ نے انتخاب کے دوران صدارتی تقریر میں جنگ کی حکمت عملی کی سخت نکتہ چینی کی تھی۔ مغربی ایشیا کے لیے خصوصی ایلچی کی تقرری کے بعد اوبامہ نے اسرائیل اور فلسطینی رہنماؤں کو گفتگو کی میز پر اکٹھا کیا۔ اقوام متحدہ کی جنرل اسمبلی میں حال ہی میں اوبامہ نے دنیا سے ایٹمی ہتھیاروں کی تخفیف کی وکالت کی۔ یوروپ کے لیے نئی دفاعی حکمت عملی سے انہیں جہاں اوروں سے تعریف ملی وہیں روس جیسے کٹر مخالف کی سراہنا بھی انہیں ملی۔

یہ ساری باتیں اپنی جگہ درست۔ لیکن اوبامہ کے امریکہ کے صدر کی حیثیت سے عہدہ سنبھالتے ہی جس طرح انعام کا اعلان کیا گیا وہ بلاشبہ لوگوں کو حیرت اور شک وشبہ میں ڈالنے والا اور جلد بازی میں اٹھایا گیا قدم لگتا ہے۔ خود اوبامہ نے انعام کے ملنے کے بعد حیرت کا اظہار کرتے ہوئے کہا کہ ''میں نوبل امن انعام کے لیے اپنے انتخاب پر حیرت زدہ ہوں، مجھے اس بات میں شبہ ہے کہ کیا میں اس اعزاز کا حقدار ہوں۔ ایٹمی ہتھیاروں کو ہٹانے جیسے کچھ چیلنج ہمارے سامنے ہیں، ہوسکتا ہے کہ میری حیات میں ان سے نپٹا نہیں جاسکے گا لیکن میں جانتا ہوں کہ اس سے نپٹا جاسکتا ہے۔ اگر اس کی شناخت کرلی جائے کہ اسے ایک شخص یا ایک ملک اکیلے اپنے بل پر حاصل نہیں کرسکتا۔''

ہم وینکٹ رمن رام کرشنن، ہیرتا میولر، بارک اوبامہ اور دوسرے نوبل انعام یافتگان کو اس امید کے ساتھ مبارکباد پیش کرتے ہیں کہ ان کا ہر قدم انسانیت کی بھلائی اور خدمت کے لیے ہوگا۔

(دسمبر 2009)

''.....زمانہ کو جاری ہوئے صرف تین چار مہینے ہوئے ہیں۔ مگر اس وقت اس کی اشاعت ایک ہزار تک پہنچ گئی ہے اور کامل امید ہے کہ آئندہ جنوری تک غالباً تین چار ہزار تک پہنچ جائے گی۔ یہ زمانہ کے دلچسپ ہونے کا بدیہی ثبوت ہے.....''

(زمانہ، مئی 1903)

جمہوریت وہ طرز حکومت ہے...

26 جنوری 1950 ہندوستان کی تاریخ کا وہ متبرک دن ہے جب یہاں جمہوری نظام کا آئین نافذ ہوا۔اس آئین کی رو سے اس ملک کی سیاسی عمارت کو جمہوریت اور سیکولرازم کے دو مضبوط ستون مل گئے۔چونکہ ہمارا ملک ایک کثیر المذاہب، کثیر اللسان اور مختلف رنگ ونسل کے لوگوں پر مشتمل ہے۔چنانچہ یہاں ایک ایسے آئین اور دستور کی ضرورت محسوس کی جارہی تھی، جس میں ان تمام امور کو اچھی طرح اپنے اندر سمو لینے کی صلاحیت موجود ہو۔بہ ایں سبب آزادی کے بہت پہلے سے ہی جب آزادی کی صبح نو طلوع ہونے کے آثار ہویدا ہونے لگے تھے۔تبھی سے عمائدین قوم نے اس ملک کی تعمیر وترقی اور صحیح سمت میں اس کو گامزن کرنے کے خواب دیکھنے شروع کر دیے تھے۔گاندھی، نہرو، آزاد اور دوسرے تمام بڑے سیاسی رہنماؤں نے بہت پہلے سے یہ محسوس کرنا بلکہ اس کا برملا اظہار کرنا شروع کر دیا تھا کہ ہندوستان کا آئین وفاقی ہوگا اور عوامی جمہوریت اس کی اساس ہوگی۔

یہ اور بات ہے کہ اسی وقت کچھ لوگ اس کی تنقید اور اس کی خرابیوں کو اجاگر کرنے سے بھی باز نہیں آئے۔علامہ اقبال جیسی عبقری شخصیت نے اس کی علتوں کی طرف اشارہ کرتے ہوئے یہ کہا تھا:

جمہوریت وہ طرز حکومت ہے کہ جس میں
بندوں کو گنا کرتے ہیں تولا نہیں کرتے

شاعر کی بات اپنی جگہ بالکل درست کیونکہ وہ مغرب میں جمہوریت کے ساتھ کھلواڑ دیکھ چکے تھے۔لیکن اس بات سے انکار نہیں کیا جاسکتا کہ انسانوں کے بنائے ہوئے تمام نظام ہائے زندگی میں اگر کچھ خوبیاں ہیں تو کچھ خامیاں بھی ہیں اور اس حقیقت کی نفی نہیں کی جاسکتی کہ ہندوستان جیسے

ملک کے لیے جمہوری طرز ہی بہترین اور قابل قبول ہے۔ چنانچہ اقبال نے یہ بھی کہا:

سلطانی جمہور کا آتا ہے زمانہ
جو نقش کہن تم کو نظر آئے مٹادو

اس وقت دنیا کے بہت سارے ممالک میں جمہوریت نافذ ہے لیکن بیشتر ممالک میں اقتدار کی تمام تر قوت وطاقت کسی ایک شخص کے ہاتھوں میں مرکوز ہے۔ ہمارے ملک ہندوستان کی جمہوریت کی خاص بات یہ ہے کہ یہ قدیم وجدید کا سنگم ہے اور طاقت کا مرکز ومحور کبھی بھی کوئی ایک فرد نہیں ہوسکتا۔ آئینی طور پر صدر جمہوریہ ملک کا سربراہ ہے لیکن نظم ونسق اور عنان حکومت وزرار کی کابینہ کے پاس ہوتی ہے جو آئین کی رو سے فیصلے لیتی ہے اور نظم ونسق چلاتی ہے۔ بلاشبہ اس میں صدر جمہوریہ کی مرضی شامل ہوتی ہے۔ ہمارا ملک محض ایک جمہوری ملک نہیں بلکہ ایک عوامی جمہوریہ ہے۔ جمہوریت اور عوامی جمہوریہ میں ایک باریک سا فرق ہے۔ لیکن اسے واضح طور پر دیکھا جاسکتا ہے۔ ہماری جمہوریت ابراہم لنکن کی تعریف کے مطابق ایک ایسی جمہوریت ہے جو عوامی ہے، عوام کے ذریعے ہے اور عوام کے لیے ہے یعنی ایک ایسی جمہوری حکومت جس میں ہر لمحہ یا ہر موڑ پر عوام کو فوقیت حاصل ہے۔ بہر حال یہ سیاسیات کا ایک وسیع موضوع ہے اور اس پر ایک لمبی گفتگو ہوسکتی ہے۔ ہم یہاں صرف یہی کہہ سکتے ہیں:

ان کا جو کام ہے وہ اہل سیاست جانیں
میرا پیغام محبت ہے جہاں تک پہنچے

جی ہاں! ایک ادیب اور سچے ادب کا مقصد امن اور محبت کی تشہیر وتبلیغ اور نشر واشاعت ہے۔ سچا اور کھرا ادب وہی ہوسکتا ہے جو عوامی ہو۔ دیکھا جائے تو ہمارا سارا ادب ہی جمہوری ہے یا اگر نہیں ہے تو ہونا چاہئے۔ اس کے علاوہ جو کچھ ہے وہ محض مجذوب کی بڑ یا ذاتی انا کی تسکین کا سامان ہے۔ تو ثابت یہ ہوا کہ شعر وادب کا تعلق براہ راست عوام سے ہوتا ہے اور یہ جمہوری اقدار کا حامل ہوتا ہے۔

اردو ادب بھی جمہوری اور عوامی اقدار و مزاج سے عاری نہیں۔ ہمارے ملک کی ساٹھ سالہ جمہوری تاریخ کے بہت قبل سے ہی اردو ادب میں جمہوریت کے نقوش واضح طور پر دیکھے جاسکتے ہیں۔ اردو خواہ زبان کی سطح پر ہو یا ادب کی سطح پر اس کا تو خمیر ہی جمہوریت سے اٹھا ہے۔ چنانچہ آج

بہت سارے حاسدین اور منکرین اردو کی ناپاک کوششوں کے باوجود اس کی خوشبو چاروں طرف پھیل رہی ہے۔ جس سے یہ حاسدین اور منکرین بھی مستفید ہوتے رہتے ہیں۔

زیرنظر شمارہ ہندوستان کی ساٹھ سالہ جمہوریت کے نام وقف ہے، جس میں جمہوریت کی لغوی اور سیاسی تفہیم وتعبیر کے ساتھ ساتھ ادبی اور ثقافتی معنویت اور اہمیت کو اجاگر کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔

شمارہ میں شامل بھی مضامین جمہوریت اور ادب کا احاطہ کرتے ہیں۔ پہلے مضمون میں انور پاشا نے جمہوری اقدار پر بھرپور روشنی ڈالتے ہوئے اسے ادب، خاص طور پر اردو ادب سے جوڑ کر دیکھا ہے۔ تنقید کا مزاج عام طور پر محض نکتہ چینی یا تعریف وتوصیف مان لیا گیا ہے جب کہ اسے ہر حال میں جمہوری اور عوامی ہونا چاہئے۔ علی احمد فاطمی نے اردو تنقید کے جمہوری مزاج پر بھرپور روشنی ڈالی ہے۔ اردو شاعری کا مزاج ہمیشہ سے عوامی اور جمہوری رہا ہے اور یہی وہ شاعری ہے جو زندگی کے ہر موڑ پر ہر لمحے عوام کی نمائندگی کا بیڑہ اٹھائے نظر آتی ہے۔ غلامی کے خلاف آواز بلند کرنے یا فرقہ پرستی اور ظلم وجبر کے خلاف سینہ سپر ہونے کا موقع ہو یہ ہر جگہ مستعد نظر آتی ہے۔ جمہوریت تو اس کے رگ وریشہ میں سرایت ہے۔ منظر اعجاز نے اردو شاعری کے اسی جمہوری مزاج پر گفتگو کی ہے۔ اردو ڈرامے بھی کسی دوسری اصناف سے پیچھے نہیں۔ خاص طور پر نکڑ ناٹک تو خالص عوامی اور جمہوری نظر آتا ہے۔ ظہیر انور نے اردو ڈرامے کے جمہوری کردار کی بھرپور نشاندہی کی ہے۔ صحافت کو جمہوریت کا چوتھا ستون مانا جاتا ہے اور یہ ستون جتنا مضبوط ہوگا جمہوریت کی عمارت اتنی ہی مستحکم ہوگی۔ سہیل انجم نے جمہوریت کے اس چوتھے ستون پر بھرپور روشنی ڈالی ہے۔ ادب میں جمہوریت کی معنویت پر ابوظہیر ربانی نے دلچسپ گفتگو کی ہے۔ جمہوریت کی برکتوں سے کس طرح مستفید ہوا جاسکتا ہے نند کشور وکرم نے اپنی کہانی 'تعبیر' میں رہنمائی کی ہے۔ آتنک واد جمہوریت کا سب سے بڑا دشمن ہے۔ یہ جمہوریت کی جڑوں کو کھوکھلا اور کمزور کر کے رکھ دیتا ہے۔ شہناز نبی نے اپنے ڈرامہ 'پہچان مجھے نادان' میں اس پہلو کو بخوبی اجاگر کیا ہے۔ اسد رضا نے 'گھر والی جمہوریت' پر ایک خوبصورت طنز ومزاح پیش کیا ہے۔ اس طرح زیرنظر شمارہ جمہوریت پر ایک بھرپور اور کارآمد شمارہ بنانے کی کوشش کی گئی ہے۔

(جنوری 2010)

میری وحشت، تری شہرت ہی سہی

غالب عالمی ادب کا ایک اہم نام ہے۔ بیشک عالمی سطح پر اردو کے چند اور ادیب بھی اپنا مقام رکھتے ہیں۔ لیکن جو پذیرائی غالب کو حاصل ہوئی وہ اپنی مثال آپ ہے۔ غالب محض عشق اور تصورِ عشق کا شاعر نہیں بلکہ اس کی شاعری میں گنجینۂ معنی کا طلسم پنہاں ہے۔ زندگی کا وہ کون سا شعبہ ہے جو غالب کے احاطۂ شاعری سے باہر ہو۔ زندگی کی چھوٹی سے چھوٹی اور بڑی سے بڑی فکر غالب کی شاعری میں موجود ہے۔ غالب کی شاعری کی یہی خصوصیت اسے عالمی ادب میں ایک نمایاں مقام عطا کرتی ہے۔

غالب پر اب تک سیکڑوں مضامین لکھے جا چکے ہیں جن میں غالب کی حیات و کائنات کے مختلف پہلوؤں کا جائزہ لیا جاتا رہا ہے۔ ایک عام ذہن سوچ سکتا ہے کہ اتنا کچھ لکھے جانے کے بعد اب شاید ان پر مزید کچھ لکھنے کی گنجائش باقی نہ ہو۔ چنانچہ بعض لوگوں کا یہ سوچنا حق بجانب ہے کہ غالب پر کچھ لکھنا جتنا مشکل ہے اتنا ہی آسان بھی ہے۔ یعنی کوئی مبتدی کچھ لکھنا چاہے تو غالب پر اتنا کچھ لکھا جا چکا ہے کہ ان کی مدد سے ایک مضمون تیار کر سکتا ہے۔ جو اسے مضمون نگار کی فہرست میں اپنا نام درج کرانے کے لیے کافی ہے۔ لیکن کسی مبتدی کا یہ کام برائے نام ہی ہوگا۔ اس سے ادب کے ذخیرے میں کوئی اضافہ نہیں ہوگا۔ بلکہ خس و خاشاک کے انبار میں بڑھوتری ہی ہوگی۔ ایسی صورت میں غالب کی شاعری کے تعلق سے کوئی نئی بات کہنا، کوئی نیا گوشہ نکالنا، کسی نئے نکتے کی جانب اشارہ کرنا واقعی کارِ دارد ہے۔ یہ محض غالب کی شاعری کی تہہ داری اور گنجینۂ معنی کا طلسم ہی ہے کہ روز کوئی نہ کوئی قدر دان غالب کی شاعری میں پوشیدہ معنی کو نشان زد کرتا ہے اور اس پر اپنے تاثرات کا اظہار کرتا ہے۔ غالب کی شاعری کا یہ فیضان ایسے لوگوں کو ماہر غالبیات اور ایک معتبر ادیب ہونے کا درجہ عطا کرتا ہے۔ غالب کی شاعری کا یہ فیضان محض لکھنے لکھانے یا

مضامین اور مقالات تک محدود نہیں بلکہ اس کی عطا دوسرے فنون لطیفہ کا بھی احاطہ کرتی ہے۔ مثلاً غالب کی شاعری کو غزل سنگر، فلم ساز اور ٹی وی سیریل بنانے والوں نے خوب خوب پیش کیا۔ اسے رقص کے پیرہن میں بھی پیش کیا گیا جسے شائقین نے غالب کی شاعری کی قرأت اور سماعت کی طرح ہی پسند کیا۔ اسی طرح شعر غالب کو پینٹنگ میں رنگ وروغن کی مدد سے پیش کرنے کی کامیاب کوشش کی گئی اور شائقین نے اسے بھی بے حد سراہا۔ غالب کو پتھروں اور سنگ ریزوں میں بھی کچھ اس طرح پیش کیا گیا کہ بے اختیار ''گیت گایا پتھروں نے'' ہونٹوں پر مچل اٹھتا ہے۔ غرض شاید ہی کوئی میدان ہو جہاں شعر غالب کی پہنچ نہ ہو۔

بات ہو رہی تھی عالمی ادب کی، غالب کو دنیا کی بہت ساری زبانوں میں پیش کیا گیا۔ لیکن عالمی ادب میں انگریزی زبان کو جو مقام اور مرتبہ حاصل ہے وہ دوسری زبان کو کم ہی حاصل ہے۔ آج انگریزی عالمی سطح پر حاوی ہے۔ ایسے میں اردو غالب کی شاعری کے توسط سے عالمی ادب میں اپنی پہچان تو ضرور بنائے ہوئے ہے۔ غالب اور کلام غالب ہندوستانی ادب کا بیش بہا سرمایہ ہے۔ جس کی جتنی عزت وتوقیر کی جائے کم ہے اور جس پر ہم جتنا فخر کریں وہ بھی کم ہے۔ غالب پر 'آجکل' میں سیکڑوں مضامین شائع ہو چکے ہیں۔ لیکن ایک بار پھر ہم ان پر چند نئے مضامین پیش کر رہے ہیں۔ یقیناً یہ غالب کی آفاقیت کی دلیل ہے۔

اس شمارہ میں پہلا مضمون پروفیسر ابوالکلام قاسمی کا شامل ہے۔ کلام غالب میں عشق اور تصور عشق پر اب تک بہتیرے مضامین لکھے جا چکے ہیں لیکن یہ مضمون جس انداز اور اسلوب میں لکھا گیا ہے اسے پڑھ کر ہم عش عش کر اٹھتے ہیں۔ پروفیسر قاسمی نے یقیناً ایک پرانے حوالے کو نیا جامہ دیا ہے۔

کم جانتے تھے ہم بھی غم عشق کو پر اب
دیکھا تو کم ہوئے پہ غم روزگار تھا

اسی شمارہ میں ڈاکٹر کوثر مظہری کا انتہائی عرق ریزی سے لکھا گیا مضمون 'شعر غالب کے انگریزی تراجم' شامل ہے۔ اس مضمون میں ڈاکٹر مظہری نے شعر غالب کے کچھ اہم انگریزی تراجم کا جائزہ لیا ہے۔ 'فن ترجمہ نگاری میں ادبی ترجمہ نگاری ذرا مشکل کام ہے۔ اس میں بھی شاعری کا ترجمہ تو مزید مشکل ہے۔' باوجود اس کے اگر غالب کی شاعری کے انگریزی تراجم کیے جا رہے ہیں اور کیے جاتے رہیں گے تو یقیناً یہ غالب کی شاعری کا اعجاز ہے۔ جس پر ایمان نہ لانا

یقیناً ادبی کفر ہے۔ ڈاکٹر مظہری کا یہ مضمون دلِ ناداں تجھے ہوا کیا ہے، سب کہاں کچھ لالہ وگل میں نمایاں ہو گئیں، عشرت قطرہ ہے دریا میں فنا ہو جانا، جب میکدہ چھٹا تو پھر اب کیا جگہ کی قید اور دہر جز جلوہ یکتائی معشوق نہیں، کے مختلف تراجم پر مبنی ہے۔ اس مضمون کو پڑھنے کے بعد شدت سے احساس ہوتا ہے کہ غالب کے ترجمے کا ایک عالمی تقابلی مطالعہ بھی کیا جانا چاہئے۔

آج فیضان غالب جاری وساری ایک چشمہ ہے۔ غالب کے نام پر طرح طرح کے فائدے اٹھانے والوں کی آج کمی نہیں، لیکن ستم ظریفی یہ ہے کہ غالب خود وظیفہ خوار تھے اور وظیفہ کو جاری کرانے کے لیے کلکتہ تک کا سفر کیا۔ اہل ذوق کو اس کی روداد معلوم ہے، یہاں اس کا ذکر مقصود نہیں۔ 'غالب اور اہل بنگالہ' ابوذر ہاشمی کا مضمون ہے۔ اس موضوع پر پہلے بھی بہت کچھ لکھا جا چکا ہے۔ لیکن ابوذر ہاشمی نے لسانی اور نظریاتی آویزش کے پس منظر میں اپنے مقالے کو پیش کر کے اسے ایک نیا روپ دیا ہے۔ غالب نے عرصہ پہلے کہا تھا:

کلکتہ کا جو ذکر کیا تو نے ہم نشیں
اک تیر میرے سینے میں مارا کہ ہائے ہائے

غالب کی یہ ہائے ہائے اتنی پراثر اور جان لیوا ہے کہ اب تک ان کے مداح اس پر واہ واہ کیے بغیر نہیں رہتے۔ محمد مستقیم نے عام روش سے ذراہٹ کر اپنا مضمون 'شیلی اور غالب میں پرومیتھو کا کردار' قلم بند کیا ہے۔ ایک طرف اس میں شیلی اور غالب کا تقابلی مطالعہ ہے تو دوسری طرف غالب کی ایک غزل: حیراں ہوں دل کو روؤں کہ پیٹوں جگر کو میں، کی سائنسی توضیح وتشریح بھی ہے۔ جس کے پردے میں حیدر علی حکمران میسور بھی نظر آتے ہیں، حیدر علی آرٹیلری کور کے ہندوستان میں بانی اور میزائل کے موجد بھی ہیں۔ ٹیپو سلطان نے ان کے اس مشن کو آگے بڑھایا۔ مذکورہ غزل جسے محمد مستقیم نے بجا طور پر نظم کہا ہے (اور جسے سن کر یقیناً کلیم الدین احمد پھڑک اٹھتے) کی نادر ونایاب توضیح وتشریح ہے جو ہمیں بلاشبہ محظوظ کرتے ہیں۔

غالب کی ایک معرکۃ الآرا غزل 'عشق مجھ کو نہیں وحشت ہی سہی' پر وجد کی کیفیت میں لکھا گیا مرزا عبدالباقی بیگ کا مضمون بلاشبہ ہمیں بھی جذب ووجد کی کیفیت سے دوچار کرتا ہے اور ہم بے ساختہ پکار اٹھتے ہیں: میری وحشت، تری شہرت ہی سہی۔

(فروری 2010)

عورت ہونے کی مجبوری

ہر سال 8 مارچ کو عالمی سطح پر اشرف المخلوقات حضرت انسان کی نصف بہتر یعنی عورت کے لیے یوم خواتین منانے کا چلن عام ہوا ہے۔ یہ دن عالمی سطح پر عورتوں کی معاشی، سیاسی، سماجی اور دوسری حصولیابیوں کے جشن کے طور پر منایا جاتا ہے۔ مرد اساس معاشرہ میں شاید اس کی ضرورت شدت سے محسوس کی جاتی رہی ہو، لیکن آج بڑی حد تک خواتین اپنے عزم اور حوصلہ کی بدولت اپنا ایک مقام حاصل کر چکی ہیں اور اب یہ صرف جشن منانے اور تقریب برپا کرنے کے مترادف ہے۔ آج صورت حال بہت حد تک بدلی ہے اور تیزی سے یہ اپنی سمت و رفتار کے ساتھ آگے کی طرف گامزن ہے۔ کہا جاتا ہے کہ عورت اور مرد زندگی کی گاڑی کے دو پہیے ہیں لیکن آج بھی صورت حال کی اس بہتری کے باوجود گاڑی کے دونوں پہیے برابر نہیں ہیں، چنانچہ زندگی کا سفر جس تیز رفتاری کے ساتھ طے ہونا چاہئے وہ اس نابرابری کے سبب نہیں ہو پا رہا ہے۔ بوجوہ یوں بھی عورتوں کا معاملہ ذرا پیچیدہ ہے:

لڑکیوں کے دکھ عجب ہوتے ہیں سکھ اس سے عجیب
ہنس رہی ہیں اور کاجل بھیگتا ہے ساتھ ساتھ

بہرحال یوم خواتین کی غرض و غایت ایک آزاد، بامقصد، باصلاحیت، پرعزم اور باشعور انسانی وجود ہونے کی حیثیت سے عورتوں کو زندگی کے ہر شعبے میں ان کا جائز مقام دلانے سے مخصوص ہے۔ لیکن حقیقت یہ ہے کہ یہ دن بھی بہت سارے دنوں کی طرح آمدن، نشستن، گفتن، خوردن اور برخاستن کے مصداق ہو کر رہ گیا ہے۔ اور اس کا خاطر خواہ اثر یا فائدہ نظر نہیں آتا۔ تاہم اس کے باوجود ایک دکھاوا، نمائش اور شور شرابا کے بیچ یہ دن اپنا پیغام کسی نہ کسی حد تک چھوڑنے میں کامیاب تو

ہو ہی جاتا ہے۔ اگر یہ دن لاکھوں کروڑوں اَن پڑھ عورتوں کو ان کے حقوق، ان کے اپنے وجود، ان کے اپنے سماجی سروکار کے تئیں تھوڑی سی بھی بیداری لاتا ہے تو بھی یہ اس کی کامیابی ہے۔

عورت روز اول سے انسانی وجود کا مبدا، منبع اور سرچشمہ رہی ہے۔ اس سرچشمے کو یوں بھی رواں دواں رہنا چاہئے تھا لیکن پتا نہیں کس لمحے یا کس آن یہ حادثہ پیش آیا جب عورتوں کو ایک حقیر شے سمجھ لیا گیا یا مرد سماج کے ذریعہ ناتواں بنا دیا گیا۔ اور یہ خباثت برسوں اور صدیوں تک مردوں کے دل و دماغ میں کسی ناگن کی طرح پھن کاڑھے بیٹھی رہی۔ چنانچہ عورتوں کو صدیوں سے دوسرے درجے بلکہ اسفل ترین درجے کی مخلوق کے طور پر دیکھا جاتا رہا ہے۔ چنانچہ ان کے ساتھ ویسا ہی رویہ بھی روا رکھا گیا۔

بہر حال آج صورت حال بدلی ہے، ماحول بڑی حد تک بہتری کی طرف گامزن ہے۔ خواتین اپنے حقوق کے تئیں بیدار ہو رہی ہیں۔ اپنا حق مانگنے بلکہ چھیننے اور اسے ہر صورت میں حاصل کرنے پر آمادہ ہیں۔ گویا آج عورت سراپا احتجاج بن چکی ہیں اور اس کا برملا اظہار بھی کرنے لگی ہیں، اس کے لیے مختلف ذرائع اور وسائل کا استعمال بھی کرنے لگی ہیں۔ آج زندگی کے ہر شعبے میں ان کی موجودگی واضح طور پر دیکھی جاسکتی ہے۔ وہ دن گئے جب عورت گھر کی کال کوٹھری میں قید کر کے رکھی جاتی تھی۔ آج عورت ستاروں پر کمندیں ڈال رہی ہے، خلاؤں میں پرواز کر رہی ہے اور یہ سلسلہ دراز سے دراز تر ہو رہا ہے۔ اب وہ سیاست، ایڈمنسٹریشن، مققنہ، عدلیہ، فوج، تجارت، صنعت، سائنس، تکنالوجی، میڈیا اور شعبۂ تعلیم غرض کہ ہر جگہ اپنی کامرانی کے جھنڈے گاڑ رہی ہے۔

شعر و ادب جو کسی بھی معاشرے کا آئینہ ہوتا ہے وہ بھی آج خواتین کی دسترس میں ہے بلکہ دیکھا جائے تو وہ یہاں بھی اب مردوں سے پیچھے نہیں۔ جہاں تک اردو ادب کا تعلق ہے وہ یہاں بھی برابر کی شریک نظر آتی ہیں۔ کسی زمانے میں اگر کوئی باذوق خاتون کچھ لکھنا پڑھنا بھی چاہتی تو یہاں بھی اس کے نام پر حجاب یا چلمن نظر آتا۔ خیر دھیرے دھیرے یہ بندش ختم ہوئی اور اب عورتیں اپنے نام سے، اپنے کام، اپنی سوچ اور اپنی فکر کا اظہار کرنے لگی ہیں۔ آج ہمارے سامنے خواتین ادبا اور شاعرات کی ایک لمبی فہرست ہے جن میں نذر سجاد حیدر، عصمت چغتائی، حاجرہ مسرور، خدیجہ مستور، بانو قدسیہ، ممتاز شیریں، جیلانی بانو، زاہدہ حنا اور پروین شاکر جیسی ہزاروں

خواتین قلم کار کے نام آفتاب و ماہتاب کی طرح جگمگا رہے ہیں۔

زیر نظر شمارہ میں تین مختلف زبانوں کی خواتین قلم کاروں پر مضامین شامل ہیں جنھوں نے ادب میں اپنا مقام بنایا ہے۔ پہلا مقالہ 'ایک ہزار ایک راتوں کے بعد' میں حقانی القاسمی نے فلسطینی فکشن کے تناظر میں عرب فیمنزم کو دیکھنے کی کامیاب سعی کی ہے۔ می زیادہ، سمیرا عزام اور سحر خلیفہ فلسطینی ادب اور فکشن کے معروف نام ہیں اور یہ بھی اپنی فیمنسٹ تحریروں اور نظریات کی وجہ سے پسندیدگی کی نظر سے دیکھی جاتی ہیں۔ وطن کا درد اور آئے دن انسانیت پر کیے جا رہے مظالم کے خلاف علم بغاوت کرنے کے سبب بھی وہ پہچانی جاتی ہیں۔ حقانی کا یہ جملہ یقیناً ہمیں متوجہ کرتا ہے کہ دنیا کی بیشتر عورتیں ایک ہی محاذ پر جنگ لڑ رہی ہیں، مگر فلسطین کی عورتیں کئی محاذوں پر برسرپیکار ہیں اور یہی چیز عرب فیمنزم کو زیادہ وسیع اور بامعنی بناتی ہے۔

ستیہ پال آنند نے 'بلبل ہند سروجنی نائیڈو' پر شرح و بسط کے ساتھ مقالہ تحریر کیا ہے۔ عام طور پر سروجنی نائیڈو کو سیاست داں کے طور پر پہچانا جاتا ہے۔ لیکن ان کی ایک حیثیت اور یقیناً یہ ایک اہم اور مضبوط حیثیت ہے وہ ان کے شاعر کی حیثیت ہے۔ ستیہ پال آنند نے اپنے مضمون میں سروجنی نائیڈو کی انگریزی شاعری پر تفصیل سے لکھتے ہوئے انڈو اینگلین اصطلاح پر بھی گفتگو کی ہے۔ سروجنی نائیڈو کی شاعری کے مختلف زبانوں میں ترجمے بھی ہوئے ہیں۔ ستیہ پال آنند نے اس پر بھی کافی و شافی روشنی ڈالی ہے۔

پروین شاکر اردو ادب میں نسائی حسیت کی علامت کے طور پر دیکھی جاتی ہیں۔ وہ سراپا احتجاج ہیں اور اس احتجاج کے اظہار پر بھرپور قدرت بھی رکھتی ہیں۔ پروین شاکر کی اسی انفرادیت پر نور فاطمہ نے تفصیل سے گفتگو کی ہے۔ عورت کی ترقی خوش آئند! لیکن مرد سماج کا طعنہ آج بھی شگفتہ کلی کو کھلنے سے پہلے مرجھا جانے پر مجبور کرتا ہے۔ پروین شاکر کہتی ہیں: جب کہ صورت حال تو یہ ہے / میرا گھر / میرے عورت ہونے کی مجبوری کا / پورا لطف اُٹھاتا ہے / ہر صبح / میرے شانوں پر ذمہ داری کا بوجھا لیکن / پہلے سے بھاری ہوتا ہے / پھر بھی میری پشت پہ / نااہلی کا کوب / روز بہ روز نمایاں ہوتا جاتا ہے۔

(مارچ 2010)

لے سانس بھی آہستہ.....

مشاعرے کی تاریخ پرانی ہے اور یہ کہا جائے تو غلط نہ ہوگا کہ مشاعرے اردو زبان کی شناخت ہیں۔ شاید اردو زبان کی ابتدا سے ہی مشاعرے کسی نہ کسی شکل میں منعقد ہوتے رہے ہیں۔ یہ مشاعرے کسی زمانے میں باذوق حضرات کے لیے ادبی تسکین اور تفریح کا واحد ذریعہ ہوا کرتے تھے، جس کے لیے خاصا اہتمام بھی کیا جاتا تھا۔ یعنی جو شعرا مشاعرے میں پڑھنے کے لیے مدعو ہوتے تھے وہ بھی، اور جو سننے کے لیے بلائے جاتے تھے وہ بھی، پوری تیاری کے ساتھ شریک ہوتے تھے اور جب مشاعرہ شروع ہوتا اور کسی شاعر کے سامنے شمع مشاعرہ لائی جاتی تھی تو وہ ہمہ تن ادب و ہوش اور سامعین ہمہ تن گوش ہوتے تھے۔ ایسے میں کسی شاعر کو خاموشی سے سن لینا ہی اس کی کامیابی سمجھی جاتی تھی۔ اور اگر اسے داد بھی مل جائے تو یہ اس کے لیے بڑا اعزاز ہوتا تھا۔ اس زمانے میں نہ تو کوئی شاعر داد کی بھیک مانگتا تھا اور نہ ہی بلاوجہ کسی شاعر کو داد سے نوازا جاتا تھا۔

مشاعرے کی تاریخ بڑی شاندار رہی ہے۔ یہ ذہنی تربیت اور تہذیب کا قابل احترام ادارہ رہا ہے۔ یہاں وہی لوگ شریک ہوتے تھے جنہیں ذہنی اور روحانی غذا کی طلب ہوتی تھی۔ وقتی جذبات، سفلی احساسات اور واہیات وخرافات کے طالب سامعین یا تو اس زمانے میں ہوتے ہی نہ تھے یا انہیں ایسی محفلوں میں جانے کی ہمت ہی نہیں ہوتی تھی۔ بہ الفاظ دیگر ایسے حضرات کا ان محفلوں میں استقبال ہی نہ ہوتا تھا۔ یہ بات شریک شعرا بھی جانتے تھے اور سامعین بھی اور دونوں ہی کو ایک دوسرے کا پاس ولحاظ ہوتا تھا۔

واقعہ مشہور ہے کہ پھٹے حال میر لکھنؤ کے کسی مشاعرے میں پہنچ گئے ان کی وضع قطع اور شکل وصورت دیکھ کر لوگ اشاروں اشاروں میں ہی ان پر طنز کرنے لگے۔ دلّی کی بربادی کے شکار میر خاموش اپنی باری کا انتظار کرتے رہے اور جب ان کی باری آئی تو میر نے ان الفاظ میں اپنا تعارف پیش کیا:

کیا بودو باش پوچھو ہو پورب کے ساکنو!
ہم کو غریب جان کے ہنس ہنس پکار کے
دلی جو ایک شہر تھا عالم میں انتخاب
رہتے تھے منتخب ہی جہاں روزگار کے
جس کو فلک نے لوٹ کے ویران کردیا
ہم رہنے والے ہیں اسی اجڑے دیار کے

اتنا سننا تھا کہ لوگ ششدر اور حیران مؤدب ہو گئے۔ پھر کسی کی ہمت نہ ہوئی کہ چوں تک کرے۔ لوگ سمجھ چکے تھے کہ یہ تو حضرت میرؔ ہیں۔ اور پھر لوگ ہمہ تن گوش سنتے رہے۔ میر تقی میر کے لیے یہ کتنا بڑا اعزاز ہے کہ اس مشاعرے کا صرف یہی ایک شاعر آج یاد رہ گیا:

وہ آئے بزم میں اتنا تو میرؔ نے دیکھا
پھر اس کے بعد چراغوں میں روشنی نہ رہی

تاریخ اردو ادب شاہد ہے کہ اس زمانے میں میرؔ کے رہتے کسی اور شاعر کا چراغ جل نہ سکا۔ غالب کا دور اردو شاعری کا زریں دور مانا جاتا ہے۔ حالات چاہے جیسے بھی رہے ہوں لیکن ان مشاعروں میں شریک ہو کر شعرا اور سامعین اپنا غم غلط کرتے اور ذہنی انبساط حاصل کرتے۔ داد کی بھیک اس زمانے میں بھی نہیں مانگی جاتی تھی نہ ہی بلا وجہ داد کے ڈونگرے برسائے جاتے تھے اور جس شاعر کو مفتی صدرالدین آزردہ واہ! یا سبحان اللہ کہہ کے داد دے دیتے تو وہ پھولے نہ سماتا۔ اور اسے اپنی سب سے بڑی کامیابی گردانتا۔ مشاعرے ہر زمانے میں مقبول رہے ہیں۔ میرؔ اور غالبؔ کے زمانے میں بھی، اقبالؔ، جوشؔ اور فراقؔ کے زمانے میں بھی اور آج بھی۔ وقت اور حالات بدلے ہیں تو یقیناً موڈ اور مزاج بھی بدلا ہے۔ مشاعروں کا ماحول بھی بدلا ہے۔

آج سنیما، ٹی وی، ریڈیو، موبائل اور انٹرنیٹ جیسے تفریح کے وسائل مہیا ہیں اور ان تک ہر کسی کی رسائی بھی ہے۔ ایسے میں مشاعروں کا اپنا وجود برقرار رکھنا بڑی بات ہے اور یقیناً یہ آسان کام نہیں۔ لیکن اس کا یہ ہرگز مطلب نہیں ہونا چاہئے کہ ان مشاعروں کو سنیما اور ٹی وی سیریل کی طرح ہی بے لباس، بے حجاب اور عریاں کردیا جائے اور جواب میں سامعین اس قدر داد دیں کہ اس طوفان بدتمیزی میں چھت ہی اڑ جائے۔

مشاعرے آج بھی ہو رہے ہیں، شعر سنے اور سنائے جا رہے ہیں۔ یہ یقیناً اردو زبان اردو ادب خصوصاً اردو شاعری کی مقبولیت کی دلیل ہے۔ یہ بھی صحیح ہے کہ یہ مشاعرے اردو کی ترویج و اشاعت کا بہترین ذریعہ رہے ہیں۔ لیکن کیا آج بھی ایسا ہے؟ میرا خیال ہے کہ اس پر سوالیہ نشان لگا کر کچھ توقف کر کے ٹھنڈے دل ودماغ سے اس پر سوچنا چاہئے۔ آخر کیا وجہ ہے کہ آج ایک ایسا شاعر جو ایک شاعر سے زیادہ ایکٹر ہوتا ہے وہ زیادہ کامیاب ہوتا ہے۔ وہ اپنی ڈرامہ بازی کے سحر میں سامعین کو کچھ ایسا باندھتا ہے کہ سامع اچھے برے کی تمیز بھلا کر واہ واہ کی صدائیں بلند کرنے لگتا ہے۔ اسی طرح ایک شاعر ترنم کی پٹری پر اپنے سطحی اور معمولی اشعار کو کچھ ایسے دوڑاتا ہے کہ اگر اسے داد نہ دی گئی اور وہ ڈی ریل ہو گیا یعنی پٹری سے اتر گیا تو مشاعرے کا سارا مزہ ہی کرکرا ہو جائے گا۔ چنانچہ سامعین خواہ مخواہ اسے داد دیتے ہیں۔ اور وہ شاعریوں ہی ترنم کی پٹری پر اپنے اشعار کی ٹرین دوڑاتا رہتا ہے۔ ایسا شاعر، شاعر سے زیادہ گویا کہلانے کا مستحق ہے۔

وقت بدلا ہے، حالات بدلے ہیں، عورت آزاد اور روشن خیال ہو گئی ہے۔ چنانچہ آج شاعرات بھی مشاعروں میں بلائی جانے لگی ہیں۔ اب ان کی غزل چاہے کیسی بھی ہو سامعین کو اس سے کیا غرض، انہیں تو شاعرہ کی مترنم آواز، ان کے لٹکے جھٹکے ہی ان کے سفلی جذبات کی تسکین کا سامان مہیا کرنے کے لیے کافی ہیں۔ چنانچہ آج شاعرات کی ایک بڑی تعداد ایسی ہے جو نہ تو اردو جانتی ہے نہ اردو تہذیب سے انہیں واقفیت ہے اور نہ شائستگی انہیں چھو کر گزری ہے۔ حد تو یہ ہے کہ بہت سی شاعرات اپنی غزل دیوناگری ہندی میں لکھ کر لاتی ہیں اور بلند و بانگ دعوے کے ساتھ سناتی ہیں اور داد پاتی ہیں۔ یہ کرتب اب ہندی والوں کو بھی سحر انگیز کر رہا ہے۔ چنانچہ وہ چاہے اردو کی لاکھ 'کھلافت' کریں لیکن اب وہ بھی ہندی 'گجل' پیش کر کے کوی سمیلن کو مشاعرے میں بدلنے کی کوشش کرتے ہیں۔ ایسے میں اب ہم اردو والوں کی ذمہ داری بنتی ہے کہ مشاعروں کے معیار کو نہ صرف سدھاریں بلکہ حتی المقدور اس کا معیار بلند کر کے اسے نمونے کے طور پر پیش کریں۔ اسی میں مشاعرے کا لطف ہے اور یہی اردو زبان کے تحفظ کا ضامن بھی۔ لیکن یہ کام اتنا آسان بھی نہیں۔

لے سانس بھی آہستہ کہ نازک ہے بہت کام
آفاق کی اس کارگہہ شیشہ گری کا

(اپریل 2010)

تمھیں سو گئے داستاں کہتے کہتے

آئی جو ان کی یاد تو آتی چلی گئی
ہر نقش ماسوا کو مٹاتی چلی گئی

آج کچھ ایسی ہی شخصیات کی یاد بے طرح آ رہی ہے۔ ان میں سارے کے سارے چندے آفتاب چندے ماہتاب شخصیات ہیں۔ یا یوں کہیں کہ جو ذرہ جس جگہ ہے آفتاب ہے۔ ان میں اردو تعلیم و تدریس کے شعبے سے وابستہ استاد، اردو فکشن سے منسلک ادیب، ایوان شاعری اور ایوان سیاست کے کوچہ گرد اور دیگر شعبہ ہائے حیات سے منسلک شخصیات شامل ہیں۔ خواجہ احمد فاروقی کی شخصیت جتنی دلنواز تھی اتنی ہی پروفیسر گوپی چند نارنگ کی ان پر لکھی گئی تحریر دلفریب ہے۔ خواجہ احمد فاروقی کا نام آتے ہی ہماری آنکھوں کے سامنے ایک بے غرض، مخلص اور دردمند انسان کا چہرہ گھومنے لگتا ہے۔ بلاشبہ وہ شوق کا ایک دفتر اور اردو کی آرزومندی کا استعارہ تھے۔ ان کے دم سے دہلی میں اردو کا قافلہ رواں دواں رہا۔ وہ دہلی یونیورسٹی میں شعبہ اردو کے بنیاد گزار تھے۔ وہ شعبہ جو ایک مضبوط اور تناور درخت ثابت ہوا جس کی شاخیں مختلف جہتوں میں پھیلتی چلی گئیں اور ان میں سے بیشتر شاخیں ہری بھری اور ثمر آور نظر آئیں۔ نظم و ضبط اور اصول کے پابند خواجہ احمد فاروقی کی شخصیت جتنی کھلی کتاب تھی اتنی ہی پیچ در پیچ بھی کہی جاتی ہے۔ لیکن یہ عیب یا خوبی شاید ہر بڑی شخصیت کا خاصہ ہے۔ ڈاکٹر گوپی چند نارنگ نے خواجہ احمد فاروقی کی شخصیت کے نہاں خانوں میں جھانکتے ہوئے ان کی شخصیت کے مختلف پہلوؤں کا خوبصورت خاکہ کھینچا ہے۔ کچھ اس طرح کہ ان کی شخصیت ان کی وفات کے 15 سال بعد بھی چلتی پھرتی، ہنستی بولتی آپ سے ہم سے ہم کلام نظر آتی ہے۔

فی زمانہ اردو فکشن خاص طور پر اردو ناول بہت اچھے دور سے نہیں گزر رہا ہے۔ ایسے میں

اردو فکشن کی ایک اہم شخصیت کا ہمارے بیچ سے اٹھ جانا یقیناً نا قابل تلافی نقصان ہے۔ شفق جو عرف عام میں 'کانچ کا بازیگر' کے طور پر جانے جاتے تھے اور جن کا نام 1970-80 کے دہے میں انتہائی احترام سے لیا جاتا تھا اور جس نے اوائل عمری میں تیز رفتاری سے اپنا ادبی سفر طے کیا تھا۔ اردو والوں کی بے اعتنائی، آپسی آپادھاپی اور پنجے کے بل خود کو اونچا اٹھانے والوں کے رویوں سے ایسے دلبرداشتہ ہوئے کہ دھیرے دھیرے ایک طرح سے گوشہ نشینی ہی اختیار کر لی۔ 28 فروری کو ان کی موت کی خبر کچھ اس طرح آئی گویا وہ اردو والوں کے لیے غیر معروف اور غیر مطلوب شخصیت تھے۔ حالانکہ ایسا نہیں تھا۔ شفق کی شخصیت جتنی دلنواز تھی ان کی تحریر اتنی ہی دلچسپ بھی۔ وہ اپنے ناولوں اور افسانوں میں سماج کے اچھے سے اچھے اور برے سے برے پہلوؤں کو بڑی ہی خلاقی سے پیش کیا کرتے تھے۔ 'کانچ کے بازیگر' کی تحریر پڑھ کر عصمت چغتائی جیسی بے باک فکشن نگار ان کی تعریف کیے بغیر نہ رہ سکیں۔ ان کی وفات پر مشرف عالم ذوقی نے 'کبیر گنج والا کانچ کا بازیگر' اور سید احمد قادری نے 'افسانہ نگار شفق' لکھ کر ثابت کر دیا:

زمانہ بڑے شوق سے سن رہا تھا
تمہیں سو گئے داستاں کہتے کہتے

ہندوستان سے ہزاروں میل دور رہنے والے رالف رسل، جان گل کرائسٹ کے بعد شاید دوسرے انگریز تھے جنھوں نے اردو کی باضابطہ تسلسل اور تواتر کے ساتھ خدمت کی۔ رالف رسل نے خود کو اردو کے تئیں وقف کر رکھا تھا اور انہوں نے اپنے عمل سے یہ تک ثابت کر دیا کہ وہ اپنی بیوی کو چھوڑ سکتے ہیں اردو کو نہیں۔ اردو زبان سے ان کی وفاداری، قابل صد ستائش اور مثالی نمونہ ہے۔ وہ ایک اصول پسند، حق گو اور بے باک انسان تھے۔ وہ جس بات کو صحیح سمجھتے تھے اس کا بہ بانگ دہل برملا اظہار کرتے تھے اور اس معاملے میں کسی رو رعایت کے قائل نہیں تھے۔ یہ بات اپنی جگہ قابل تعریف ہے کہ وہ حق گو، بے باک اور اصول پسند تھے۔ اور انہوں نے ساری زندگی اسی کے تحت گزار دی۔ رالف رسل کے اس پہلو پر رؤف خیر کی تجزیاتی تحریر دلچسپ ہے۔

آیئے کچھ ماضی کی طرف پیش قدمی کرتے ہیں۔ جنگ آزادی کا زمانہ ہے۔ محبان وطن دشمنان وطن انگریزوں سے لوہا لے رہے ہیں۔ ایسے میں سبھی دیش واسی اپنی اپنی بساط بھر اپنا رول ادا کر رہے

ہیں۔حسرت موہانی بھی آزادی کے جانبازوں میں ایک نمایاں پرعزم، پرجوش اور فعال سپاہی ہیں۔ ایک ایسا سپاہی جو اپنی صلاحیت کی دودھاری تلوار سے جنگ آزادی میں بڑھ چڑھ کر حصہ لے رہا ہے۔ یعنی ایک طرف وہ سیاسی میدان کے کھلاڑی ہیں تو دوسری طرف ایوان شاعری کے بے مثال فنکار بھی :

ہے مشق سخن جاری چکی کی مشقت بھی
اک طرفہ تماشا ہے حسرت کی طبیعت بھی

حسرت کی شخصیت کے یہ دونوں ہی پہلو قابل قدر اور لائق رشک ہیں۔فی الوقت ہم یہاں ان کی شاعرانہ شخصیت پر ابوبکر عباد کا ایک بھرپور مقالہ شائع کر رہے ہیں۔

ماضی کی بات آئی تو جوش کو بھلا کیسے نظر انداز کیا جاسکتا ہے۔جوش کی شاعری میں تو ماضی کی بازیافت کا عمل باضابطہ موجود ہے۔اسی ماضی کی بازیافت کے عمل سے انہوں نے اپنی شاعری کو دو آتشہ بنایا اور جنگ آزادی میں اپنی ایسی تحریروں سے خوب خوب کام لیا۔شکست زنداں اور اسی قبیل کی دوسری نظموں میں انہوں نے کچھ ایسی منظر کشی کی کہ رگوں میں خون ابلنے لگتا ہے۔نعیم السحر صدیقی نے جوش کی شخصیت کے اس پہلو کو بھی بخوبی اجاگر کیا ہے۔

مخمور سعیدی کی شاعری جتنی پرکشش، دلسوز ہے اتنی ہی ان کی شخصیت دلنواز اور دلفریب۔ ہمیشہ ہنستا مسکراتا چہرہ لیے وہ ہر کسی سے پرجوش انداز میں ملتے نظر آتے تھے۔باتیں کرتے تو ایسا محسوس ہوتا کہ ان کے منہ سے پھول جھڑ رہے ہوں۔انکساری اور عاجزی ان کی شخصیت کا اٹوٹ حصہ تھی۔حالیہ شعری منظرنامے میں سب سے اہم نام کے طور پر مخمور سعیدی کو جانا جاتا تھا۔آج جب کہ مشاعرہ کھیل تماشا، اچھل کود، ڈرامے بازی اور کرتب بازی سے موسوم ہو کر رہ گیا ہے۔ ایسے میں سنجیدہ سامعین کے لیے مخمور سعیدی کا دم غنیمت تھا۔ان کی وفات سے اردو شاعری میں یقیناً ایک ایسا خلا پیدا ہوا ہے جس کو خود مخمور سعیدی ہی پُر کر سکتے تھے۔وہ گویا روشنی کا مرکز تھے۔

6 مئی 2010 کو گرودیو ربندر ناتھ ٹیگور کی پیدائش کو ڈیڑھ سو سال پورے ہو رہے ہیں۔ہم اس موقع پر ان کی مشہور زمانہ تخلیق 'گیتا نجلی' سے ایک انتہائی مختصر حصہ بطور خراج عقیدت پیش کر رہے ہیں۔ہم یاد رفتگاں کے ساتھ ساتھ ذکر قائماں کا سلسلہ بھی شروع کر رہے ہیں لہٰذا جولائی کا شمارہ پروفیسر محمد حسن پر مخصوص ہوگا۔ (مئی 2010)

اکادمی کی اصل ذمہ داری

پچھلے دنوں اسلامک کلچرل سینٹر میں پروفیسر اختر الواسع کو دہلی اردو اکادمی کا وائس چیئرمین بنائے جانے پر ہدیۂ تبریک وتہنیت پیش کیا گیا۔ جلسہ کے بعد پروفیسر اختر الواسع نے مجھ ناچیز سے فرمایا کہ اردو کے فروغ کے سلسلے میں عملی اور اصلی اقدام کیا ہو سکتے ہیں؟ کچھ آپ بھی بتاتے رہیں۔ میں نے ہامی بھر لی۔ آج ان سطور میں کچھ اسی سمت میں باتیں ہوں گی۔

اردو اکادمیاں اپنے اپنے دائرۂ اختیار میں اپنی بساط بھر مختلف پروگرام کراتی رہتی ہیں لیکن دلّی اردو اکادمی اپنی فعالیت کے سبب دوسری تمام اکادمیوں پر سبقت رکھتی ہے۔ اس اکادمی کے پروگرام میں مشاعرے، سیمینار، مباحثے، رسالوں کی اشاعت، کتابوں کی اشاعت پر جزوی مالی تعاون، مطبوعہ کتابوں پر انعامات، تعلیم بالغاں میں اردو کی خواندگی، جزوی مشاہرہ پر اساتذہ کی فراہمی، مختلف لائبریریوں کو رسالوں اور کتابوں کی فراہمی وغیرہ شامل ہیں۔

قمر رئیس نے دہلی اردو اکادمی کے ماہنامہ ایوان اردو کے مئی 2009 کا اداریہ تحریر کیا تھا' جو غالباً ان کی آخری تحریر تھی۔ اس اداریہ کی خاص بات یہ ہے کہ قمر رئیس نے صاحب اقتدار ہوتے ہوئے بھی انتہائی بے باکی سے اپنی آرار کا نہ صرف واضح اور دوٹوک انداز میں اظہار کیا بلکہ اردو اکادمیوں کے قیام' ان کے حالات اور ترجیحات پر گفتگو کرتے ہوئے اردو اکادمیوں کے ارباب حل وعقد کو اردو کے تئیں اصلی اور لازمی کاموں کی طرف توجہ دلائی۔ مختلف ریاستوں میں اردو اکادمیوں کی صورت حال پر گفتگو کرتے ہوئے انہوں نے ایک چبھتا ہوا سوال کیا تھا:

''سوال یہ ہے کہ کیا ان اکادمیوں کے قیام سے متعلق ریاستوں میں اردو کی ترقی اور بقا کے امکانات روشن ہو رہے ہیں یا یہ محض اردو لسانی اقلیت کی دلداری اور دلاسے کا وسیلہ ہیں''؟۔ پھر خود ہی

جواب دیتے ہوئے لکھا: ''یہ سوال اوراس کا جواب شاید ہر اردو والے کے ذہن میں صاف ہے''۔

اردو اکیڈمی کی مختلف سرگرمیوں کا جائزہ لیتے ہوئے انہوں نے اس کے کچھ کاموں کی سراہنا بھی کی لیکن بیشتر انہوں نے بے اطمینانی کا اظہار کیا تھا۔ انہوں نے لکھا ہے: ''تجربہ یہ بتاتا ہے کہ اس نوع کی سرگرمیوں سے رونق تو ہو جاتی ہے لیکن ان سے اردو زبان کو ایسا فیض نہیں پہنچتا کہ جس سے اردو کی ترقی اور بہتری کے امکانات روشن ہو سکیں''۔

اس اداریہ میں انہوں نے اردو اکیڈمی کی ایسی سرگرمیوں کے ساتھ ساتھ اس کے کرنے کا اصل نشانہ اور ہدف کی بھی نشاندہی کی تھی کہ: ''اصل نشانہ ریاست میں اردو زبان کی تعلیم اور ترویج واشاعت ہی ہونا چاہئے''۔

اردو اکیڈمی کے سارے کام اہم اور ضروری ہیں لیکن ان میں بیشتر اردو والوں کی ترقی کے کام ہیں، اردو زبان کی ترقی کے نہیں۔ ان سب میں زیادہ ضروری یہ ہے کہ ہر ایک اسکول میں اردو کی تعلیم وتدریس کا معقول نظم ہوتا کہ زیادہ سے زیادہ اردو داں اور اردو خواں تیار ہو سکیں اور اردو کا حقیقی فروغ ہو سکے۔ آج صورت حال یہ ہے کہ عام اسکولوں میں اردو کی تعلیم کا نظم تو دور کی بات خاص اقلیتی اسکولوں اور اردو میڈیم اسکولوں میں بھی اردو کی تعلیم کا معقول نظم نہیں۔ کہیں اساتذہ نہیں تو کہیں نصابی کتابیں ندارد، تو کہیں اسکول کا معیار اور ماحول اتنا خراب اور بگڑا ہوا کہ لوگ اپنے بچوں کو وہاں بھیجنا پسند نہیں کرتے۔ عام طور پر اردو اسکولوں کا معیار بہتر نہیں ہے۔ اس میں اسکول انتظامیہ، اساتذہ اور بچوں کے سرپرست سبھی قصوروار ہیں۔ ایسے میں اردو اکادمی بھی بعض اسکولوں کو جزوقتی اساتذہ فراہم کرکے اپنی ذمہ داری سے سبکدوش نہیں ہو سکتی۔

سوچنے والی بات یہ ہے کہ کیا ایسے میں اردو زبان کی حقیقی ترقی ممکن ہے اور کیا ایسے اردو تعلیم یافتہ حضرات ملک وقوم کی سرپرستی، سربراہی یا کسی طور پر خدمت کرنے کے اہل ہوں گے۔ میں اس کے لیے کسی اکادمی یا کسی فرد خاص کو ذمہ دار اور قصوروار نہ ٹھہراتے ہوئے صرف یہ عرض کرنا چاہتا ہوں کہ ایسے اسکولوں کی اصلاح کے خاص اقدام کرنے کی ضرورت ہے اور اردو اکادمی کو چاہئے کہ ان اسکولوں کو جزوقتی اساتذہ کی فراہمی فوری طور پر بند کرکے ان جگہوں پر مستقل اساتذہ کی بحالی کی کوشش کرے۔ ان اقدام سے جہاں ایک طرف جزوی اساتذہ کا استحصال بند

ہوگا وہیں دوسری طرف اسکولوں کو مستقل اساتذہ مل سکیں گے۔ اسی طرح نصابی کتابوں کی بروقت فراہمی کو یقینی بنایا جانا اشد ضروری ہے تاکہ اردو طلبہ کو ہندی کتابیں پڑھنے پر مجبور نہ ہونا پڑے۔ یادرکھیں اردو کی ترقی وبقا کے لیے اردو اسکولوں کا نظم ونسق اور اردو اساتذہ کی بحالی نہایت ضروری ہے۔ اردو کے ساتھ سب سے بڑی ستم ظریفی تو یہی ہوئی کہ اردو کے سب سے بڑے گڑھ اتر پردیش میں اسکولوں سے اردو کو ختم کردیا گیا۔ یعنی اردو کی جڑ ہی کاٹنے کی کوشش کی گئی۔ وہ تو بھلا ہو ان مدارس اسلامیہ کا کہ جن کے دم سے آج اردو زبان چاہے جس شکل میں بھی ہو پھل پھول رہی ہے۔

بہر حال جس طرح بھی ممکن ہو اردو کی تعلیم وتعلم کا سلسلہ دراز سے دراز تر ہونا چاہیے۔ اگر آپ اردو میڈیم اسکولوں کے پرفارمینس سے مطمئن نہ ہوں تو بیشک اپنے بچوں کو انگریزی میڈیم اسکولوں میں تعلیم دلوائیں لیکن کوشش کریں کہ اس اسکول میں اردو کی تعلیم کا انتظام ہوجائے۔ ناچیز نے خود ایسا ہی کیا ہے۔ اگر بحالت مجبوری ایسا نہ ہوسکے تو خدارا کم سے کم ایک آدھ گھنٹہ گھر پر ہی اپنے بچوں کو اردو کی شد بد کرائیں کہ اسی اردو زبان میں آپ کی تہذیب، آپ کی ثقافت اور آپ کا بہت کچھ پوشیدہ اور مضمر ہے۔

تہذیب وثقافت کی بات آہی گئی ہے تو ایک نظر اس پر بھی کہ ہماری ایک ہزار سالہ تاریخ وثقافت ان دستاویزات اور مخطوطات میں محفوظ ہیں جو عربی وفارسی کے ساتھ ساتھ زیادہ تر اردو میں محفوظ ہیں اور یہ تعداد میں ایک دو یا دس بیس نہیں بلکہ سیکڑوں، ہزاروں اور لاکھوں کی تعداد میں مختلف مقامات پر مخدوش حالت میں کرم خوردگی کا شکار ہیں۔ جن مقامات پر یہ قیمتی خزانے اردو اسٹاف کے نہ ہونے کے سبب ضائع ہورہے ہیں ان میں سے کچھ کے نام اس طرح ہیں:

نیشنل میوزیم دہلی، لال قلعہ میوزیم دہلی، کمشنر آفس ریکارڈ مہرولی، تاج محل میوزیم، آرکیالوجیکل سروے آفس آگرہ، پٹیالہ میوزیم، چنڈی گڑھ میوزیم، جے پور میوزیم، جے پور پیلس میوزیم، الور میوزیم، جودھ پور میوزیم، اودے پور میوزیم، بیکانیر آرکائیوز، آرکیالوجیکل سروے آف انڈیا ناگپور، سالار جنگ میوزیم حیدرآباد، انڈین میوزیم کولکاتا، وکٹوریہ میموریل کولکاتا، شانتی نکیتن کولکاتا، کولکاتا یونیورسٹی، جادھوپور یونیورسٹی، ایشیاٹک سوسائٹی کولکاتا، ایشیاٹک

سوسائٹی ممبئی، پرنس ویلز میوزیم ممبئی وغیرہ وغیرہ۔ان جگہوں پر بیش قیمتی نوادر عدم توجہی کے سبب ضائع ہورہے ہیں۔ ہمیں اپنی اپنی سطح پر کوشش کرنی چاہیے کہ ان دستاویزات اور مخطوطات کی دیکھ ریکھ اور انہیں منظر عام پر لانے کے لیے لائق وفائق لوگوں کی بحالی ہوتا کہ ہماری تاریخ وتہذیب پر جم رہی گرد کو صاف کر کے انہیں منظر عام پر لایا جاسکے اور ہماری گنگا جمنی تہذیب کا یہ باب زیادہ روشن اور شفاف ہوسکے۔یہ کام ترجیحی بنیاد پر کیا جانا چاہیے۔

امسال مردم شماری کا آغاز ہو چکا ہے۔ اس موقع پر ہمیں بہت زیادہ ہوشیار، چوکس اور مستعد رہنے کی ضرورت ہے۔ یہ ہمارا قومی اور ملی فریضہ ہے کہ ہم اس موقع پر اپنی بیداری کا ثبوت دیں۔اس بار کی مردم شماری آزاد ہندوستان میں ہوئی تمام مردم شماریوں کے مقابلے اس لحاظ سے بہت ہی اہم ہے کہ یہ صرف مردم شماری نہیں بلکہ یہ قومی آبادی رجسٹر کی تیاری کا آغاز ہے۔دراصل اس مردم شماری میں حکومت کے پیش نظر ایک ایسا رجسٹر تیار کرنا ہے جس میں ملک کے ہر شہری کا اندراج ہوگا اور آگے چل کر یہ اندراج ہی ہم، آپ اور سب کی شہریت کا حتمی ثبوت ہوگا۔اس رجسٹر میں نام نہ درج ہونے پر شہریت مشتبہ قرار دی جاسکتی ہے۔اسی کی بنیاد پر ایک خاص قسم کا کثیر مقصدی شناختی کارڈ تیار کیا جائے گا جو ہر جگہ کام آسکے گا۔ بینک میں کھاتا کھلوانا، بینک سے قرض لینا، ریلوے تتکال ٹکٹ، کسی کی ضمانت لینا اور اپنی شناخت ثابت کرنا یہ سب کچھ اسی ایک اسمارٹ کارڈ کے ذریعہ کیا جاسکے گا۔یہ فائدے اپنی جگہ مسلم لیکن قومی، ملی، مذہبی اور لسانی طور پر ایک سب سے اہم بات یہ ہے کہ اپنی مادری زبان کے خانے میں اردو اور لیاقت کے خانے میں اگر آپ مدارس کے فارغ ہوں جیسے مولوی، عالم، فاضل ہی لکھوائیں۔عام طور پر مردم شماری کے بعض کارکنان اپنے تعصب، تنگ نظری، عدم معلومات یا جہالت کی بنیاد پر زبان کے خانے میں اردو کی جگہ ہندی، یا کوئی اور زبان خود ہی لکھ دیتے ہیں۔اور اس طرح مردم شماری کی بنیاد پر اردو بولنے والوں کی تعداد نہایت قلیل نظر آتی ہے۔بہار میں پروفیسر عبدالمغنی کی قیادت میں انجمن ترقی اردو بہار نے ایک عرصہ پہلے مردم شماری کے موقع سے ایک لائق تقلید کارنامہ یہ انجام دیا تھا کہ اپنے کارکنان کو چھوٹی چھوٹی ٹولیوں میں بانٹ کر ان مردم شماری کارکنان کے ساتھ لگا دیا تھا کہ وہ ان کی مدد بھی کریں اور اس پر نگرانی بھی رکھیں کہ صحیح اندراج کیا جارہا ہے یا

نہیں۔اس طرح اس مردم شماری کی بنیاد پر بہار میں اردو بولنے پڑھنے والوں کی جو تصویر سامنے آئی اس کی بنیاد پر بہار میں حکومت وقت کو اردو کو دوسری سرکاری زبان کا درجہ دینے پر مجبور ہونا پڑا۔بہار کی یہ مثال دوسری ریاستوں کے لیے قابل تقلید ہے۔

یہ وہ باتیں ہیں جو نہ صرف دہلی اردو اکادمی کے کرنے کی ہیں بلکہ پورے ہندوستان کی مختلف اکادمیاں، انجمنیں، ادارے اور تنظیمیں جو اردو دوستی کا دم بھرتی ہیں اور ہم جو اردو کی روٹی کھاتے ہیں، ان سب کے کرنے کی ہیں۔ (جون 2010)

''زمانہ کو جاری ہوئے آج چھٹواں مہینہ ہے۔ناظرین والا تمکین کی قدردانی اور سرپرستی کا تہہ دل سے شکریہ ادا کرتے ہوئے ملتجی ہوں کہ اس کی سالانہ قیمت بھیج کر ہماری ہمت افزائی کریں تاکہ زمانہ کے سلسلے میں ہم کو برابر خدمات انجام دینے کا موقع رہے۔''

(زمانہ، جون 1903)

''اس نمبر سے زمانہ کی زندگی کا چودہواں سال شروع ہوتا ہے۔گزشتہ تیرہ سالوں میں اس کی اشاعت کی راہوں میں جو مشکلات کا سامنا ہوا ہے. اس کا کچھ علم ہمیں کو ہے۔تیرہ سال کے اندر ہزار ہا روپیہ مالی نقصان کے باوجود جس طرح سے ہوا، رسالہ اب تک جاری رکھا گیا ہے۔تمام الزامات اردو پبلک پر ہے جن کی قدردانی اس قدر محدود ہے کہ ملک میں ایک رسالہ بھی اپنی آمدنی سے اپنے مصارف پورے نہیں کرسکتا۔اردو میں کیسے کیسے شاندار رسالے نکلے مگر سب دو چار برس کے اندر بند ہوگئے..... اردوئے معلیٰ، ادیب وغیرہ بند ہوگئے۔مخزن ہنوز باقی ہے۔''

(زمانہ، جنوری 1916ء)

کیا تیرا بگڑتا جو نہ مرتا کوئی دن اور

آہ آخر وہی ہوا جس کا خدشہ تھا۔ یعنی پروفیسر محمد حسن بھی گزر گئے۔ ہم نے مئی کے شمارہ میں اداریہ میں آخری جملہ لکھا تھا: ''ہم یاد رفتگاں کے ساتھ ساتھ ذکر قائماں کا سلسلہ بھی شروع کررہے ہیں لہٰذا جولائی کا شمارہ پروفیسر محمد حسن پر مخصوص ہوگا'' قائم اور باقی تو صرف خدا کی ذات ہے۔ انسان تو بہر حال فانی اور رفتگاں ہی ہے۔ سو محمد حسن بھی رفتگاں ہوئے۔ پچھلے کچھ عرصہ سے بستر علالت سے کچھ اس طرح چمٹ چکے تھے کہ ہمیں ان کے بچنے کی امید بالکل نظر نہیں آتی تھی۔ سوچا کہ اس جولائی میں ان کی 85 ویں سالگرہ کے موقع پر آجکل کا ایک خصوصی شمارہ انہیں پیش کریں، لیکن خدا کو یہ منظور نہ تھا۔ محمد حسن نے اپنی ساری زندگی بے نیازی کے ساتھ گزاری چنانچہ نہ کبھی انہوں نے خود پر مضمون لکھوانے، رسالوں کے نمبر نکلوانے کی جوڑ توڑ یا تمنا کی، ہم تو بے غرض ہو کر اپنا نذرانہ خلوص پیش کرنا چاہتے تھے، لیکن استاد کو شاید یہ منظور نہ تھا اور وہ ہم سے رخصت ہو گئے۔

کیا تیرا بگڑتا جو نہ مرتا کوئی دن اور

وفات سے تقریباً دس روز پہلے میں نے خیریت جاننے کے لیے استاد مکرم محمد حسن کو فون کیا۔ فون پر انہیں معلوم ہوا کہ میں ابرار رحمانی بول رہا ہوں۔ وفور جذبات سے مغلوب ہو کر انہوں نے صرف دو الفاظ ادا کیے 'ابرار آجاؤ'۔ اس کی تکرار انہوں نے دو تین بار کی۔ کچھ اس انداز سے جیسے واقعی ان کی روح مائل بہ پرواز ہو۔ میں نے فوراً ہامی بھرلی۔ آنے کا وعدہ کیا اور ذوقی کے ساتھ ان سے ملنے کا پروگرام طے پایا۔ لیکن بے جا مصروفیات یا غم روزگار نے ہمیں ان سے ملنے سے مانع رکھا۔ آخر 24 اپریل کو وہ ہم سے بچھڑ گئے اور ہم کف افسوس ملتے رہ گئے۔

ان سے ملنے کے پروگرام میں یہ بھی شامل تھا کہ ان کے پاس جو کچھ غیر مطبوعہ چیزیں ادھر ادھر بکھری پڑی ہیں اسے تلاش و جستجو کے بعد ہم لے آئیں گے تا کہ ہم اسے محمد حسن پر مخصوص آجکل کے شمارہ میں شامل کر سکیں۔ ہمیں اچھی طرح معلوم ہے کہ وہ اپنی بے نیازی کے سبب اپنی بہت ساری چیزوں کو لاپرواہی سے اپنی دراز میں ڈال کر بھول جاتے تھے۔ انہوں نے پچھلی ملاقات میں ہم سے کہا تھا کہ 'اس وقت بھی میری دراز میں میرے سات غیر مطبوعہ ڈراموں کے مسودے موجود ہیں'۔ اسی طرح ان کے کئی تنقیدی مضامین اور تخلیقات بھی ان کے کاغذات کے انبار میں دبے پڑے ہوں گے۔ کوئی محنتی ریسرچ اسکالر ہمت کرے تو یہ نایاب چیزیں اس کے ہاتھ آسکتی ہیں۔

ان کے متعلق یہ بات مشہور ہے یا غلط طور پر اس کی تشہیر کر دی گئی کہ وہ نئی نسل کے لکھنے والوں کی تعریف میں بخل کرتے ہیں، جب کہ ایسا نہیں ہے۔ البتہ وہ جا و بیجا چیزوں کے لیے نئی نسل کی تعریف کر کے انہیں بھرم میں مبتلا کرنے کا جرم بھی نہیں کرتے تھے جیسا کہ ان کے بعض معاصرین کرتے رہے ہیں۔ آج ادب کے باباؤں کا حال یہ ہے کہ اپنے عزیزوں، شاگردوں اور حلقہ بگوشوں کو جو کہ ان کی ہر غلط صحیح بات پر آمنا و صدقنا کہنے کو تیار ہوں انہیں کچھ اس طور پر نوازتے ہیں، سند اور سرٹیفکیٹ عطا کرتے ہیں کہ یہ بالشتیے خود کو ادب کا ہمالیہ پہاڑ سر کرتا ہوا محسوس کرنے لگتے ہیں۔

مجھے یاد ہے کہ عصری ادب کے ایک شمارہ میں ادب کے نورتنوں کا ذکر کرتے ہوئے محمد حسن نے نئی نسل کو خاصی اہمیت دی تھی۔ اسی طرح جب ناچیز کا ڈرامہ "پھول کی پتی، ہیرے کا جگر" انہوں نے 'مباحثہ' پٹنہ اور 'شیرازہ' سری نگر میں پڑھا تو اس قدر خوش ہوئے اور اس کی سراہنا کی کہ میں پھولے نہیں سمایا۔ حالانکہ میں ڈر رہا تھا کہ اس بے باک اور عریاں ڈراما کو پڑھ کر وہ میری سرزنش اور گوشمالی کریں گے لیکن ایسا کچھ نہیں ہوا۔ اس سے میرے اس خیال کو تقویت پہنچی کہ ادب کی ڈیمانڈ کے حساب سے ایک حد تک جایا جا سکتا ہے۔ حالانکہ میرا یہ ڈراما کچھ زیادہ ہی بولڈ ہے۔

وہ میرے ایک محترم استاد تھے۔ پچھلے بیس سالوں سے وہ ریٹائرمنٹ کی زندگی گزار رہے تھے۔ مجھ سے ایک خاص انس رکھتے تھے۔ چنانچہ کبھی کبھار جب وہ اپنے بے تکلف احباب

اور شاگردوں کو جمع کرتے تھے تاکہ وہ ان سے گفتگو کرکے مجلسی زندگی کا لطف اٹھا سکیں، تو ایسے موقع سے اپنے عزیزوں میں مجھے بھی ضرور یاد کرتے تھے اور ایک پوسٹ کارڈ مجھے بھی ڈال دیتے تھے۔ حکم کی تعمیل میں میں وہاں پہنچ بھی جاتا تھا لیکن مجھے ان سے ایک شکایت رہی کہ وہ اکثر خط تو مجھے لکھتے لیکن ایڈریس میں نام کی جگہ پر اکبر رحمانی کا نام ہوتا۔ ممکن ہے ابرار رحمانی کے نام کا خط شاید اکبر رحمانی کے پاس جلگاؤں پہنچتا رہا ہو۔ خیر یہ ایک تحقیق طلب معاملہ ہے۔ لیکن یہ پرلطف واقعہ استاذی مکرم کی شانِ پروفیسری پر دال ہے۔

بہت کم لوگوں کو معلوم ہوگا کہ پروفیسر محمد حسن نے اپنے کیریئر کی شروعات فلمی مبصر کے طور پر کی تھی اور انگریزی اخبار 'پانیئر' میں ان کے فلمی تبصروں کا نوٹس لیا جاتا تھا۔ مگر اپنی ادبی زندگی کا آغاز افسانہ نویسی سے کیا تھا اور انہوں نے کچھ اچھے افسانے بھی لکھے لیکن وہ بہت جلد افسانے سے ڈرامے کی طرف آگئے۔

پروفیسر محمد حسن جتنے اچھے نقاد تھے کم وبیش اتنا ہی ملکہ انہیں ڈرامے میں بھی حاصل تھا۔ انہوں نے اسٹیج ڈرامے بھی لکھے اور ریڈیو ڈرامے بھی۔ وہ بنیادی طور پر ڈرامے کو اسٹیج سے مشروط مانتے تھے۔ چنانچہ ان کے بیشتر ڈرامے اس طور پر لکھے گئے ہیں کہ انہیں بہ آسانی اسٹیج کیا جاسکے۔ انہوں نے ڈرامے میں کچھ انوکھے تجربے بھی کیے اور 'اردو کی کہانی، روشنی اور آواز کی زبانی' نام سے ایک خوبصورت ڈراما اردو زبان کے ارتقا پر نہ صرف تحریر کیا بلکہ اپنی نگرانی میں اسے مختلف مقامات پر اسٹیج بھی کرایا۔ وہ جتنے اچھے ڈراما نگار تھے اتنے ہی اچھے ڈراما کے نقاد بھی تھے اور ان کی کس حیثیت کو کس حیثیت پر فوقیت حاصل ہے یہ طے کر پانا مشکل ہے۔

پروفیسر محمد حسن مارکسی تنقید کے ایک مضبوط ترین ستون تھے اور وہ اپنے نظریہ پر آخر دم تک پورے استحکام کے ساتھ قائم رہے۔ ان کا یہ نظریہ صاف، شفاف اور دوٹوک تھا اور کسی لاگ لپیٹ کے بغیر وہ اپنی بات کہنے میں یقین رکھتے تھے۔ ان کی اکثر تحریریں ہمیں غور وفکر کی دعوت دیتی ہیں اور ان کی ہر تحریر کا اکثر نوٹس لیا جاتا رہا ہے۔

وہ ایک اچھے شاعر بھی تھے لیکن انہوں نے اپنے مافی الضمیر کے اظہار کے لیے بیشتر نثری نظموں کا سہارا لیا حالانکہ وہ پابند نظمیں اور غزلیں کہنے پر بھی قادر تھے۔ سجا ظہیر کے بعد محمد حسن کی

ہی شخصیت ایسی ہے، جس نے نثری نظم کو فروغ دینے کا اہم کارنامہ انجام دیا۔

پروفیسر محمد حسن ایک ہشت پہلو شخصیت کے مالک تھے۔ انہوں نے ادب کی بیشتر اصناف میں کامیاب طبع آزمائی کی تھی۔ انہوں نے ادب کے علاوہ سیاسی اور سماجی مسائل پر بھی کھل کر اظہار خیال کیا اور وہ سیاسی اور سماجی مسائل کو ادب سے الگ نہیں بلکہ ادب کو سماج کی پیداوار تصور کرتے تھے۔ ایسی رنگارنگ شخصیت کا ہمارے بیچ سے اٹھ جانا یقیناً ایک ناقابل تلافی نقصان ہے۔

(جولائی 2010)

''اس پرچہ کے ساتھ زمانہ کی زندگی کا انیسواں سال ختم ہو رہا ہے۔ ابتدائی مشکلات کو دیکھ کر جن کا سلسلہ ابھی تک کچھ نہ کچھ جاری ہے۔ یہ عمر ایک بڑی عمر معلوم ہوتی ہے..... ۱۹۰۳ء میں جب یہ ذمہ داری موجودہ کارکنوں کے سر آئی تھی تو کس کو بھروسہ تھا کہ یہ ناچیز کوشش اتنے دنوں جاری رہ سکے گی مگر تائیدایزدی تھوڑے سے عزم واستقلال کا بھی ساتھ دیتی ہے۔ زمانہ کی ہستی کا اب تک قائم رہنا تائید غیبی کا ایک ادنیٰ معجزہ ہے۔'' (زمانہ، مئی 1921ء)

''اس نمبر کے ساتھ رسالہ 'زمانہ' کا چھبیسواں سال ختم ہوتا ہے۔ کوشش جاری ہے کہ آئندہ رسالہ کی موجودہ خصوصیت قائم رہے.....توسیع اشاعت ہی ہمارے ارادوں کی کامیابی کا دارومدار ہے۔ ناظرین ایک ایک دو دو خریدار دے سکتے ہیں۔ ہم کو امید ہے کہ ہمارے مہربان اس بارے میں تھوڑی کوشش کر کے اس ادبی کوشش کی توسیع میں ہمارا ہاتھ بٹائیں گے۔'' (زمانہ، اگست 1928ء)

''.....زمانہ کی مالی حالت کا ذکر کر کے ہم اپنے ناظرین کو بے لطف نہیں کرنا چاہتے۔ لیکن یہ ایک دل شکن حقیقت ہے کہ اتنے دنوں کی خدمت گزاری کے بعد بھی زمانہ کی آمدنی سے اس کے اخراجات پورے نہیں ہوتے چنانچہ پچھلے دو سال یعنی 36-1934 میں رسالہ پر دو ہزار چار سو چھ روپے تیرہ آنے کا خسارہ آیا جو قریب قریب سب اخبار 'آزاد' کی آمدنی سے پورا ہو.....'' (زمانہ، جولائی 1938)

آگے کی جانب گامزن؟

اس بار ہم ' آجکل کی فائل سے' تقریباً نصف صدی پرانا مضمون ' آج کا اردو افسانہ' شائع کرر ہے ہیں۔ یہ مضمون مشہور ادیب قیصر تمکین کا تحریر کردہ ہے۔ جو ایک معروف ناقد اور افسانہ نگار تھے اور جن کا حال ہی میں لیڈز میں 71 سال کی عمر میں 24 نومبر 2009 کو انتقال ہوا۔ اس مضمون کی دوبارہ اشاعت سے ہمارا مقصد انہیں خراج عقیدت بھی پیش کرنا ہے۔

زیر نظر مضمون ' آج کا اردو افسانہ' نصف صدی پرانا ہونے کے باوجود Outdated نہیں لگتا کیونکہ آج بھی اس مضمون میں لیے گئے ادیبوں کے نام سکہ' رائج الوقت کی طرح جاری وساری ہیں۔ بیشک اس مضمون میں گنائے گئے کم وبیش چالیس ناموں میں سے بیشتر اب ہمارے درمیان نہیں ہیں لیکن ان کی تحریریں آج بھی زندہ وتابندہ ہیں جن کی وجہ سے ایسا محسوس ہوتا ہے کہ وہ اب بھی ہمارے درمیان موجود ہیں۔ یہاں ان ناموں کا گنوانا تحصیل حاصل ہوگا اور تضیع اوقات بھی۔

البتہ ان ناموں میں سے جو ہمارے درمیان بقید حیات ہیں۔ گرچہ وہ تھوڑے ہیں لیکن ان میں سے بیشتر آج بھی ہم سے زیادہ فعال اور متحرک ہیں اور فکر وفن کی سطح پر ہم سے بہتر تخلیقات پیش کرر ہے ہیں اور جن کے پاس کہنے کو کچھ نہیں ہے بالفاظ دیگر وہ خالی (Exhaust) ہو چکے ہیں، انہوں نے زندگی کے دوسرے مشاغل میں مصروف ہونے میں ہی اپنی عافیت سمجھی اور بے پر کی اڑانے کو اپنا وطیرہ نہیں بنایا۔

مضمون ' آج کا اردو افسانہ' چاہے آج سے پچاس سال پہلے لکھا گیا ہو یا آج لکھا جار ہا ہو اس سے ہمارا مقصد اور مدعا اردو افسانے کے ارتقا پر نظر ڈالنا ہی ہے۔ ارتقا یعنی بتدریج ترقی کی طرف گامزن اردو افسانے کا سفر۔ اب یہاں یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ کیا واقعی اردو افسانہ ترقی کے

منازل طے کر رہا ہے یا آج بھی یہ افسانہ قیصر تمکین کے گنائے گئے ناموں عابد سہیل، جوگندر پال، جیلانی بانو اور اقبال متین وغیرہ تک کا جتنا سفر طے کر چکا ہے، وہیں تھم کر رہ گیا ہے؟

بیشک آج کے اردو افسانہ نگاروں کی ایک طویل فہرست ہے۔ اس فہرست کو آپ چاہیں تو کئی خانوں میں بانٹ لیں یعنی سن ستری افسانہ نگار، 1980 کے افسانہ نگار، 1990 کے افسانہ نگار، اسی طرح اکیسویں صدی کے پہلے دہے کے افسانہ نگار، آپ چاہیں تو ہر صف کے افسانہ نگاروں کا ایک ایک امام بھی منتخب کر لیں۔ لیکن کیا اس سے افسانے کی سمت و رفتار تیز ہو پائے گی؟ تیز ہو بھی لے تو کیا اس سے اردو افسانے کا قرار واقعی ارتقا ہو سکے گا؟ یہ ایک بڑا سوالیہ نشان ہے۔ جس پر ہم بھی کو مل بیٹھ کر، سر جوڑ کر سوچنے اور عملی طور پر غور و فکر کرنے کی ضرورت ہے۔ 'عملی' سے ہماری مراد یہ ہے کہ دور اول اور دور دوم کے لافانی اور لازوال شاہکار افسانوں کے پائے کے افسانے تخلیق کرنے ہوں گے۔

بیشک آج اردو افسانہ سیکڑوں بلکہ ہزاروں کی تعداد میں تخلیق کیے جا رہے ہیں اور افسانوں کے ذخیرے میں اضافہ ہو رہا ہے لیکن یہ 'اضافہ' ہے یا انبار؟ اس پر ٹھنڈے دل و دماغ سے سوچنے کی ضرورت ہے۔ آج بھی منشی پریم چند، منٹو، راجندر سنگھ بیدی، عصمت چغتائی اور کرشن چندر ناقابل عبور چٹان کی مانند ہمارے سامنے کھڑے ہیں اور آج کے افسانہ نگار اسے پار کرنے کی سکت نہیں رکھتے۔ لیکن خوش فہمی یہ ہے کہ ہم نے اردو افسانے کا ہمالیہ پہاڑ سر کر لیا ہے۔

اب حقیقت پسندی کے نام پر عریاں حقیقت پسندی کو انہوں نے اپنایا ہوا ہے۔ جنسی بیان کو چٹخارے اور لطف اندوزی کا ذریعہ بنایا ہے۔ اسی طرح حسن و عشق کے واردات، سستے اور اوچھے موضوعات کو آج بھی گلے لگایا ہوا ہے۔ اس حقیقت کے باوجود آج ہمارے افسانہ نگار اپنے آپ میں بدمست اور سرشار نظر آتے ہیں۔ خواہ ان کے قاری انگلیوں پر گنے جانے تک ہی کیوں نہ محدود ہوں۔ آج حال یہ ہے کہ من ترا حاجی بگویم، تو مرا ملا بگو کے مصداق ایک دوسرے کو بڑھا چڑھا کر پیش کر رہے ہیں اور خوش ہو رہے ہیں۔ اس حقیقت کی دوسری انتہا یہ کہ جو ہمارا ہم نوالہ و ہم پیالہ نہیں اس کی منصوبہ بند طریقے سے ٹانگ کھینچنے اور اس پر کیچڑ اچھالنے سے دریغ نہیں کرتے۔

قیصر تمکین نے اپنے اسی مضمون میں ایک جگہ لکھا ہے" 1950 سے لے کر لگ بھگ سات آٹھ سال ایسے گزرے کہ اردو افسانے کی ترقی کی رفتار سست ہو گئی اس کی یہی وجہ سمجھ میں آتی ہے

کہ زیادہ تر ادیب ایک سیاسی تحریک سے وابستہ تھے۔ جب یہ تحریک غلط ثابت ہوئی تو بہت سے لوگوں نے لکھنا چھوڑ دیا۔" یہ تحریک یا رجحان کون سا تھا اس کا نام لینے کی یہاں چنداں ضرورت نہیں۔ ہم آپ بخوبی سمجھتے ہیں۔ یہاں ہمارا مدعا اس سے صرف یہ ہے کہ اردو افسانے کی رفتار آج زیادہ سست ہے۔ خواہ ہمارے پاس کچھ کہنے کے لیے ہو یا نہ ہو ہم جس تحریک یا رجحان سے منسلک ہیں خواہ وہ کتنی ہی غلط اور ناکارہ ثابت ہو چکی ہو، یا ہم بالکل خالی الذہن ہو چکے ہوں اور کسی ٹین کے خالی ڈبے کی طرح ڈھن ڈھن کر رہے ہوں، پھر بھی بجتے ہی جائیں گے، کہ اس سے ہماری دانست میں ایک 'نغمہ' یا 'میوزک' تو پھوٹ رہا ہے۔ چہ خوش!

یہ اردو زبان کی عین خوش نصیبی ہے کہ اس کے فکشن کی ابتدا چند اہم اور یادگار داستانوں سے ہوتی ہے۔ ایسی داستانیں جن کے کردار، جن کے احوال اور جن کے واقعات آج بھی ضرب المثل ہیں اور یہ ہر زمانے میں جدید اردو فکشن کے لیے خام مواد کا کام دیتے رہے ہیں اور جن کی حیثیت آج قصۂ پارینہ ہونے کے باوجود ایندھن کی ہے۔ جن کے سہارے اور جن کے بل بوتے ہم آج بھی چاہیں تو اپنے اردو فکشن کی گاڑی کو آگے بڑھا سکتے ہیں۔ شرط صرف فراخ دل اور وسیع القلب ہونے کی ہے۔ ایسا وسیع القلب جو اس سرمائے کو قدیم اور از کار رفتہ کہہ کر اسے ایک طرف نہ ڈال دے یا بے کار محض سمجھ کر نہ چھوڑ دے بلکہ اس سے خاطر خواہ فائدہ اٹھائے۔

یہ بھی اردو کی خوش نصیبی ہے کہ جب ہم داستانی عہد کے بعد جدید فکشن کے عہد میں داخل ہوتے ہیں تو ہمیں پریم چند جیسا حقیقت پسند اور عقلیت پسند فکشن نگار نظر آتا ہے جو زمانے اور سماج کی بیشتر برائیوں کو متشکل کر کے کچھ اس طرح پیش کرتا ہے گویا یہ واقعات پردۂ سیمیں پر کسی فلم کی مانند چل رہے ہیں۔ پریم چند کے بعد بھی جدید افسانہ نگاروں کا ایک قافلہ نظر آتا ہے جو اردو افسانے میں بیش بہا اضافے کرتا ہے لیکن اس کے بعد بیسویں صدی کی چھٹی اور ساتویں دہائی میں اردو افسانہ چیستانی رجحان کا شکار ہو کر اپنے وجود اور بقا کی جنگ لڑتا نظر آتا ہے۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ اس جدوجہد میں اسے کامیابی ملتی ہے اور اردو افسانہ میں ایک بار پھر کہانی کی واپسی ہوتی ہے۔ لیکن اس کے باوجود یہ سوال اپنی جگہ کھڑا نظر آتا ہے کہ کیا اردو افسانہ یا فکشن اپنے دور اول اور دور دوم سے آگے کی جانب گامزن ہو سکا.....؟ (اگست 2010)

بامسلماں اللہ اللہ بابرہمن رام رام

مذہبی جنون، مسلکی اختلافات، ذات پات کی خرافات، رنگ ونسل کے امتیازات کے اس پرفتن دور میں ایک ایسے وسیع المشرب، فراخدل، تعصب سے پاک مسلک، ایک ایسے طریقے یا ایک ایسے راستے کی ضرورت محسوس ہوتی ہے جہاں بھی انسان مل جل کر آپسی اختلافات بھلا کر ایک ساتھ رہنے اور زندگی گزارنے کا منتر سیکھ سکیں، جو جیو اور جینے دو کے فلسفے پر عمل پیرا ہونے پر یقین کریں۔ مشکل یہ ہے کہ آج ہم پہلے مسلمان، ہندو، سکھ اور عیسائی اور اسی قبیل کے متعدد خانوں میں بٹے ہوئے ہیں لیکن انسانیت کیا چیز ہے اسے بھلا بیٹھے ہیں۔ جب کہ ضرورت اس بات کی ہے کہ ہم پہلے انسان ہونے کو ترجیح دیں، خالق تو ہمیں ایک انسان ہی پیدا کرتا ہے اب یہ ہم پر ہے کہ ہم اس نومولود کو کس رنگ میں ڈھال دیتے ہیں۔ ہم اس وقت تک پکے ہندو یا پکے مسلمان نہیں ہو سکتے جب تک ہم ایک اچھے انسان نہ بن جائیں۔

مذہبی جنون کے اس دور میں ہمیں ان صوفیا کی یاد آتی ہے جو مذہب ومسلک سے بالاتر ہو کر ایک سچا انسان اور ایک سیدھا سادہ بندۂ خدا بننے کا درس اپنے قول وعمل سے دیتے آئے ہیں۔ لیکن لفظ صوفی جتنا سادہ ہے اتنا ہی پر پیچ بھی۔ اسی طرح ایک صوفی کو سمجھنا جتنا آسان ہے اتنا ہی مشکل بھی۔ بظاہر یہ باتیں متضاد اور متنازعہ ہیں لیکن حقیقت کچھ ایسی ہی ہے۔ کہتے ہیں کہ مسجد نبویؐ میں ایک چبوترہ پر کچھ حضرات تزکیۂ نفس اور تصفیۂ ظاہر وباطن کے ساتھ اللہ کے ذکر اور اللہ کی مخلوق کی فکر میں ہمہ وقت مشغول رہا کرتے تھے۔ عربی میں چبوترہ کو صفہ کہتے ہیں۔ چنانچہ اسی مناسبت سے انہیں اہل صفہ کہا جانے لگا جو بعد میں لفظ صوفی کی شکل اختیار کر گیا۔ یہ حضرات واقعی صوفی باصفا تھے۔ ایک دوسری روایت کے مطابق یہ سادہ لوح حضرات کمبل اوڑھے اللہ کی یاد میں کچھ اس طرح مگن رہا کرتے تھے کہ انہیں سرد وگرم کا بھی احساس نہیں ہوتا تھا۔ کمبل یا اون کو عربی میں صوف کہتے ہیں یعنی یہ حضرات صوف والے یا کمبل والے تھے۔ کمبل سے مجھے یہاں ایک سچا

واقعہ یاد آتا ہے۔ بہار کے شہر مظفر پور میں ایک صوفی بزرگ آرام فرما ہیں جو اپنی زندگی میں ہمیشہ کمبل اوڑھے رہا کرتے تھے۔ چنانچہ ان کا نام ہی داتا کمبل شاہ پڑ گیا تھا۔ آج مزار کمبل شاہ مرجع خلائق بنا ہوا ہے۔ اسی طرح اکثر و بیشتر صوفیوں کو اسی مناسبت سے کمبل والے کے نام سے جانا جاتا ہے۔

اللہ والے صوفیا یا سنت ہر زمانے میں اور ہر دور میں موجود رہے ہیں جو بے غرض اور بے لوث ہو کر عوام کی خدمت اور اللہ کی عبادت کرتے آئے ہیں۔ یہ صوفیا دنیا کے ہر خطے اور ہر علاقے میں پائے جاتے رہے ہیں لیکن کہتے ہیں کہ ہندوستان صوفی سنتوں کی سرزمین ہے۔ یہاں ایک دو نہیں بلکہ سیکڑوں اور ہزاروں کی تعداد میں صوفیا پیدا ہوتے رہے ہیں جن میں حضرت نظام الدین اولیاء، خواجہ معین الدین چشتی، خواجہ بندہ نواز گیسو دراز، سرمد شہید، امیر خسرو، سنت روی داس، سنت کبیر، دادو دیال، میرا بائی، گرونانک، بلھے شاہ، نام دیو، رَیداس، غریب داس، چرن داس وغیرہ چند اہم نام ہیں۔ یہ صوفی سنت دلوں کو جوڑنے، انسان کو انسان سے ملانے اور محبت و اخوت کا پیغام دینے کا کام کرتے رہے ہیں۔ یہ صوفیا ''با مسلماں اللہ اللہ با برہمن رام رام'' کے فلسفے میں نہ صرف یقین کرتے آئے ہیں بلکہ اس کی تبلیغ و تشہیر کرنا اپنا فرض اولین سمجھتے آئے ہیں۔ ان کے پیش نظر ہمیشہ یہی رہا ہے:

تو برائے وصل کردن آمدی
نے برائے فصل کردن آمدی

یہ تو تھا لفظ صوفی کا عام اور سادہ پہلو۔ لیکن اس کا ایک دوسرا پہلو بھی ہے جو نہایت گنجلک اور پیچیدہ ہے۔ صوفی یا اللہ والوں کی ایک قسم وہ ہے جسے ہم مجذوب، دیوانہ، پاگل یا خبطی جیسے الفاظ سے نوازتے آئے ہیں کیونکہ ان حضرات کے اقوال و افعال یا حرکات و سکنات ایسے ہوتے ہیں کہ عام آدمی انہیں سمجھنے سے قاصر ہوتا ہے۔ چنانچہ انہیں ایسے القاب سے نواز دیا جاتا ہے۔ یہ صحیح ہے کہ دور اول کے صوفیا واقعی اللہ والے تھے اور اس میں شک کی کوئی گنجائش نہیں۔ چونکہ ان کا ظاہر اور باطن سبھی کچھ سمجھ میں آنے والا ہوتا تھا اور ان پر انگشت نمائی کی کوئی گنجائش نہیں ہوتی تھی۔ لیکن آج یہ معاملہ اتنا سیدھا سادہ اور آسان نہیں۔ آج بظاہر صوفی نظر آنے والا ایک شخص ڈھونگی اور دنیا دار ہو سکتا ہے اور ایک مجذوب، پاگل اور دیوانہ نظر آنے والا شخص بھی واقعی اللہ والا اور صوفی ہو سکتا ہے۔ یہ وہ مقام ہے جہاں قدم پھونک پھونک کر رکھنے کی ضرورت ہے۔ شریعت اور طریقت والا

معاملہ بھی ایک عام انسان کے لیے پریشانی کا سبب رہا ہے۔ اکبرالہٰ آبادی نے اسی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا ہے:

خلاف شرع شیخ تھوکتا بھی نہیں
مگر اندھیرے اجالے میں چوکتا بھی نہیں

اسی شریعت وطریقت کے بیچ مناقشے نے سرمد کو شہید کردیا۔ یہ ایک ایسا واقعہ ہے کہ سرمد جس نے **لاالٰـہ** کا ورد کیا اور قتل کیا گیا۔ قتل کرنے والا بھی اپنی جگہ درست اور صحیح کہ اس نے ظاہر یعنی شریعت پر عمل کیا اور قتل ہونے والا بھی اپنی جگہ درست کہ اس نے ابھی لاالٰہ کی منزل طے ہی نہ کی تھی چنانچہ وہ **الا اللہ** پر کیوں کر پہنچ سکتا تھا۔

سرمد کا معاملہ جتنا شریعت اور طریقت کی بھول بھلیوں میں الجھا معلوم ہوتا ہے اتنا ہی سیاست کی دلدل میں پھنسا ہوا نظر آتا ہے۔ بہرحال سرمد صوفی تھے یا نہیں یہ تو خدا ہی بہتر جانتا ہے، ہم تو صرف بحیثیت ایک عام انسان کے یہ معاملہ خدا پر چھوڑتے ہیں اور الا اللہ کی منزل پر پہنچنے کی تمنا ہی کرسکتے ہیں۔ منصور کے انا الحق والا معاملہ بھی کچھ ایسا ہی ہے۔

محفل سماع یا قوالی صوفیوں کا محبوب ترین شغل رہا ہے، جس میں وہ عالم وجد میں اپنے محبوب حقیقی کو ایک انوکھے انداز میں یاد کرتے آئے ہیں۔ دنیا و مافیہا سے بے خبر یہ صوفیا کچھ اس انداز میں رقص کرتے ہیں کہ انہیں اپنے آس پاس کی بھی خبر نہیں رہتی اور ایسا معلوم ہوتا ہے کہ وہ اپنے مالک حقیقی سے ہم آغوش محو گفتگو ہیں۔ کبھی کبھی ان صوفیوں کو حالت سماع میں 'عشرت قطرہ ہے دریا میں فنا ہو جانا' کی کیفیت سے دوچار بھی دیکھا جاسکتا ہے۔

صوفیوں کے عجیب وغریب حالات اور کیفیات خواہ وہ خدا اور بندہ کے درمیان دولہا اور دولہن کا تصور ہو یا صوفیوں کے عجیب وغریب فرقے ہوں یا مجذوب صفت بزرگ جو اپنی ناقابل فہم حرکات وسکنات سے ہمیں حیرت میں ڈالنے والے بلکہ پریشانی میں ڈالنے والے معلوم ہوتے ہیں، ہم ان پر کچھ ایسی ہی چیزیں پیش کررہے ہیں جن پر آپ کو اپنے ردعمل کے اظہار کا پورا حق حاصل ہے۔ ہم اپنی بات اس شعر پر ختم کرتے ہیں:

تردامنی پہ شیخ ہماری نہ جائیو
دامن نچوڑ دیں تو فرشتے وضو کریں

(ستمبر 2010)

انبار نہیں شاہکار چاہیے

شہنشاہ فکشن منشی پریم چند اردو ادب کے ایک گوہر نایاب ہیں۔ وہ نہ صرف ایک اچھے افسانہ نگار و ناول نگار تھے بلکہ ایک سماجی مصلح، ماہر تعلیم، مجاہد آزادی اور قلم کے سپاہی بھی تھے جو اپنے قلم سے سماجی برائیوں، غلط رسم ورواج اور ملک کی غلامی کے خلاف زندگی بھر جہاد کرتے رہے۔ ان کے سامنے ایک مقصد تھا، ایک ہدف تھا جس کو حاصل کرنے میں وہ بڑی حد تک کامیاب ہوئے۔ ان کے افسانے، ناول اور مضامین آج بھی ہمارے لیے مشعل راہ ہیں۔ انہیں نہ صلے کی پرواہ تھی اور نہ نام ونمود کی خواہش۔ وہ بس اپنا کام کرنے میں یقین رکھتے تھے۔ پریم چند کا نام افسانہ کے باب میں ایک دور کی حیثیت رکھتا ہے۔ پریم چند کے بعد کسی اور افسانہ نگار کو یہ سعادت حاصل نہیں اور آج تو افسانہ نگاروں کی ایک بھیڑ ہے اور ایسا محسوس ہوتا ہے کہ جسے بھی ذرا قلم چلانا آتا ہے وہ یا تو غزل کہتا ہے یا کہانی لکھتا ہے۔ ایسے میں کسی شاہکار کی امید کیسے کی جاسکتی ہے۔ البتہ خس وخاشاک کے انبار میں اضافہ پر فکر مند ضرور ہوا جاسکتا ہے۔

اردو افسانے پر لکھے گئے آج کل اگست 2010 کے اداریہ پر خاصا تیز وتند ردعمل کا اظہار ہوا ہے۔ یہ ردعمل خلاف توقع نہیں ہے۔ منفی اور مثبت اظہار رائے میں ایک بات واضح طور پر ابھر کر سامنے آئی ہے کہ جو حضرات افسانہ نویس ہیں انہیں ہماری بات کڑوی لگی اور انہوں نے ہم سے اختلاف کیا۔ اتفاق کرنے والے قارئین میں وہ حضرات شامل ہیں جو اچھی کہانی کے جویا ہیں۔ چنانچہ انہوں نے ہم سے اتفاق کیا کہ اردو افسانہ واقعی آگے کی طرف گامزن نہیں ہے۔ یعنی جدید تر اردو افسانے کے معیار اور وقار میں کوئی اضافہ نہیں ہو رہا ہے۔ البتہ اردو افسانے کے انبار میں اضافہ ضرور ہوا ہے۔

بیشک آج بھی اردو افسانے خاصی تعداد میں لکھے جارہے ہیں اور پڑھے بھی جارہے ہیں۔ اوران میں سے کئی افسانے اچھے بھی ہوتے ہیں۔ لیکن یہ تعداد آٹے میں نمک کے برابر ہے۔ اورآج بھی یہ افسانہ اپنے اس سفر کا منتظر ہے جسے ہم ترقی کے منازل طے کرنے سے تعبیر کرسکیں۔ اگست کے اداریے پر مشرف عالم ذوقی نے خاصا تلخ ردعمل کا اظہار کیا ہے۔ گرچہ انہوں نے اپنی تحریر کے بین السطور میں گوکہ دبی زبان میں ہی سہی ہماری بعض باتوں سے اتفاق کیا ہے۔ لیکن اختلاف کے سُر کچھ زیادہ ہی اونچے ہیں کہ وہ اس نئی پود سے تعلق رکھتے ہیں جن کے بارے میں ہم نے سوالیہ نشان لگایا تھا۔ اب بھلا انہیں ہماری یہ بات کیوں کر برداشت ہوسکتی تھی؟ لیکن ہمارا سوال ہنوز جوں کا توں قائم ہے کہ کیا اردو افسانہ ترقی کے منازل طے کررہا ہے؟ یا اردو فکشن آگے کی جانب گامزن ہے؟

آج بھی جب ہم اردو فکشن کی بات کرتے ہیں تو معیاری اور قابل ذکر افسانوں میں پریم چند، منٹو، بیدی، عصمت اور قرۃ العین حیدر کے علاوہ باحیات افسانہ نگاروں میں جوگندر پال، عابد سہیل، جیلانی بانو وغیرہ کے افسانے ہی قابل ذکر قرار پاتے ہیں۔ جنہیں ہم بلاشبہ اردو افسانے کے معمار کے طور پر پہچانتے ہیں اور جن کے ذکر کے بغیر اردو افسانے پر کوئی گفتگو مکمل نہیں سمجھی جاتی۔ پریم چند تو خیر ایور گرین ہیں۔ یہ وہ افسانہ نگار ہیں جن کے افسانے سے متاثر ہوکر دوسری زبانوں کے فکشن رائٹر بھی کچھ لکھنے پر مجبور ہوتے ہیں۔ اردو والوں میں عام تاثر یہ ہے کہ اردو کے بیشتر اصناف مغربی ادب سے متاثر ہیں۔ بلاشبہ یہ صحیح بھی ہے کہ اردو افسانہ اور ناول خاص طور پر مغرب کی دین ہے۔ ایسے میں جب ہم یہ دیکھتے ہیں کہ کوئی مغرب کا فکشن رائٹر ہمارے اردو افسانہ نگار کے تتبع میں کچھ لکھ رہا ہے تو یقیناً ہمیں خوشی محسوس ہوتی ہے۔ اردو فکشن کے معمار اول پریم چند کی کہانی 'دو بیل' ایک مشہور کہانی ہے۔ جو اردو سے پہلے ہندی میں 'دو بیلوں کی کتھا' کے عنوان سے ہنس اکتوبر 1931 میں شائع ہوئی۔ یہ کہانی پریم چند کی اور کہانیوں کے مقابلے کم مقبول ہوئی۔ لیکن ہمیں یہ دیکھ کر حیرت ہوتی ہے کہ اسی موضوع پر لکھی گئی ہند نژاد برطانوی ادیب جارج آرویل کی کہانی 'اینمل فارم' (Animal Farm) نہ صرف از حد مقبول ہوئی بلکہ یہ اس فکشن رائٹر کی پہچان بھی بن گئی۔ یہ طویل کہانی جسے ناولٹ سے موسوم کیا گیا بلاشبہ اس کا مرکزی

خیال پریم چند کے افسانے دو بیل سے ہی ماخوذ ہے۔ جس کا ذکر یا اعتراف جارج آرویل یا کسی مغربی نقاد نے نہیں کیا ہے۔ ہم یہ بات اتنے وثوق سے اس لیے کہہ سکتے ہیں کہ جارج آرویل کی یہ تخلیق اینمل فارم 1945 میں منظر عام پر آتی ہے جب کہ پریم چند کی تخلیق 1931 میں ہی عالم وجود میں آچکی ہوتی ہے۔ یعنی جارج آرویل کی اس تخلیق سے پورے چودہ پندرہ سال پہلے۔ دونوں ہی تخلیق کار سامراج وادی اور تاناشاہی طاقتوں کی پرزور مخالفت کانجی ہاؤس یا باڑے میں بند جانوروں کی دنیا کے ذریعے کرتے ہیں اور دونوں ہی اپنے مقصد اور پیش کش میں پوری طرح کامیاب ہیں۔ لیکن کہانی کی پیش کش اور کرافٹ میں کسی بھی طور پر پریم چند کا 'دو بیل' جارج آرویل کے 'اینمل فارم' سے اگر برتر نہیں تو کمتر بھی نہیں ہے۔ جارج آرویل کا یہ ناولٹ شاید اس لیے زیادہ مشہور ہوا کہ وہ انگریزی میں لکھا گیا اور انگریزی کے وسیلے سے دنیا کی مختلف زبانوں میں اس کا ترجمہ بھی ہوا۔ جب کہ پریم چند کا افسانہ ہندی اور اردو میں ہی شائع ہو سکا اور شاید اسی وجہ سے عالمی سطح پر وہ مقبولیت حاصل نہ کر سکا۔ باوجود اس کے ایسا محسوس ہوتا ہے کہ جارج آرویل اس افسانے کو نہ صرف پڑھتے ہیں بلکہ اس کا اثر بھی قبول کرتے ہیں اور اس موضوع پر ایک طویل افسانہ پیش کرتے ہیں جو ان کا شناخت نامہ بن جاتا ہے۔

یہ کیسی ستم ظریفی ہے کہ جس چیز کو خود اپنے گھر میں قابل اعتنا نہیں سمجھا جاتا اسی چیز کو گھر کے باہر کا ایک جوہری اس کے جوہر کو نہ صرف پہچانتا اور پرکھ لیتا ہے بلکہ اسی چیز کو اپنے فن کی خراد مشین پر کچھ اس طرح صیقل کرتا ہے کہ وہ کندن کی مانند چمکا کر اسے گوہر آبدار بنا دیتا ہے۔ اور یہ گوہر آبدار اس جوہری کی شناخت بن جاتا ہے۔ یہ ہم اردو والوں کے لیے ایک لمحۂ فکریہ ہے کہ ہم اپنی اچھی اور کارآمد چیزوں کی قدر نہیں کرتے اور ظاہری چمک دمک والی چیزوں پر نہ صرف ریجھ جاتے ہیں بلکہ اسے ہی اصلی سونا سمجھ بیٹھتے ہیں۔ نئی نسل کے تخلیق کار کو اس بات پر ٹھنڈے دل و دماغ سے سوچنے سمجھنے اور اس پر عمل کرنے کی سخت ضرورت ہے۔ یہ نہ صرف پریم چند کے تئیں ہماری سچی شردھانجلی ہوگی بلکہ ہماری سچی کامیابی کی کنجی بھی۔

(اکتوبر 2010)

ترانے کے تخلیق کار

ترانے کسی بھی قوم یا ملک کی رگوں میں گرم خون کی حیثیت رکھتے ہیں۔ جسم میں خون کا انجماد نہ ہو اس لیے موقعہ بہ موقعہ ترانے پڑھنے کا سلسلہ جاری رہتا ہے۔ اقبال اور ٹیگور کے ترانے آزاد ہندوستان کی رگوں میں خون دوڑانے کا مقدس فریضہ انجام دیتے آرہے ہیں۔ کوئی بھی قومی تہوار یا سرکاری تقریب ہو "سارے جہاں سے اچھا....." اور "جن گن من....." کے بغیر اس کی تکمیل نہیں ہوتی۔ ان ترانوں سے ہمیں یقیناً ایک نیا جوش، ایک ولولہ اور ایک نئے عزم کے ساتھ آگے بڑھنے کی تحریک ملتی ہے۔

ترانوں کے خالق اقبال اور ٹیگور ہندوستانی ادب کے دو ایسے درخشاں ستارے ہیں جو آسمان دانش وادب پر ہمیشہ چمکتے رہیں گے اور مابعد کے ادیبوں کی رہنمائی کرتے رہیں گے۔ ٹیگور گو کہ بنگلہ کے ادیب تھے لیکن ان کے ادب وشاعری نے عالمی سطح پر جو اثرات مرتب کیے وہ عدیم المثال اور لازوال ہیں۔ بلاشبہ 1913 میں نوبل انعام کی تحصیل نے ان کی شہرت کو بام عروج پر پہنچا دیا تھا۔

ان دنوں ربندر ناتھ ٹیگور کی پیدائش کا ڈیڑھ سو سالہ جشن منانے کا سلسلہ جاری ہے۔ یقیناً یہ اس عظیم ادیب وشاعر کو شردھانجلی اور خراج عقیدت پیش کرنے کا سلسلہ ہے جو سال بھر تک چلتا رہے گا۔ اس پورے ایک سال میں ہم ان کی شاعری، فکشن، ڈرامے، موسیقی، مصوری اور ان کی لازوال پینٹنگ پر نہ صرف ایک بار پھر غور وخوض کریں گے بلکہ اس کی از سر نو تشریح وتعبیر بھی کی جائے گی۔ رابندر ناتھ ٹیگور اپنی ذات میں ایک انجمن تھے اور اس انجمن میں علم وادب کا فیضان عام تھا۔ وشو بھارتی یونیورسٹی اور شانتی نکیتن اس انجمن کی زندہ وپائندہ شکل ہے، جو علم وآگہی کے موتی لٹا رہا ہے۔

گیتانجلی تو ان کا لازوال شاہکار ہے، جو اپنی تخلیق کے بعد سے ہی ہر زمانے میں پسندیدگی کی نظر سے دیکھا جاتا رہا ہے۔ ٹیگور بنگلہ ادب کا اتنا بڑا اور نا قابل عبور چٹان ہے جس کو سر کرنا آج کے ادیب کے لیے مشکل دکھائی دے رہا ہے۔ اس لحاظ سے کہا جا سکتا ہے کہ بنگلہ ادب کو اگر آگے بڑھنا ہے تو اس سنگ میل کو پار کرنا ہی ہوگا۔

ٹیگور ایک ایسا شاعر ہے جن کی دو تخلیقات دو ملکوں کے ترانے کے طور پر مقبول و معروف ہوئیں۔ یعنی 'جن گن من' ہندوستان کے لیے اور 'امار شونار بانگلہ' بنگلہ دیش کے لیے۔ اقبال نے ٹیگور کی اس حیثیت کو دیکھتے ہوئے انہیں 'بلبل ادب' کے نام سے پکارا تھا۔ جب کہ ٹیگور نے اقبال سے اپنا موازنہ نہ کرنے کی صلاح دیتے ہوئے کہا تھا کہ میں اپنی مادری زبان بنگلہ میں لکھتا ہوں جب کہ وہ اپنی مادری زبان پنجابی میں نہ لکھ کر اردو میں لکھتے ہیں۔ جواب میں اقبال نے کہا تھا کہ ان کی زبان پوری طرح ترقی یافتہ ہے جب کہ میری نہیں، پھر ٹیگور نے کہا کہ میری زبان ترقی یافتہ نہیں تھی بلکہ میں نے اسے ترقی یافتہ بنایا۔ خیر یہ ایک الگ بحث ہے۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ دونوں عالمی ادب کی نامور ہستیاں ہیں اور دونوں ہی ہندوستانی ادب کے معمار اور ہندوستانی ادب کی شناخت ہیں۔

ٹیگور کی طرح اقبال بھی اردو کا وہ شاعر ہے جو عالمی سطح پر اپنے اثرات پچھلے سو سال سے مرتب کرتا رہا ہے۔ اقبال کی حیثیت شاعرِ مشرق کی رہی ہے اور ان کی اس حیثیت کو دھندلا کرنے کے لیے مختلف قسم کے بیانات جو زیادہ تر الزام اور بہتان کے زمرے میں آتے ہیں ان پر لگائے جاتے رہے ہیں۔ ہم کہہ سکتے ہیں کہ ان کے خلاف سازشوں کا ایک سلسلہ ہے جو ان کی موت کے بعد سے ہی شروع ہوا اور آج بھی اسی شدت سے جاری ہے۔

جس شخص نے 'ترانہ ہندی' جیسا لازوال اور شاہکار ترانہ دیا ہو جس کو سن کر آج بھی رگوں میں خون جوش مارنے لگتا ہے اور لب خود بخود اس ترانے کے بول گنگنانے لگتے ہیں۔ اس پر بھلا کیوں کر دیش دروہ کا الزام عائد کیا جا سکتا ہے۔

سارے جہاں سے اچھا ہندوستاں ہمارا

ہم بلبلیں ہیں اس کی یہ گلستاں ہمارا

اسی طرح اس ترانے کے سارے اشعار وطن عزیز ہندوستان جنت نشان کے قصیدے سے

بھرے ہوئے ہیں۔ بلکہ یہ آج کے پس منظر میں جب کہ مذہبی تعصب اور جنون ، بات بات پر ایک دوسرے سے دست وگریباں ہونا ہماری فطرت ثانیہ بن چکی ہے، ایسے ماحول میں اس ترانے کا یہ شعر کہ:

مذہب نہیں سکھاتا آپس میں بیر رکھنا
ہندی ہیں ہم وطن ہے ہندوستاں ہمارا

ہمیں درس انسانیت دیتا نظر آتا ہے۔ یہ شعر اپنی تخلیق (1905) سے لے کر آج تک پوری قوم اور پورے وطن کو ایک سوتر میں باندھنے کا فریضہ انجام دیتا نظر آرہا ہے۔ آج تک اس ترانے کی سی مقبولیت لاکھ کوششوں کے باوجود کسی اور ترانے کو میسر نہیں آسکی ہے اور آئندہ بھی اس کے آثار نہیں دکھتے کہ اس کے مدمقابل کوئی اور ترانہ جگہ لے سکے۔

ترانۂ ہندی تو صرف ایک مثال ہے۔ اقبال کے دیگر بیشتر فن پارے بھی شاہکار کی حیثیت رکھتے ہیں اور اقبال کے اثرات بعد کے شاعروں پر زبردست طریقے سے مرتب ہوئے ہیں۔ لیکن اقبال کی سی خوش نصیبی اب تک کسی اور شاعر کو حاصل نہیں ہوسکی۔ یوں بھی تتبع آسان نہیں۔ نقل کی اور بات ہے اور وہ بھونڈی بھی ہوسکتی ہے۔ بہر حال بعد کے شاعروں میں جوش، فیض، سردار جعفری، کیفی اعظمی، ن۔م۔ راشد اور عمیق حنفی اور دیگر شعرا نے اقبال کے فکروفن، انداز وآہنگ کی نقل کی بہت کوششیں کیں اور وہ کسی حد تک کامیاب بھی ہوئے، لیکن سورج کی روشنی کے سامنے چراغ کی ٹمٹماتی لو بھلا کتنی ہوسکتی ہے۔

نقل اور پیروی یا تتبع ہم کر بھی لیں تو بھی اس سے کیا حاصل کہ ہم اس ہدف کو آج بھی چھو نہیں سکے ہیں جو اقبال مقرر کر گئے تھے یا ان سے پہلے میرؔ اور غالبؔ نے اردو شاعری کو جس بلندی تک پہنچایا تھا۔ یہ صحیح ہے کہ آج زبوں حالی کے اس دور میں بھی سیکڑوں بلکہ ہزاروں کی تعداد میں شعرا شاعری کر رہے ہیں۔ لیکن ہمیں یاد رکھنا چاہئے کہ ہمارا ہدف اردو شاعری کے ان معماروں نے جو مقرر کیا ہے ہمیں اس سے آگے بڑھنا ہے جبھی ہم اردو شاعری میں قابل قدر اضافہ کو انجام دے سکیں گے۔

(نومبر 2010)

شاعری: لہو میں گردش کا احساس

کارخانۂ قدرت کا ایک بنیادی اصول زندگی اور موت کے بیچ کشمکش رہا ہے۔ جس میں جیت بہرحال موت کی ہی ہوتی ہے۔ موت برحق ہے یعنی جس ذی نفس کا ورودِ مسعود اِس جہان فانی میں ہوا ہے وہ ایک دن اُس لافانی جہاں کے سفر پر لازماً رخصت ہوگا جہاں کوئی موت نہ ہوگی۔ مختصر یہ کہ ہر نفس کو اس دنیا میں موت کا مزہ چکھنا ہے:

موت سے کس کو رستگاری ہے
آج وہ کل ہماری باری ہے

ابھی ہم محمد حسن، یعقوب میراں مجتہدی، وزیر آغا، عاشور کاظمی وغیرہ کا سوگ منا کر فارغ بھی نہیں ہوئے تھے کہ اردو کے مشہور و ممتاز ادیب، محقق، انشا پرداز اور ماہر لسانیات علی گڑھ مسلم یونیورسٹی میں پروفیسر ایمریٹس مسعود حسین خاں کا 16 اکتوبر کو علی گڑھ میں انتقال ہوگیا۔ وہ 92 سال کی طویل عمر کے سبب تقریباً گوشہ نشینی کی کیفیت سے دوچار تھے۔ لیکن انہوں نے ایک بھرپور علمی اور ادبی زندگی گزاری تھی اور اپنی زندگی کو ایک بامقصد، باحوصلہ اور پرعزم زندگی کے طور پر نمایاں اور منفرد کیا تھا۔ مرحوم کے پسماندگان میں ایک بیٹا اور چار بیٹیاں ہیں۔ مسعود حسین خاں کا تعلق اتر پردیش کے مردم خیز علاقہ ضلع فرخ آباد کے قائم گنج سے تھا۔ یہ علاقہ خاص پٹھانوں کے لیے جانا جاتا ہے اور اسی مناسبت سے فرخ آبادی پٹھان ایک اصطلاح کی شکل اختیار کر چکا ہے۔ اس علاقے میں سابق صدر جمہوریہ ڈاکٹر ذاکر حسین سمیت سیکڑوں افراد اپنی بیش بہا خدمات کے سبب نمایاں مقام کے حامل بن چکے ہیں۔ مسعود حسین خاں ان میں ایک ایسی ہی نمایاں اور منفرد شخصیت کا نام ہے۔ جن کی شخصیت جاذب نظر اور وجیہ و شکیل تھی۔ وہ جم غفیر میں

بھی بڑی سے بڑی مجلس اور محفل میں اپنی انفرادیت کے سبب نمایاں نظر آتے تھے۔ گورے چٹے تو تھے ہی، لمبے اور قد آور اصلی پٹھان تھے۔ بردباری اور تحمل ان کی شخصیت کا ایک نمایاں اور اہم پہلو تھا۔ ان کی اس ظاہری شکل وشباہت کا اثر ان کی علمی، ادبی اور سماجی زندگی پر بھی صاف دکھائی دیتا تھا۔ جن کی پیدائش فرخ آباد کے قائم گنج میں 28 جنوری 1919 کو ہوئی۔ یقیناً ان کی پیدائش سے ان کے وطن عزیز فرخ آباد کو ایک اور نامور سپوت ملا۔ جس نے آگے چل کر نہ صرف اپنے وطن بلکہ اپنے ملک وقوم کا نام بھی روشن کیا۔ حسب روایت ان کی بھی ابتدائی تعلیم آبائی وطن میں ہوئی۔ البتہ اعلیٰ تعلیم کے لیے انہوں نے علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کا رخ کیا۔ کچھ اس طرح کہ پھر وہیں کے ہو کر رہ گئے۔ انہوں نے علی گڑھ سے 1941 میں ایم اے اور 1945 میں پی ایچ ڈی کی ڈگریاں حاصل کیں۔ خاندانی ناموری اور ذاتی خوش بختی قدم قدم پر ان کی راہ میں کامیابی کے چاند ستارے بچھاتی رہی۔ چنانچہ اپنے کیریئر کے اعلیٰ ترین مقام پر وہ جامعہ ملیہ اسلامیہ نئی دہلی اور جامعہ اردو علی گڑھ کے شیخ الجامعہ کی حیثیت سے فائز ہوئے۔ زمانے کے حسب دستور انہیں بھی انعامات واکرامات سے نوازا جاتا رہا۔ لیکن وہ ان انعامات واکرامات کے پیچھے کبھی بھاگے نہیں اور نہ ان کے لیے تگ ودو اور جوڑ توڑ کی، جیسا کہ عام روش ہے۔ اس سال دہلی اردو اکادمی نے اپنے اعلیٰ ترین اعزاز بہادر شاہ ظفر ایوارڈ سے سرفراز کیا تھا۔ لیکن ان کی پہچان ان انعامات سے پرے ان کی تحقیق وتدوین، تنقید، دکنیات، لسانیات، تاریخ زبان اردو، لغت نویسی اور ادبی صحافت سے ہے۔ اور یہی پہچان انہیں تادیر اردو زبان میں زندہ رکھے گی۔

مسعود حسین خاں کو عام طور پر پیشے کے اعتبار سے ادب کے استاد کے طور پر جانا جاتا رہا ہے۔ اور اس میدان میں انہوں نے اپنی ایک خاص چھاپ بھی چھوڑی ہے۔ آج ان کے شاگردوں کی ایک بڑی تعداد مختلف جگہوں پر نمایاں مقام پر فائز ہے۔ لیکن وہ نرے استاد ادب نہیں تھے بلکہ انہوں نے ادب کے کچھ خاص شعبوں میں بھی اپنی ایک پہچان بنائی تھی۔ لسانیات کا شعبہ ان میں سے ایک ہے جس کی طرف جب انہوں نے توجہ کی تو اس میں بھی اپنا ایک نقش قائم کیا۔ مسعود حسین خاں اردو کے ان چند ادیبوں میں سے ایک ہیں جنہوں نے ہندوستان اور ہندوستان سے باہر لسانیات کی باقاعدہ تعلیم حاصل کی۔ ان کی کتاب A Phonetic and

Phonetical study of the world اس شعبے میں ایک اہم کارنامہ ہے۔ جسے ہر ذی علم قدر اور رشک کی نظر سے دیکھتا ہے۔ وہ انجمن ترقی اردو ہند کے ترجمان 'ہماری زبان' اور 'اردو ادب' کے ایڈیٹر بھی رہے۔ اور یہاں بھی انہوں نے اعلیٰ ادبی صحافتی ذوق کا مظاہرہ کیا۔ انہوں نے ایڈیٹر کی حیثیت سے اردو تحریک اور اردو مسائل پر جو کچھ لکھا وہ ان کے مخلص، فعال اور متحرک ہونے پر دال ہے۔

پیش نظر شمارہ میں ہم چند نوجوانوں کے مختلف موضوعات پر مضامین دے رہے ہیں جن میں غزل کے موضوع پر دو مضامین بھی شامل ہیں۔ یہ دونوں مضامین تنقیدی اور تحقیقی نوعیت کے ہیں۔

صورت حال یہ ہے کہ آج اردو کے نام پر شاعری اور شاعری کے نام پر مشاعرہ بازی اور ان مشاعروں میں غزل گوئی عام ہے اور ایک طرح سے غزل اردو کی شناخت بن گئی ہے۔ یوں تو غزل شروع سے ہی یعنی میرؔ اور غالبؔ کے پہلے سے ہی اردو کا شناخت نامہ بنی ہوئی ہے۔ یہ غزل جس کو میرؔ نے دردو عشق کا وسیلہ بنایا اور جس کو غالبؔ نے عروج پر پہنچایا، وہ غزل آج بھی اسی روانی اور رفتار کے ساتھ رواں دواں ہے۔ یہ کہنے کی چنداں ضرورت نہیں کہ آج اردو میں چھپنے والی 100 کتابوں میں سے 90 کتابیں شاعری پر ہوتی ہیں اور ان میں سے بیشتر شعری مجموعے غزلوں سے آراستہ ہوتے ہیں۔ رسائل کو موصول ہونے والی ڈاک کا بھی کچھ یہی حال ہوتا ہے۔ صورت حال یہ ہے کہ آج غزل گوئی سے زیادہ غزل گردی ہو رہی ہے۔ ہمیں اس صورت حال پر سنجیدگی سے غور کرنا ہوگا۔

مسعود حسین خاں نے منہ کا مزہ بدلنے کے لیے شاعری بھی کی تھی لیکن ان کا کہنا تھا کہ شاعرانہ فکر ضروری نہیں کہ وقیع ہو، فلسفیانہ ہو، مگر اس میں لہو کی گردش ضروری ہے۔ شاید اسی لیے انہوں نے اپنے ابتدائی دور میں شاعری کی لیکن جلد ہی وہ اس سے کنارہ کش ہو گئے کہ انہیں اپنی شاعری میں لہو کی گردش کا احساس نہیں ہوا۔ آج کے شعرا کو مسعود حسین خاں کے اس قول اور رویہ پر غور کرنا چاہئے۔ عرفان صدیقی نے کہا ہے:

اپنے لہو کے شور سے تنگ آچکا ہوں میں
کس نے اسے بدن میں نظر بند کر دیا

(دسمبر 2010)

نیا سال، نیا عزم

نیا سال مبارک ہو۔ آیئے اس نئے سال میں ہم عہد کریں کہ اپنے اعمال، افعال اور اقوال سے اپنے ملک وقوم کی خدمت کریں گے۔ ہم مختلف شعبہ ہائے زندگی سے تعلق رکھنے والے افراد اپنے اپنے شعبے میں نیک نیتی اور ایمانداری سے نہ صرف کام کریں گے بلکہ انتہائی مخلصانہ طور پر اس کی تاکید وترغیب بھی کریں گے۔ آج ہمارا سماج بہت زبردست اتھل پتھل کا شکار ہے۔ لوگ مختلف علتوں کے شکار ہیں، ایسے میں بطور خاص ہم ادب والوں کی ذمہ داری بنتی ہے کہ اپنے ادب پاروں سے اپنے معاشرے کی اصلاح اور اسے سجانے سنوارنے کا کام لیں۔ ذاتی مفاد، منفعت، تعصب اور تنگ نظری سے اوپر اٹھ کر ایک مثبت اور پازیٹیو انرجی کے ساتھ ہمیں یہ کام کرنا ہوگا جبھی ہم کامیاب ہو سکتے ہیں اور دلوں کے بیچ فاصلے اور خلیج پاٹ سکتے ہیں۔ یاد رکھیں جو دلوں کو فتح کر لے وہی فاتح زمانہ ہوتا ہے۔

سال گزشتہ ہم نے عالمی سطح پر ہو رہے اتھل پتھل کا مشاہدہ کیا اور اس سے ہمیں بہت کچھ سیکھنے، سمجھنے اور عمل کرنے کا موقع ملا۔ ہم اپنی غلطیوں سے بہت کچھ سیکھتے ہیں۔ چنانچہ ہماری کوشش ہوتی ہے کہ ہم ان غلطیوں پر نہ صرف نظر رکھیں بلکہ اس پر خود احتسابی کے کرب سے گزرنے کی بھی کوشش کریں تاکہ ہمیں آئندہ کون سے منفی کام نہیں کرنے ہیں اور کون سے مثبت کام کرنے ہیں اس کا فیصلہ کرنے میں آسانی ہو۔

پچھلے سال ہم نے آج کل کے صفحات پر اسی مثبت سوچ کے ساتھ کھلے مباحث کا آغاز کیا تھا اور کوشش کی تھی کہ ادب کے مختلف اصناف اور مختلف پہلوؤں پر نہ صرف مقالہ نگار، کہانی کار، شعرا اور مبصرین حصہ لیں بلکہ قارئین بھی اس میں پورے طور پر شریک ہوں۔ ہمیں خوشی ہے کہ ہم

بڑی حد تک اپنے اس مقصد میں کامیاب بھی ہوئے۔قارئین نے ان مباحث کے ہر دو پہلو پر کھل کر اظہار خیال کیا اور بہت سی باتیں واضح ہو کر ہمارے سامنے آئیں لیکن وہیں ہمیں اس بات کا دکھ بھی ہے کہ بعض حضرات نے ان مباحث کو اپنی پر پیچ باتوں اور منفی سوچوں سے الجھانے کی کوشش کی۔ایسے حضرات نے منطقی باتوں پر فلسفیانہ سوچ کو ترجیح دی۔شاید ایسی بحث کے لیے ہی شاعر نے کہا ہے:

فلسفی کو بحث کے اندر خدا ملتا نہیں
ڈور کو سلجھا رہا ہے اور سرا ملتا نہیں

خیر! آج ہم اردو والوں کو کچھ اچھی اور خوش کن خبریں دینا چاہتے ہیں۔اردو کے تعلق سے معروف اردو نواز کامنا پرساد نے اردو اور جدید ہندوستان کے موضوع پر ایک دستاویزی فلم تیار کی ہے جس میں اردو کے مستقبل اور اس کی بقا کے تعلق سے باتیں کی گئی ہیں۔موجودہ ہندوستانی نسل اردو کی بقا کی ضامن ہے اور آج کا سچ یہ ہے کہ ہندوستان میں ہر طرف اردو کا بول بالا ہے۔ان خیالات کا دستاویزی اظہار اردو کے عہد بہ عہد سفر کا احاطہ کرنے والی ڈاکومینٹری فلم 'اردو اور جدید ہندوستان' کی نمائش میں کیا گیا جس کے ذریعہ رسم الخط اور دوسری تمام سرحدوں کو عبور کرتی اس زبان کو زندگی کے ہر شعبہ میں رواں دواں دکھانے کی کوشش کی گئی۔وزارت خارجہ سفارت کاری کے شعبہ کے لیے یہ دستاویزی فلم اردو کے لیے عملی اقدام کی قائل کامنا پرساد نے تیار کی ہے۔اس موقع پر اقلیتی امور کے وزیر سلمان خورشید نے کہا کہ اردو کے تعلق سے وہ آج بکھرے حقائق کو یکجا دیکھ کر اسی طرح خوش ہیں جس طرح کسی کو اپنے گھر میں کچھ ایسی دستاویزات مل جائیں جن سے پتہ چلے کہ وہ اور بھی جائیداد کا مالک ہے۔انہوں نے کہا کہ اردو ہماری توجہ کی مستحق ہی نہیں بلکہ متوجہ کرنے والی زبان بھی ہے۔

مرکزی وزیر مملکت سلمان خورشید کے تحریر کردہ انگریزی ڈرامہ سنس آف بابر (بابر کی اولاد) کو فکی آڈیٹوریم میں اسٹیج کیا گیا جس میں مغلیہ دور کو آج کے سیاسی، سماجی اور لسانی تناظر میں پیش کرنے کی شاندار کوشش کی گئی۔یہ ڈرامہ اصل میں ہندوستان کو سمجھنے کی کوشش ہے۔جس میں مغل شہنشاہ بابر، اکبر، جہانگیر، شاہجہاں اور اورنگ زیب سے ہوتے ہوئے بہادر شاہ ظفر تک کی

تاریخ کے اہم واقعات کو بہت خوبصورتی سے آج کے تناظر میں پیش کرنے کی سعی کی گئی ہے۔ڈرامہ کے ذریعہ مختلف مذاہب اور مختلف زبانوں والے اس ملک میں موجود تنازعات کے تناظر میں اتحاد واتفاق کا پیغام بھی دیا گیا ہے۔

پچھلے 14-13-12 نومبر کو غالب انسٹی ٹیوٹ میں خسرو پر ایک تین روزہ سمینار کا انعقاد ہوا جس میں امیر خسرو کے فن اور شخصیت کے مختلف پہلوؤں پر بھرپور بحث ہوئی۔ حقیقت یہ ہے کہ امیر خسرو ہندی اردو کا نقاش اول ہے۔ پروفیسر گوپی چند نارنگ نے 30 نومبر کو جامعہ ملیہ اسلامیہ میں اس موضوع پر مدلل اور عالمانہ گفتگو کی۔

امیر خسرو اردو کی عوامی جڑوں اور ہندوستانی تہذیب کے جلوہ صدرنگ کے بہترین ترجمان تھے۔ پروفیسر نارنگ نے اپنے خطبہ میں کہا کہ امیر خسرو کے ہندوی میں شعر کہنے کی سب سے اہم شہادت ان کے فارسی دیوان غرۃ الکمال کے دیباچے میں ملتی ہے جس میں دو شعر ہندوی کی تعریف میں ہیں اور ایک شعر ایسا ہے جو ہندی اور فارسی دونوں طرح پڑھا جاسکتا ہے۔ ان کے فارسی کلام میں بھی ایسی شہادتیں موجود ہیں جن کی بنا پر ان کے ہندوی شاعر ہونے سے انکار کرنا انصاف پر مبنی نہ ہوگا۔ انہوں نے مثنوی تعلق نامہ اور رباعیات پیشہ وران کی مثالیں دیں۔ انہوں نے کہا کہ سب سے قوی عوامی روایت کی شہادت ہے جس سے پچھلے سات سو سالوں سے امیر خسرو ہندوستان کے اجتماعی حافظے کا بدستور حصہ بنے ہوئے ہیں۔ یہ شرف کسی دوسرے شاعر کو حاصل نہ ہوا۔ ان کی پہیلیاں، دوہے، دوسخنے، جھولا، منڈھا، ساون، بسنت، قوالیاں اور راگ راگنیوں کے بول آج تک گائے جاتے ہیں اور عوام ان پر سر دھنتے ہیں۔ انہوں نے کہا کہ امیر خسرو کے ہندوی شاعر ہونے کی پہلی اطلاع ڈاکٹر اشپرنگر نے دی۔ خطبے کے دوران ڈاکٹر نارنگ نے اس نادر قلمی نسخے کی بعض پہیلیوں کا داخلی وفنی تجزیہ کرکے بتایا کہ کس طرح یہ کلام امیر خسرو کی خلاقی کی ترجمانی کرتا ہے۔ نیز یہ کہ اردو ہندی کے رشتوں، عوامی جڑوں اور ان کے ارتقا بلکہ ہندوستانی تہذیب کی امن پسند روح کو سمجھنے کے لیے امیر خسرو کے ہندوی کلام کی معنویت کو سمجھنا بہت ضروری ہے۔

(جنوری 2011)

ہم پرورشِ لوح وقلم کرتے رہیں گے

پچھلی صدی کے تیسرے دہے میں جب اختر حسین رائے پوری کلکتہ کے ہندی ہفت روزہ وشوامتر میں اخبار نویس تھے اور انہوں نے مضمون "ساہتیہ اور کرانتی" لکھا تو ہندوستان میں انقلابی تحریک کی داغ بیل پڑ گئی۔ پھر جب تیس کے دہے کے ابتدائی برسوں میں ملک سے باہر سجاد ظہیر سوشلسٹ نظریات سے متاثر ہوئے اور اختر حسین رائے پوری مسلم یونیورسٹی آئے تو سوشلسٹ خیالات نے وہاں کے طلبہ کو اپنی طرف کھینچا۔ تب مجاز بی اے کے طالب علم تھے۔ وہ اختر رائے پوری کے حلقے میں آئے اور انہوں نے نظم 'رات اور ریل' لکھی۔ رومان میں انقلاب کی دھاریاں آنے لگیں۔ اس زمانے میں ان کی ایک نظم کا یہ شعر بہت مشہور ہوا۔

ترے ماتھے پر یہ آنچل بہت ہی خوب ہے، لیکن
تو اس آنچل سے اک پرچم بنالیتی تو اچھا تھا

معین احسن جذبی آگرہ میں مجاز کے ہم جماعتوں میں سے تھے اور فانی بدایونی کے حلقۂ تلامذہ میں دونوں تھے۔ جذبی بھی سوشلزم کے حلقے میں آئے اور انہوں نے کہا:

جب جیب میں پیسے ہوتے ہیں، جب پیٹ میں روٹی ہوتی ہے
اس وقت یہ پتھر ہیرا ہے، اس وقت یہ آنسو موتی ہے

دکن میں مخدوم محی الدین اور پنجاب میں فیض احمد فیض نے بھی یہی رنگ سخن اپنایا۔

سوشلزم کے تصور نے شاعری میں جڑ پکڑنا شروع کی۔ حقیقت یہ ہے کہ حالی نے اردو شاعری میں جو بنا ڈالی تھی، یہ اسی روش کا اگلا مرحلہ تھا۔

بیسویں صدی کے اردو ادب میں ڈاکٹر محمد اقبال کا اقبال سب سے بلند نظر آتا ہے اور ان

کے بعد کسی ایک شخص پر اگر نظر ٹھہرتی ہے تو وہ فیض ہیں جو انقلابی شاعر کی حیثیت سے اپنی ایک خاص پہچان بناتے ہیں۔

مقام فیض کوئی راہ میں جچا ہی نہیں
جو کوئے یار سے نکلے تو سوئے دار چلے

بلاشبہ فیض کی شخصیت اور ان کا فکروفن انہی دو انتہاؤں یعنی 'کوئے یار سے سوئے دار تک' سے عبارت ہے۔ یعنی ان کی شاعری میں اگر ذکر جاناں ہے تو دوسری طرف فکر زمانہ بھی ہے۔

فیض 13 فروری 1911 کو غیر منقسم ہندوستان یعنی متحدہ ہندوستان کے شہر سیالکوٹ میں پیدا ہوئے۔ مگر جب یہی ہندوستان آزاد ہوا اور وطن عزیز تقسیم ہوا، جس کے نتیجے میں فرقہ واریت کی بنیاد پر خون خرابہ ہوا تو فیض بلبلا اٹھے اور آزادی کو اس صورت میں قبول کرنے میں انہیں تامل ہوا۔ انہوں نے اپنے اس احساس کا اظہار اپنی نظم میں کچھ اس طرح کیا:

یہ داغ داغ اجالا یہ شب گزیدہ سحر
وہ انتظار تھا جس کا یہ وہ سحر تو نہیں

بلاشبہ ان کے معاصرین اور بہت سے ان کے رفقائے تحریک ان کے اس خیال سے اتفاق نہ کر سکے۔ لیکن اس شب گزیدگی سے بھلا کسے انکار ہو سکتا تھا۔

فیض کی ابتدائی تعلیم روایت کے مطابق محلّہ کی مسجد میں مذہبی تعلیم سے شروع ہوئی۔ اس کے بعد وہ سیالکوٹ کے اسکاچ مشن اسکول میں باضابطہ تعلیم کے لیے داخل کیے گئے جہاں سے انہوں نے میٹرک کیا۔ بعد ازاں انہوں نے سیالکوٹ کے مرے کالج سے گریجویشن کی ڈگری حاصل کی۔ فیض نے گورنمنٹ کالج لاہور سے انگریزی ادب میں اور ینٹل کالج لاہور سے عربی ادب میں ایم اے کی ڈگری حاصل کی۔

1936 میں جب سجاد ظہیر اور ان کے رفقاء نے ہندوستان میں ترقی پسند ادبی تحریک کی بنا ڈالی تو فیض نے پنجاب میں اس کی شاخ قائم کی۔ جس کے وہ ممبر سکریٹری رہے۔ فیض 1935 میں ایم اے او کالج امرتسر میں انگریزی کے لیکچرر ہوئے۔ اس کے بعد لاہور کے ہیلی کالج آف کامرس میں استاد ہوئے۔ انہوں نے ایک مختصر مدت کے لیے 1944 میں برٹش انڈین آرمی میں

بھی کام کیا۔ جہاں انہوں نے لیفٹیننٹ کرنل کے عہدے تک ترقی پائی۔ اسی لیے وہ کیپٹن فیض احمد فیض کے طور پر بھی پہچانے جاتے ہیں۔ لیکن 1947 میں فوج کی نوکری سے مستعفی ہوئے اور پاکستان ٹائمز کے پہلے مدیر اعلیٰ کے طور پر انہوں نے بطور صحافی کام کرنا شروع کیا اور یہاں بھی انہوں نے اپنی ایک خاص پہچان بنائی۔ کچھ عرصہ کے لیے فیض جلا وطن بھی کیے گئے۔ اس دوران بھی انہوں نے بطور صحافی کام کرنا پسند کیا۔ اور ماسکو، لندن اور بیروت سے نکلنے والا رسالہ 'لوٹس' کی ادارت کی۔ اس کے علاوہ انہوں نے ادب لطیف، روزنامہ 'امروز' اور ہفتہ وار 'لیل ونہار' کی ادارت کے فرائض بھی انجام دیے۔ 1959 میں وہ پاکستان آرٹ کاؤنسل کے سکریٹری مقرر کیے گئے جہاں انہوں نے 1962 تک کام کیا۔

1964 میں جب وہ لندن سے واپس ہوئے تو کراچی میں سکونت اختیار کی۔ جہاں انہوں نے عبداللہ ہارون کالج کے پرنسپل کی حیثیت سے جوائن کیا۔ لیکن وہ خود کو بطور صحافی تعارف کرانے میں فخر محسوس کرتے تھے۔ فیض کے کیریئر کا ایک اہم پڑاؤ 1965 میں ہندوستان پاکستان جنگ کے دوران شعبہ اطلاعات میں اعزازی طور پر کام کرنا بھی ہے۔ فیض ہند و پاک کے درمیان دوستانہ رشتے کے لیے ہمیشہ کوشاں رہے۔ ان کے اس جذبے کی بھرپور عکاسی ایک واقعہ سے ہوتی ہے۔ 1967 میں سوویت ادیبوں کی ماسکو کانفرنس میں فیض اور کرشن چندر دونوں شریک تھے۔ اتفاق سے عشائیے میں ہندوستان اور پاکستان کی میزیں کافی دوری پر تھیں۔ کرشن چندر اپنی خودنوشت 'آدھے سفر کی پوری کہانی' میں لکھتے ہیں:

''یکا یک میری اور فیض کی آنکھیں چار ہوئیں وہ فوراً اپنی کرسی سے اٹھ کھڑے ہوئے، میں اپنی کرسی سے۔ پھر ہوا یہ کہ میں اپنی میز سے ہندوستانی جھنڈا لیے اٹھا اور فیض اپنی میز سے پاکستان کا جھنڈا لیے اٹھے۔ اور ہم دونوں ایک دوسرے کی طرف بڑھتے ہوئے میزیں پار کرتے ہوئے بیچ کی کسی میز پر آ کر رک گئے۔ اس میز پر ہم دونوں نے ہندوستان اور پاکستان کے جھنڈے ساتھ ساتھ لہرا دیے اور ایک دوسرے کے گلے لگ گئے۔ سارا ہال تالیاں پیٹنے لگا۔''

لیکن اسی پاکستان میں اپنے ناکردہ گناہوں اور انقلابی روش کے سبب وہ کئی بار حکومت کے عتاب کے شکار ہوئے اور زنداں کی سیر کی۔ لیکن یہاں بھی انہوں نے کج کلاہِ زندانی کے طور

پر اپنی ایک خاص پہچان بنائی۔

خیر! زندگی کے ان تمام نشیب و فراز کے ساتھ ساتھ وہ صوفی مسلک کے بہت بڑے مداح تھے۔ جو مذہب و ملت، رنگ و نسل، ملک و قوم سے اوپر اٹھ کر صرف انسانیت کی بنیاد پر دلوں کے فاصلے ختم کرتا اور لوگوں کو جوڑتا ہے۔ چنانچہ فیض کئی صوفی سنتوں سے کافی قریب رہے۔ ان میں لاہور کے صوفی بابا ملنگ صاحب سب سے اہم اور خاص ہیں۔ ایک بار جب فیض سے صوفیوں اور سوشلسٹ کامریڈ کے بیچ تقابل کے لیے کہا گیا تو فیض نے جواب دیا کہ 'صوفی ہی دراصل سچے کامریڈ ہوتے ہیں'۔

فیض کی شہرہ آفاق شاعری کا دنیا کی کئی زبانوں میں ترجمہ کیا گیا۔ جس میں انگریزی اور روسی زبانیں خاص ہیں۔ معروف برطانوی مارکسی مورخ وکٹر کرینن نے فیض احمد فیض کی شاعری کا انگریزی میں ترجمہ کیا۔ یہ یقیناً فیض کے لیے اعزاز کی بات ہے۔

ایک آخری بات یہ کہ آج تک اردو زبان میں کسی بھی شاعر و ادیب کو نوبل انعام سے نہیں نوازا گیا ہے۔ لیکن کسی حد تک یہ فخر فیض احمد فیض کو حاصل ہے۔ 1984 میں ان کی وفات سے کچھ روز پہلے انہیں نوبل انعام کے لیے نامزد کیا گیا تھا اور شاید وہ حیات سے ہوتے تو انہیں اس اعزاز سے نوازا دیا جاتا۔ واضح ہو کہ نوبل انعام بس از مرگ نہیں دیا جاتا۔

اس فروری میں فیض کی پیدائش کو سو سال پورے ہو رہے ہیں۔ ہم انہیں اس موقع پر نذرانہ عقیدت کے طور پر یہ شمارہ اس شعر کے ساتھ پیش کر رہے ہیں۔

ہم پرورش لوح و قلم کرتے رہیں گے
جو دل پہ گزرتی ہے رقم کرتے رہیں گے

(فروری 2011)

''جام فلک کے نام سے لالہ لال چند فلک کا ایک مجموعہ کلام شائع ہوا ہے جس میں آغاز 1914ء سے 1920ء تک کی فلک صاحب کی کل نظمیں درج ہیں.....''

(زمانہ، جنوری 1921)

کاش ایسا ہو جائے...

ایک بار پھر مرزا غالب پر ہم ایک بھرپور گوشہ پیش کر رہے ہیں۔ غالب پر یوں تو ہم فروری کے شمارہ میں مضامین دیتے آئے ہیں، لیکن اس بار فیض احمد فیض کی صدی کے موقع پر ہم نے ان پر فروری کا شمارہ مخصوص کرنا مناسب جانا کہ ان کی تاریخ پیدائش 13 فروری 1911 کے حساب سے سو سال پورے ہو رہے تھے۔ بہر حال غالب تو غالب ہیں۔ وہ بھلا کب ماننے والے تھے۔ ہمیں مجبور کر دیا کہ ہم ان پر حسب روایت ایک گوشہ ہی سہی، ضرور شائع کریں۔

غالب ایک ایسا شاعر ہے جس کے فکر و فن پر اردو میں سب سے زیادہ لکھا گیا۔ لیکن ان کی شاعری کی تہہ داری اور معنویت روز افزوں ہے۔ آئے دن نئے نئے نکتے سامنے آتے رہتے ہیں اور یوں ہمیں قلم اٹھانے پر مجبور کرتے رہتے ہیں۔ اس بار ہم ان پر پانچ مضامین دے رہے ہیں اور تقریباً سبھی مضامین غالب سے متعلق اچھوتے اور نئے گوشوں پر محیط ہیں۔ غالب کو بہ حیثیت شاعر اور مکتوب نگار تو سبھی جانتے ہیں لیکن غالب تنقید نگار کو ہم ذرا کم کم ہی جانتے ہیں۔ یہ غالب کا تنقیدی شعور ہی تھا کہ آج ہمارے سامنے ان کا ایک مختصر اور سبک مگر بے مثال سا دیوان موجود ہے اور جس کے سبب آج غالب سب پر غالب ہیں۔ کاش! آج دس دس بیس بیس شعری مجموعوں کے شعرا اس نکتے پر غور کر سکتے۔

آئے دن غالب کے خطوط دریافت ہوتے رہتے ہیں اور ان پر بحثیں ہوتی رہتی ہیں۔ ان کا دلچسپ اسلوب، دلکش طرز نگارش، ان میں پیش کردہ واقعات، اس زمانے کی تاریخ و سیاست کیا کچھ نہیں ہے غالب کے خطوط میں۔ تبھی تو غالب کے خطوط ہمیں دعوت نظارہ دیتے آئے ہیں اور دعوت قرأت بھی۔ 'غالب کے تین فارسی خطوط' اس سمت میں ایک اور پیش رفت ہے۔

غالب کی شاعری کے ہر دور میں شارح پیدا ہوتے رہے ہیں، جو غالب کی شاعری کی پرتوں اور تہوں کو کھولنے اور نئے نئے معنی دریافت کرنے کا کام انجام دیتے رہے ہیں۔ ایسے شارحین کی تعداد ایک دو نہیں سیکڑوں میں ہے۔ ایسے ہی ایک گمنام شارح سید شہاب الدین مصطفیٰ بھی ہیں، جنہوں نے اشعار غالب کی نئی شرح پیش کی۔

غالب کو غزل گو کی حیثیت سے تو سبھی جانتے ہیں لیکن انہیں نظم نگار کی حیثیت سے بہت کم لوگ ہی جانتے ہیں۔ آپ شاید اس بات سے اتفاق نہ کریں کہ غالب کی بعض غزلیں نظم کا خاصہ رکھتی ہیں اور وہ بھی سائنسی نظمیں، غالب کے سلسلے میں اس اچھوتے گوشے پر بھی ایک دلچسپ مضمون شامل اشاعت ہے۔

ہمارا تصور استناد بڑا مختلف، متنوع اور متنازع رہا ہے۔ اس موضوع پر بحثیں ہوتی رہی ہیں اور اس سلسلے میں ایک خاص خطہ یا ایک خاص زبان کے لوگ دوسرے خطے اور دوسری زبان کے لوگوں کو ساقط الاعتبار ٹھہراتے آئے ہیں۔ اس سلسلے میں غالب کے رویے پر ایک مضمون یقیناً قارئین کو متوجہ کرے گا۔

فیض کی صدی منائی جارہی ہے۔ اس سلسلے میں ہم نے فروری کے شمارہ سے اس کی شروعات کردی ہے۔ زیر نظر شمارہ میں ہم آج کل کی فائل سے فیض احمد فیض کا ایک نایاب مضمون پیش کررہے ہیں جو فیض کو ماہر غالبیات ثابت کرنے کے لیے کافی ہے۔ اس مضمون میں فیض نے غالب کی ایک اردو غزل: ''مدت ہوئی ہے یار کو مہماں کیے ہوئے'' کی خوبصورت اور حقیقت پر مبنی شرح بیان کی ہے۔ کاش! آج کے کسی غالب پر بغیر فرمائش کے تنقید، تحقیق، تحسین اور توصیف کے ڈونگرے برسائے جاتے۔

گوشۂ غالب کے ساتھ ہی ہم نے مستقل کالم کا بھی اہتمام رکھا ہے۔ 'غبار کارواں' کے تحت ہم ایک دلچسپ افسانوی تحریر ''وہ ضعیف شخص'' پیش کررہے ہیں۔ جو بابا سائیں پروفیسر شکیل الرحمٰن کی خود نوشت ہے۔ دیگر مشمولات میں رشید امجد اور م راجندر کی کہانیوں کے علاوہ حسب معمول منظومات بھی پیش کررہے ہیں۔ لیکن اس شمارہ میں ایک اہم تحریر گوپی چند نارنگ کا ''اردو زبان کی پہلی گرامر'' پر ایک تحقیقی مضمون ہے۔ اس مضمون میں کیٹلر کی ہندوستانی زبان کی اس پہلی گرامر کو ڈاکٹر تیج بھاٹیہ

کے ذریعے ہندی زبان کی پہلی گرامر کہنے پر پروفیسر نارنگ نے اچھی سرزنش کی ہے۔ یہ صحیح ہے کہ جس زبان کو بعد میں اصطلاحاً ہندی کہا گیا وہ ہندی کے نام سے موسوم نہیں تھی۔ ہندی اردو کا جھگڑا تو بعد کی دین ہے۔ جواب سیاسی موضوع بن چکا ہے۔ کاش! آج ایک بار پھر 'ہندوستانی زبان' رائج ہو جائے جو اردو اور ہندی دونوں رسم الخط میں لکھی جائے اور دونوں کو برابر کا حق ملے اور جسے ہم تمام ہندوستانی حرز جاں بنا سکیں۔ ہندوستان کی گنگا جمنی تہذیب کی نمائندہ زبان یہی ہو سکتی ہے۔

پچھلے دنوں ''اردو ادب میں جدید رجحانات 1990 کے بعد'' کے موضوع پر ایک سمینار ہوا جس میں مقالہ نگار حضرات نے موضوع کے مختلف پہلوؤں پر اپنی اپنی باتیں رکھیں، لیکن آج کون سا غالب رجحان ہے یہ ابھر کر واضح طور پر سامنے نہیں آسکا۔ ادھر کولکاتا سے شائع ہونے والا جریدہ 'مژگاں' نے بھی ''نئی نسل، نیا ادب'' کے نام سے ایک ضخیم نمبر شائع کیا ہے۔ 1800 صفحات پر مشتمل اس نمبر نے ایک مقدس اور بھاری پتھر کی شکل تو اختیار کر لی لیکن نئی نسل، نیا ادب یا نئے رجحان کی تصویر ابھارنے میں بہت زیادہ کامیاب نہیں ہو سکا۔ میرا خیال ہے کہ آج جدید رجحان میں سب سے نمایاں بات یہ ہے کہ ہم دو خانوں میں بٹے ہوئے ہیں۔ آج اردو کی ادبی دنیا دو قطبین یعنی ساؤتھ پول (S) اور نارتھ پول (N) میں منقسم ہے اور جوان دو خانوں میں سے کسی ایک میں نہیں ہے وہ کہیں بھی نہیں ہے اور اس کی کوئی وقعت نہیں، کوئی پوچھ نہیں۔ اس سلسلے میں مجھے فلم شعلے کا وہ ڈائیلاگ یاد آتا ہے کہ ''ہم انگریزوں کے زمانے کے جیلر ہیں، خبردار! آدھے اِدھر جاؤ آدھے اُدھر جاؤ اور باقی میرے پیچھے آؤ۔'' کاش! کسی تیسری غیر جانب دار اور باصلاحیت ادیبوں کی نسل سامنے آسکتی جو اپنے وجود کا احساس کرا سکتی۔

آج عالمی سطح پر جمہوریت کی بیار بہہ رہی ہے اور بہت سے ممالک اس کی زد میں ہیں۔ بادشاہت اور تاناشاہی کے خلاف لوگ نبرد آزما ہیں اور ظلم اور بربریت سے لوہا لے رہے ہیں۔ سیاسی سطح پر یہ ایک مثبت سمت میں ہو رہی اتھل پتھل ہے اور بالآخر جمہوریت اور عوام کی ہی جیت ہونی ہے۔ ہندوستان میں جمہوریت کی جڑیں پہلے سے ہی مضبوطی سے پیوست ہیں۔ کاش! ہمارے ادب میں بھی بادشاہت اور تاناشاہی کا خاتمہ ہو اور جمہوریت اور آزادی کا بول بالا ہو۔

(مارچ 2011)

آپ بے بہرہ ہے جو معتقد میر نہیں

میرؔ کی وفات کو دو سو سال پورے ہو چکے ہیں۔ اس موقع پر ہم انہیں خراج عقیدت پیش کرتے ہیں۔ یہ اس عظیم شاعر کا اعتراف ہے جس کا سلسلہ شروع ہو چکا ہے۔ میر کی شاعری کے کم وبیش ڈھائی سو سال پورے ہونے کو آئے۔ تب سے اب تک اردو کا شاید ہی کوئی ایسا شاعر ہو جس نے میر کا اثر نہ قبول کیا ہو یا میر کی عظمت کا اعتراف نہ کیا ہو۔ یہ سلسلہ میر کے دور سے شروع ہو کر آج تک جاری ہے اور آگے بھی یہ سلسلہ دراز رہے گا۔

خدائے سخن میر تقی میر جن کی پیدائش 1723 کو اکبرآباد (آگرہ) میں اور وفات 21 ستمبر 1810 کو لکھنؤ میں ہوئی۔ ان کی زندگی کے قیمتی لمحے دہلی میں گزرے۔ جہاں وہ دبستان دہلی کے سب سے اہم شاعر گردانے گئے۔ یہی وجہ ہے کہ جب وہ 1782 میں لکھنؤ جاتے ہیں تو وہاں بھی پھٹے حال ہونے کے باوجود اپنی دہلوی شان کو نہیں بھولتے اور اپنے دہلوی ہونے کا اظہار اس دردناک انداز میں کرتے ہیں کہ سارے لکھنؤ والے دم بخود مؤدب اور ہمہ تن گوش ہو کر ان کے سامنے سر نیاز خم کر دیتے ہیں۔

واقعہ مشہور ہے کہ پھٹے حال میر لکھنؤ کے کسی مشاعرے میں پہنچ گئے ان کی وضع قطع اور شکل وصورت دیکھ کر لوگ اشاروں میں ہی ان پر طنز کرنے لگے۔ دلّی کی بربادی کے شکار میرؔ خاموش اپنی باری کا انتظار کرتے رہے اور جب ان کی باری آئی تو میر نے ان الفاظ میں اپنا تعارف پیش کیا:

کیا بود و باش پوچھو ہو پورب کے ساکنو!
ہم کو غریب جان کے ہنس ہنس پکار کے

دلّی جو ایک شہر تھا عالم میں انتخاب
رہتے تھے منتخب ہی جہاں روزگار کے
جس کو فلک نے لوٹ کے ویران کردیا
ہم رہنے والے ہیں اسی اجڑے دیار کے

اتنا سننا تھا کہ لوگ ششدر اور حیران مؤدب ہوگئے۔ پھر کسی کی ہمت نہ ہوئی کہ چوں تک کرے۔ لوگ سمجھ گئے کہ یہ تو حضرت میرؔ ہیں۔ اور پھر لوگ ہمہ تن گوش انہیں سنتے رہے۔ میر تقی میر کے لیے یہ کتنا بڑا اعزاز ہے کہ اس مشاعرے کا صرف یہی ایک شاعر آج یاد رہ گیا۔ تاریخ اردو ادب شاہد ہے کہ اس زمانے میں میرؔ کے رہتے کسی اور شاعر کا چراغ جل نہ سکا۔

اور یہ نام کچھ ایسا زندہ اور تابندہ ہوا کہ تب سے اب تک میر کی حکمرانی قائم ہے۔ میر کے دور کے شعرا ہوں یا غالب اور عہد غالب کے شعرا ہوں یا ان کے بعد سے اب تک کے شعرا، سب نے میرؔ کی برتری اور عظمت کا اعتراف ہر دور میں کیا ہے۔

میر کا شعری کارنامہ چھ دیوان پر مشتمل ہے جس میں 13 ہزار 585 اشعار شامل ہیں۔ میر کی شاعری میں اردو کے تقریباً سبھی مروجہ اصناف یعنی غزل، مثنوی، قصیدہ، رباعی، مستزاد وغیرہ سب کچھ شامل ہیں۔

اردو کے سب سے بڑے شاعر کے مسئلہ پر آئے دن بحث ہوتی رہتی ہے کہ آیا اردو کا سب سے بڑا شاعر میر تقی میر ہے یا مرزا غالب۔ یہ بحث لایعنی اور فضول ہے کہ غالب نے خود میر کی عظمت کا نہ صرف اعتراف کیا بلکہ اس کا برملا اظہار بھی کیا ہے:

ریختہ کے تم ہی استاد نہیں ہو غالبؔ
کہتے ہیں اگلے زمانے میں کوئی میر بھی تھا

ایک دوسری جگہ غالب کچھ اس انداز میں اعتراف کرتے ہیں:

غالبؔ اپنا یہ عقیدہ ہے بقول ناسخ
آپ بے بہرہ ہے جو معتقد میر نہیں

میر میر ہیں اور غالب غالب۔ میر کو اولیت بہر حال حاصل ہے کہ وہ اس دور میں شاعری

کر رہے تھے جب اردو زبان اپنے ابتدائی اور ارتقائی مراحل سے گزر رہی تھی اور میر اپنی شاعری سے اس ارتقائی مرحلے کو تقویت بخش رہے تھے۔

زیر نظر شمارہ میں ہم میر کے فکر و فن پر چار بھرپور مضامین پیش کر رہے ہیں جو میر کی شاعری کے تقریباً تمام پہلوؤں پر محیط ہیں۔ ڈاکٹر محبوب راہی نے اپنے طویل اور انتہائی اہم مقالے میں میر کے اثرات عہد میر سے عصر حاضر تک کا بھرپور جائزہ لیا ہے اور یہ ثابت کیا ہے کہ پچھلے ڈھائی سو سال میں اردو شاعروں کی تقریباً ہر نسل نے میر سے نہ صرف استفادہ کیا ہے بلکہ اس کا کھلے دل سے اعتراف بھی کیا ہے۔ لیکن محبوب راہی کا یہ شکوہ:

''اقبالؔ اور غالبؔ پر آئے دن جا بجا سیمینار اور سمپوزیم انعقاد پذیر ہوتے رہتے ہیں۔ مختلف یونیورسٹیوں میں اقبالؔ اور غالبؔ سے موسوم چیئرس قائم ہیں۔ اس تناظر میں تجزیاتی موازنہ کرنے پر سخت مایوسی ہوتی ہے کہ میرؔ کی عظمت، اہمیت اور افادیت کی مسلسل اعترافی تکرار کے باوجود سوائے شمس الرحمٰن فاروقی کے شعر شور انگیز ڈاکٹر سید عبداللہ کے نقدِ میرؔ اور خواجہ احمد فاروقی کے چند مضامین کے سینے پر ماہرین ''میریات'' جیسا تمغۂ امتیاز سجائے کوئی ایک دکھائی نہیں دیتا۔''

شکوۂ بے جا ہے۔ ہر دور میں میر کو یاد کرنے کا سلسلہ عام رہا ہے اور اس کا ثبوت خود محبوب راہی کا یہ مضمون ہے۔ میر کا دور سیاسی اتھل پتھل اور انتشار و خلفشار کا دور رہا ہے، اس انتشار و خلفشار سے پریشان ہو کر آخر میر لکھنؤ کا رخ کرتے ہیں اور پھر ساری زندگی وہیں گزار دیتے ہیں۔ ڈاکٹر نجمہ رحمانی نے میر کی شاعری میں اسی سیاسی حوالے کی چھان پھٹک کی ہے جس سے نہ صرف اس دور کا سیاسی منظر نامہ سامنے آتا ہے بلکہ میر کا سیاسی شعور بھی واضح ہوتا ہے۔

ڈاکٹر ارجمند آرا نے اپنے قیمتی مقالے میں میر کی شاعری میں احساس اور جذبے کی عملداری کو بھرپور درشایا ہے: ''میر ہمارے غالباً پہلے اور واحد شاعر ہیں جو ایسے ہی دشوار اور نازک ترین جذبوں اور احساسات کی ترسیل کے لیے سب سے زیادہ معروف ہیں۔ ان کی شاعری کو پڑھتے ہوئے جو اضطراب دل کے اندر سے پھوٹتا ہوا محسوس ہوتا ہے وہی پنڈت شوموہن شرما کے سنتور کی دھیمی تھرتھراہٹ ہے، برجو مہاراج کا مبہوت کر دینے والا رقص ہے۔ میر کے ہاں ان گنت اشعار مل جائیں گے جن میں اپنے جذبوں کو انھوں نے بے حد لطیف پیرائے میں پیش کیا ہے۔''

ڈاکٹر فرید پربتی نے اپنے مقالے میں میر کے تصور انسانیت سے بحث کرتے ہوئے اجاگر کیا ہے کہ ''میر وحدت الوجود کے قائل تھے۔ انسان اور انسانیت کے متعلق ان کے تصورات میں ایک اثباتی پہلوؤ اجاگر ہوتا ہے۔ اس اثباتیت کے تصور کا اصل سرچشمہ تصوف کے افکار سے پھوٹتا ہے۔''
اس طرح محض چار مقالوں کے اس مختصر گوشے میں میر اور اثرات میر کا احاطہ کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔ میر کی دوسوویں برسی پر ہم اس گوشے کو بطور خراج عقیدت پیش کرنے کی سعادت حاصل کر رہے ہیں۔

(اپریل 2011)

''ڈاکٹر اقبال کی مشہور فارسی تصنیف اسرار بیخودی کا انگریزی میں ترجمہ ہوگیا ہے اور اس کو میکمیلن کمپنی نے شائع کیا ہے۔'' (زمانہ، جنوری 1921ء)

''انجمن ترقی اردو کا رسالہ 'اردو' محاسنِ ظاہر و باطن دونوں لحاظ سے اردو کا بہترین رسالہ ہے۔ اس کے مضامین اردو ادب کے لئے باعث فخر ہیں۔ اور ہم ایسے اعلیٰ تنقیدی مضامین کی اشاعت پر اس کے لائق ایڈیٹر مولوی عبدالحق صاحب کو مبارکباد دیتے ہیں.....'' (زمانہ، جولائی 1921)

''خوشی کی بات ہے کہ ہم عصر مخزن اب پھر شائع ہونا شروع ہوا ہے۔ اس مرتبہ اس کا سائز 'زمانہ' کے سائز کے برابر کردیا گیا ہے.....'' (زمانہ، جولائی 1921)

''عربی زبان میں کئی رسائل اور اخبار امریکہ اور یورپ میں نکلتے ہیں۔ حال میں اردو زبان کا پہلا رسالہ 'نوائے کیمبرج' کے نام سے کیمبرج میں جاری کیا گیا ہے۔ گو یہ ہندوستانی ہی میں چھپا ہے۔ رسالہ مذکور ہندوستانی طلبہ مقیم انگلستان کے زیر اہتمام جاری ہوا ہے۔ ہندوستان میں اس کی اشاعت 'مسلم انسٹی ٹیوٹ' کلکتہ کے ذریعہ ہوگی۔'' (زمانہ، جولائی 1921)

روسی ادب کے دو معمار

زیر نظر شمارہ میں روسی ادب کے دو معمار شامل ہیں۔ چے خف کی کہانی 'جان من' جس کا ترجمہ انگریزی کی وساطت سے جناب عابد سہیل نے بڑے خوبصورت انداز میں کیا ہے۔ یہ چے خف کی اہم کہانیوں میں سے ایک ہے۔ نکولائی گوگول پر ستیہ پال آنند کا ایک تعارفی اور تاثراتی مضمون شامل کیا جارہا ہے۔ واضح ہو کہ حال ہی میں گوگول کی ولادت کو 200 سال پورے ہوئے ہیں۔

بنیادی طور پر یہ دونوں روسی ادیب فکشن نگار ہیں اور روسی فکشن کو ان دونوں نے خاصا مالا مال کیا ہے۔ روسی فکشن کا عالمی ادب میں ایک خاص مقام ہے۔ عالمی ادب میں فکشن کا کوئی بھی تذکرہ اس کے بغیر مکمل نہیں مانا جاتا۔ روسی ادب پر اگر ایک نظر ڈالیں تو ہم پاتے ہیں کہ یہ نہ صرف اپنی تہذیب اور ثقافت، اپنی تاریخ اور جغرافیہ، اپنی زبان اور ماحول کی پیش کش میں پیش پیش ہے بلکہ اپنے ملک روس (سوویت یونین) کے مسائل کے ساتھ ساتھ عالمی مسائل کو درشانے میں بھی پیش پیش رہا ہے۔

قدیم روسی ادب قدیم روسی زبان میں تحریر کردہ کئی شاہکار تحریروں پر مشتمل ہے۔ وکی پیڈیا کے مطابق اس نوع کے گمنام قلم کاروں کے شہ پاروں میں آئیگور کی مہم جوئی کی داستان اور ڈینیل امیورڈ کی دعا شامل ہیں۔ 'سنتوں کی زندگیاں' قدیم روسی ادب کی مقبول صنف کا ایک حصہ رہا ہے، الیگزینڈر رینوسکی کی زندگی ایک معروف مثال ہے۔ روسی ادب کے دیگر شاہکاروں میں زدونس چائنا، فزیولوجسٹ، سینوپسس اور تین سمندروں کے پار ایک سفر شامل ہیں۔ زبانی لوک داستانیں عیسائی اور لادینی روایتوں کا مرقع ہوا کرتی تھیں۔ عہد وسطیٰ کے روسی ادب کا کردار بہت

حد تک مذہبی ہوا کرتا تھا جس میں کلیسا میں استعمال ہونے والی زبان کا استعمال ہوتا تھا۔ خالص روسی زبان کی پہلی تخلیق آرک پادری اوّاکم کی خودنوشت سوانح حیات سترہویں صدی کے وسط میں منظرِعام پر آئی۔

انیسویں صدی سے قبل روس کی ادبی روایت کی گریلا دیرزہاون، ڈینس فون وزن، الیگزینڈر رسماروکوف، واسیلی ٹریڈیاکووسکی، نکولائی کرمزن اور ایوان کرائیلوف جیسے شاعروں، ڈرامہ نویسوں اور قلم کاروں نے آبیاری کی تھی۔ 1830 کے اوائل میں روسی ادب سنہرے دور میں داخل ہوتا ہے جس کا آغاز شاعر الیگزینڈر پشکن سے اور اختتام عالمی ادب کے تین عظیم ناول نگار لیوٹالستائی، فیودور دوستووسکی اور گوگول پر ہوتا ہے۔ اس کے بعد دوسری لہر آئی جس کی قیادت انٹن چے خف اور میکسم گورکی نے کی۔

نکولائی گوگول (31 مارچ 1809 ۔ 4 مارچ 1852) یوکرین میں پیدا ہونے والے روسی زبان کے مزاح نگار، ڈرامہ نویس اور ناول نگار تھے۔ انہیں جدید روسی حقیقت نگاری کا بانی تصور کیا جاتا ہے لیکن ان کی نگارشات میں رومانویت بھی پائی جاتی ہے۔ ان کی ابتدائی نگارشات "دکانکا کے قریب ایک فارم کی شامیں" میں یوکرینی کلچر اور لوک رنگ صاف دکھائی دیتا ہے۔ ان کی زیادہ پختہ تحریروں میں روسی سلطنت کی بدعنوانیوں کو طنز ومزاح کے پیرائے میں پیش کیا گیا ہے جس کی پاداش میں انہیں جلاوطنی کی زندگی گزارنا پڑی۔ واپسی پر وہ قدیم روسی کلیسا کی روحانیت میں گم ہوگئے۔ ناول 'تاراس بلبا' اور 'مردہ روحیں'، ڈرامہ 'انسپکٹر جنرل' اور 'مختصر کہانیاں' 'ایک پاگل کی ڈائری'، ناک اور اوورکوٹ ان کی بہترین نگارشات میں شمار کی جاتی ہیں۔ اپنی شدت پسند حقیقت نگاری، اخلاقی نکتہ چینی اور فلسفیانہ گہرائی کے ساتھ وہ عالمی ادب کے اہم ترین شاہکاروں میں شامل ہیں۔

گوگول کہانی نویسوں کی صف اول میں شامل تھے جس میں الیگزینڈر پشکن، پروسپر میریمی، ای ٹی اے ہوفمین اور نتھانیل ہوتھورن جیسے بڑے نام شامل ہیں۔ وہ 'لٹریری ارسٹوکریسی' کے رابطہ میں تھے۔ انہوں نے انٹن دیلوگ کے ناردرن فلاورز میں ایک کہانی شائع کرائی۔ ویسلی زہوکووسکی اور پیوتر پلیشوف 1831 میں پشکن سے ان کا تعارف کرایا۔

انٹن چے خف (29 جنوری 1860-15 جولائی 1904) روسی زبان کے کہانی نویس،

ڈرامہ نویس اور میڈیکل ڈاکٹر تھے۔ انہیں عالمی ادب میں بڑے کہانی کاروں میں شمار کیا جاتا ہے۔ بطور ڈرامہ نویس انہوں نے چار شاہکار ڈرامے تخلیق کیے۔ ان کی مختصر کہانیوں کو قارئین اور ناقدین انتہائی قدر کی نگاہ سے دیکھا کرتے ہیں۔ چے خف نے اپنے ادبی کیریئر کے بیشتر حصہ میں بطور ڈاکٹر پریکٹس کیا۔ انہوں نے ایک مرتبہ کہا تھا کہ طب ان کی منکوحہ ہے اور ادب ان کی معشوقہ۔

چے خف نے 1896 میں اپنے ڈرامہ دی سی گل کا تباہ کن انجام دیکھنے کے بعد تھیٹر کو ترک کر دیا لیکن 1898 میں جب ماسکو آرٹ تھیٹر نے اسے دوبارہ پیش کیا تو زبردست شہرت حاصل ہوئی۔ اس نے انکل وانیا اور چے خف کے دیگر دو ڈرامے، تھری سسٹرز اور دی چیری آرچرڈ بھی پیش کیے۔ یہ چار ڈرامے اداکاروں اور سامعین کے لیے چیلنج کا درجہ رکھتے ہیں کیونکہ چے خف کے ڈراموں میں موڈ کا بہت زیادہ دخل ہوتا ہے اور متن میں زندگی بجھی بجھی سی دکھائی دیتی ہے۔

چے خف نے ابتدا میں صرف مالی منفعت کے لیے کہانیاں لکھنی شروع کیں لیکن جیسے جیسے ان کے فنکارانہ عزائم بڑھے انہوں نے اختراعات سے کام لینا شروع کیا۔ جس نے جدید کہانی کی ارتقا پر اثر ڈالا۔ انہوں نے شعور کی رو تکنیک کا استعمال کر کے اس میدان میں سبقت حاصل کی جس کی تقلید بعدازاں جیمز جوائس اور دیگر جدیدیوں نے کی۔ ساتھ ہی انہوں نے کہانی کے روایتی ڈھانچہ سے انحراف کیا۔ اس سے قارئین کو جو دشواریاں پیش آئیں اس کے لیے انہوں نے معذرت نہیں کی بلکہ اس بات پر اصرار کیا کہ فنکار کا کام سوال پیدا کرنا ہے، ان کا جواب دینا نہیں۔ اس عہد کے مشہور روسی قلم کار 64 سالہ دمتری گریگورووچ نے چے خف کی کہانی ''شکاری'' پڑھ کر انہیں لکھا کہ ان کے پاس اصلی صلاحیت ہے جو انہیں نئی نسل کے قلم کاروں کی اولین صف میں لے جاتی ہے۔ انہوں نے چے خف کو اپنی رفتار سست کرنے، کم لکھنے اور معیاری ادب پر توجہ مرکوز کرنے کی صلاح دی۔

روسی ادب اپنے ترقی پسند نظریات کے سبب عالمی سطح پر عزت وقدر کی نگاہ سے دیکھا جاتا رہا ہے بلکہ اپنے ان خصوصیات کے سبب قائدانہ رول بھی ادا کرتا رہا ہے۔ ہندوستان میں بھی اس نظریہ سے متاثر ہو کر چند نوجوانوں کی تحریک پر 10 اپریل 1936 کو لکھنؤ میں انجمن ترقی پسند

مصنفین (ترقی پسند ادبی تحریک) کی بنیاد ڈالی گئی جو اردو ادب کے تمام تر رجحانات اور تحریکات میں سب سے نمایاں، اہم اور خاصی مقبول تحریک ثابت ہوئی اور جس کے اثرات آج 75 سال بعد بھی نظر آجاتے ہیں۔ قابل مبارکباد ہیں وہ حضرات جو ترقی پسند تحریک کے 75 سال پورے ہونے پر اس کی ڈائمنڈ جوبلی منا رہے ہیں اور اس طرح ان ترقی پسند ادیبوں کے خفتہ اور مرجھائے جذبات کو ایک بار پھر بیدار کرنے کا کارنامہ انجام دینے کی سعی کر رہے ہیں۔

(مئی2011)

"لیگ کی اس وقت تک کی کارروائیوں نے مجھے یقین دلایا ہے کہ دول متحدہ کے جتھوں میں سے جو سلطنت جو طرز اختیار کرتی ہے خواہ وہ کتنا ہی بہیمانہ ہو لیگ اقوام اس میں دخل دینے سے عاجز ہے میں کنارہ کشی اختیار کر رہا ہوں اس لئے کہ لیگ کے دائرہ عمل سے صرف وہ مقصد اصل خارج ہی نہیں جس کو تحریک بین الاقوامی کا گراں بہا لقب دیا گیا ہے بلکہ اس کی تضحیک بھی ہوتی ہے....." (الناظر، 1923ء)

"ایک رسالہ 'شباب' (اتفاق سے اس کا واحد شمارہ ہماری ذاتی لائبریری میں موجود ہے) جو ادب اردو کا رسالہ ہے تین ساڑھے تین سال سے شائع ہو رہا ہے۔ اس کی ایک نادر خصوصیت یہ ہے کہ سرورق پر ہر ماہ سارے ایڈیٹوریل اسٹاف تعین ایڈیٹر، آنریری ایڈیٹر، جوائنٹ ایڈیٹر، اسسٹنٹ ایڈیٹر، سب ایڈیٹر صاحب کے اسمائے گرامی کی نمائش ہوتی رہتی ہے۔ ممکن ہے یہ اعلان ترقی اشاعت میں موثر پایا گیا ہو....." (الناظر، مئی 1923)

گزر جانا اظہار اثر کا

آج میں بہت غمگین ہوں۔ میرا یار غمگسار، ہمدم و دم ساز اظہار اثر ہم سے بچھڑ گیا۔ وہ 82 سال کے بزرگ ضرور تھے لیکن ہم سے ایک نوجوان دوست کی طرح ہی ملا کرتے تھے اور گھنٹوں ادب وسیاست، رقص وفنون لطیفہ اور دیگر دنیا بھر کے موضوعات پر گفتگو کیا کرتے تھے۔ ابھی دو ڈھائی سال پہلے کی ہی بات ہے جب وہ کسی نوجوان کی صورت بالکل سیدھا سینہ تانے چاق وچوبند، ٹی شرٹ اور پینٹ میں ملبوس سر پر جاسوسی ٹوپی لگائے کسی جاسوسی کردار کی مانند ہمارے دفتر میں ہمیں اپنی ملاقات سے سرفراز کرنے آئے تھے۔ باتوں باتوں میں انہوں نے آخری ملاقات میں بر سبیل تذکرہ یہ بات بھی کہی تھی کہ ابرار صاحب آنکھوں کی تکلیف بڑھتی جاتی ہے اور اب اس کا آپریشن کرانا ناگزیر ہے۔ پھر کچھ دنوں بعد ان کا فون آیا کہ آنکھوں کا آپریشن تو ہوا لیکن .....ان ہزاروں لوگوں کی طرح اظہار اثر کو آنکھوں کی روشنی لوٹانا شاید قدرت کو منظور نہ تھا۔ چنانچہ انہوں نے حالات سے سمجھوتہ کرلیا۔ لیکن آنکھوں کی اس کم بینائی کے باوجود انہوں نے لکھنا پڑھنا ایک دم سے بند نہیں کردیا۔ ان کی آخری کوشش یہی رہی کہ وہ لکھتے رہیں اور زندگی کے معمول میں کوئی بہت بڑا فرق بھی نہ آئے۔ انہوں نے ہمارے لیے اپنا آخری مضمون ”علامہ اقبال کی دولخت شخصیت“ کے عنوان سے لکھا تھا۔ جو دسمبر 2009 کے آجکل میں شائع ہوا اور جس مضمون پر کافی بحث بھی ہوئی۔

6 اپریل کو اخباروں کے ذریعہ یہ خبر ملی کہ جاسوسی ناول نگار اظہار اثر کی کفالت اور ان کی آنکھوں کے علاج کے لیے فکر مند ادیبوں اور صحافیوں کی اردو گھر میں میٹنگ منعقد ہوئی جس میں اظہار اثر کی آنکھوں کے کامیاب علاج کے لیے چندہ جمع کرنے کی تجویز منظور کی گئی۔ اس خبر سے اظہار اثر کو یک گونہ خوشی ہوئی کہ لوگوں نے انہیں بھلایا نہیں ہے اور آج بھی یاروں دوستوں کا

ایک حلقہ ہے جو ان کے لیے فکر مند ہے، انہیں امید ہو چلی تھی کہ اب ان کی آنکھوں کا کوئی کامیاب آپریشن ہوگا اور وہ پھر سے پہلے کی طرح دیکھنے لگ جائیں گے۔ لیکن خدا کو یہ منظور نہ تھا۔

15 اپریل کو ہمیں یہ خبر ملی کہ اظہار اثر ہمیں داغ مفارقت دے گئے۔ اردو کے معروف ناول نگار اور ایک ہزار ناولوں کے مصنف اظہار اثر کا طویل علالت کے بعد انتقال ہو گیا ان کی عمر 82 برس تھی۔ اظہار اثر 15 جون 1929 کو ضلع بجنور کے قصبہ کرتپور میں پیدا ہوئے۔ دس گیارہ سال کی عمر سے شعر کہنے شروع کیے اس کے ساتھ ساتھ سائنس میں دلچسپی پیدا ہوئی۔ 1955 میں پہلا سائنسی ناول 'آدھی زندگی' شائع ہوا۔ تقریباً 200 سائنسی مضامین لکھے جو ہندو پاک کے رسائل و جرائد میں شائع ہوتے رہے ہیں۔ انہوں نے سائنسی فکر اور امیجری کو شاعری میں ڈھالنے کی بھی کامیاب کوشش کی ہے۔ آپ کے شعری مجموعے 'لاشریک' میں شامل زیادہ تر نظمیں سائنسی موضوعات پر ہیں۔ مختلف سائنسی مضامین پر مشتمل دو مجموعے 'سائنس کیا ہے' اور 'آج کی سائنس' کے نام سے اردو اور ہندی دونوں زبانوں میں شائع ہو چکے ہیں۔ ان کا ریڈیائی ڈرامہ 'تیسری آنکھ' اس قدر مقبول ہوا کہ آل انڈیا ریڈیو کے ہر اسٹیشن سے براڈ کاسٹ کیا گیا۔ اظہار اثر زود نویس قلم کار تھے تقریباً ایک ہزار ناول اردو اور ہندی میں شائع ہو چکے ہیں جن میں سائنسی، سماجی، جاسوسی ناول شامل ہیں۔ تین سو سے زائد کہانیاں شائع ہو چکی ہیں۔ کہانیوں کا مجموعہ 'میرے افسانے' کافی مقبول ہوا۔ آپ نے کئی رسالوں کی ادارت کے فرائض بھی انجام دیے ہیں اور اپنے رسالے بھی نکالے ہیں جن میں 'ہم قلم'، 'اظہار اثر ڈائجسٹ' اور 'رات کا رپورٹر' شامل ہیں۔

جس وقت اظہار اثر نے قلم سنبھالا اور لکھنا شروع کیا اس وقت تیرتھ رام فیروز پوری کے ترجمہ شدہ جاسوسی ناول کا اثر باقی تھا۔ چنانچہ جب اظہار اثر کے معاصر ابن صفی (26 جولائی 1928۔26 جولائی 1980) نے اپنا پہلا جاسوسی ناول 'دلیر مجرم' لکھا تو وہ بھی انگریزی سے ماخوذ اور ترجمہ تھا۔ لیکن جلد ہی ابن صفی، اکرم الہ آبادی اور اظہار اثر اور دیگر مصنفین طبع زاد جاسوسی ناول لکھنے لگے۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ ان حضرات میں جو کامیابی اور مقبولیت اپنے انوکھے اور دلچسپ اسلوب اور خوبصورت زبان کی وجہ سے ابن صفی کو ملی وہ کسی اور کو نہ مل سکی۔ اردو میں جاسوسی ادب کے ایوان میں جو شہنشاہیت ابن صفی کے حصے میں آئی اس تک کوئی اور نہ پہنچ سکا۔ لیکن اظہار اثر نے بھی اس میدان میں اپنی کامیابی کا سکہ جما ہی لیا۔ ان دو فنکاروں میں ایک واضح فرق تو یہی ہے کہ ابن صفی

بی اے تھے۔ جو ایک زمانے تک ان کے نام کا لاحقہ بنا رہا جب کہ اظہار اثر صرف میٹرک تھے۔ لیکن اس کے باوجود چونکہ سائنسی مزاج پایا تھا اس لیے انہوں نے اردو میں جاسوسی ناول کے ساتھ ساتھ سائنس فکشن بھی لکھنا شروع کیا۔ یہ ان کا اختصاص اور انفراد ہے جو انہیں ان کے معاصرین میں ایک الگ شناخت عطا کرتا ہے۔ انہوں نے اردو میں پہلا سائنسی ناول 'آدھی زندگی' کے نام سے شائع کیا۔ جس کی مقبولیت کا اندازہ اس بات سے لگایا جاسکتا ہے کہ اس کے 13 ایڈیشن شائع ہوئے۔

اظہار اثر اردو کے سچے بہی خواہ تھے۔ چنانچہ انہوں نے اردو کے لیے عملی اقدام بھی کیے۔ وہ دہلی کے رنجیت نگر علاقے میں رہتے تھے۔ انہوں نے وہاں کے سرکاری اسکولوں میں اپنی ذاتی کوششوں سے اردو تعلیم کا بندوبست کرایا اور وہاں اردو کی تعلیم دی جانے لگی۔

ایک بات جو شاید بہت کم لوگوں کو معلوم ہو کہ وہ شمع گروپ کے جاسوسی ناول 'مجرم' کے لیے بھی 'قانون والا' کے نام سے لکھا کرتے تھے۔ جس کے قارئین کی تعداد لاکھوں میں تھی۔ دراصل جاسوسی فکشن اظہار اثر کا شوق، شغف، جنون، پیشہ اور ضرورت سبھی کچھ بن گیا تھا جس کے تحت ان کا قلم زود نویس اور بسیار تحریر ہو چلا تھا۔ زندگی گزارنے کے لیے انہیں ہر ذی نفس کی طرح پیسوں کی ضرورت تو تھی ہی چنانچہ وہ نام کی پرواہ کیے بغیر جو بھی پیسہ دیتا اس کے لیے لکھتے گئے۔ ایک دلچسپ واقعہ انہوں نے بتایا کہ ''رسالوں میں ایک اشتہار بھی دیا کہ اپنے نام سے غزلیں اور افسانے لکھوایئے، بیس روپے فی افسانہ اور دو روپے فی شعر'' اور اس طرح نہ جانے کتنے ایسے ویسوں کو افسانہ نگار اور شاعر بنا دیا۔ اس سے ان کا یہ فائدہ ہوا کہ 1952 میں فی ماہ تین چار سو روپے کما لیتے تھے۔ اسی طرح 76-1975 میں لوگوں نے کثیر معاوضے پر ان سے ٹیلی ویژن کے لیے اپنے نام سے سیریل بھی لکھوائے۔

اظہار اثر کی یہ دلی خواہش تھی کہ مسلمان اور اردو والے سائنس پڑھیں، لکھیں، سوچیں اور سائنسی مزاج بنائیں۔ انہوں نے ایک بھرپور اور بامقصد زندگی جی تھی اور انہوں نے کبھی کسی کے سامنے دست سوال دراز نہیں کیا تھا۔ آج ہم میں ان خوبیوں کی بڑی کمی پائی جاتی ہے۔ کاش! ہم اپنا ذہن سائنسی، منطقی اور معروضی بنا سکیں، مفاد پرستی سے اپنا دامن چھڑا سکیں اور خودداری کو اپنا وطیرہ بنا سکیں تو یہ اظہار اثر کے تئیں ایک بہترین خراج عقیدت ہوگا۔ اظہار اثر کی موت سے پاپولر لٹریچر کا ایک باب ختم ہو گیا۔ (جون 2011)

مت سہل ہمیں جانو

یہ اس وقت کی بات ہے جب میں طفل مکتب تھا اور گاہے بگاہے خدا بخش لائبریری جایا کرتا تھا۔ جہاں سے علم و ادب کا چشمہ نہ جانے کتنوں کو سیراب کرتا آیا ہے۔ عظیم آباد کی عظیم سرزمین پر اس وقت علم و ادب کے چندے آفتاب چندے ماہتاب شخصیتیں خدا بخش لائبریری آیا کرتی تھیں۔ میرا حصہ دور کا جلوہ ہوا کرتا تھا۔ ان میں آسمان تحقیق کا درخشاں ستارہ قاضی عبدالودود، آسمان تنقید کا شہاب ثاقب کلیم الدین احمد، آسمان شاعری کے چمکتے ستارے جمیل مظہری اور رضا نقوی واہی کے ساتھ ساتھ میدان افسانہ کے شہسوار اختر اورینوی اور سہیل عظیم آبادی اہم اور خاص شخصیات ہیں۔ جو اپنی ضوفشانیوں سے آنکھوں کو خیرہ کرتی تھیں۔ پھر ایسا ہوا کہ یہ آفتاب و ماہتاب دھیرے دھیرے غروب ہوتے گئے۔ لیکن ان کے کارناموں کی تب و تاب اب بھی اپنی روشنی سے ایک جہان کو منور و تابناک کرتی آ رہی ہے۔

سہیل عظیم آبادی جن کی پیدائش کو اس جولائی میں سو سال پورے ہو رہے ہیں اردو فکشن کا ایک ایسا ہی روشن باب ہے۔ جس سے ایک پوری نسل فیضیاب ہوتی رہی ہے۔ سہیل عظیم آبادی پریم چند کے متاخر معاصر تھے اور ان کا حد درجہ احترام بھی کرتے تھے اور کسی قدر ان سے متاثر بھی تھے، لیکن مرعوب نہیں۔ جیسا کہ عام طور پر یہ سمجھ لیا گیا ہے کہ سہیل پریم چند اسکول کی توسیع ہیں۔ اس کے برعکس ہم یہ دیکھتے ہیں کہ انہوں نے اپنی ایک الگ راہ نکالی اور اپنی ایک الگ پہچان بنائی۔

ماہنامہ 'آجکل' نے ان کی وفات کے بعد ان کی خدمات کے اعتراف میں ان کے شایان شان ایک بھرپور خصوصی نمبر نومبر 1981 میں شائع کیا تھا جس میں ان کی سوانح اور شخصیت پر علی جواد زیدی، رضا نقوی واہی اور پروفیسر عبدالمغنی نے بھرپور مقالے تحریر کیے تھے۔

علی جواد زیدی نے سہیل عظیم آبادی کی خوبیوں کا احاطہ کرتے ہوئے لکھا تھا کہ بزرگ ادیبوں میں شامل ہونے کے باوجود وہ ابھرنے والے ادیبوں وصحافیوں سے خصوصی محبت کا برتاؤ کرتے تھے۔ ان کو وہ اوروں سے روشناس کرانے اوران کی ہمت بڑھانے میں کوئی کسر اٹھانہیں رکھتے تھے۔

رضا نقوی واہی ’ذکر اس پری وش کا‘‘ کے عنوان سے اپنی دلکش تحریر میں انہیں خراج عقیدت پیش کرتے ہوئے اس بات کا اعتراف کرتے ہیں کہ آج سوچتا ہوں کہ اگر سہیل عظیم آبادی نے میری حوصلہ افزائی اس حد تک نہ کی ہوتی اور میری طنزیہ شاعری میں دلچسپی نہ لی ہوتی تو شاید میں نے ظریفانہ شاعری پر توجہ نہ کی ہوتی۔ اسی طرح پروفیسر عبدالمغنی نے اپنے مضمون میں سہیل عظیم آبادی کی شخصیت اور فن کا احاطہ کرتے ہوئے لکھا کہ ابھی سہیل صاحب کی کچھ غیر مطبوعہ کہانیاں اور ناول بھی ہیں۔ پھر کئی مطبوعہ افسانے ابھی کسی مجموعے میں مرتب نہیں ہوئے ہیں۔ ممکن ہے کہ ان تخلیقات کی ترتیب واشاعت کے بعد سہیل صاحب کے فن کے کچھ اور اہم نکتے بھی سامنے آئیں۔ فکر وفن کے تحت پروفیسر محمد حسن نے اپنے مضمون میں سہیل عظیم آبادی کو بدلتے ہوئے منظر نامے کا رجز خواں قرار دیا۔ محمد حسن کہتے ہیں کہ رہا سہیل کا طرز بیان سو اس کی ایک بڑی خصوصیت ہے رومانی آراستگی کی کمی۔ سہیل کبھی رومانویت کے سیلاب میں نہیں بہے ان کی نظریں اپنے گردوپیش پر پوری محویت اور گہرائی سے جمی رہیں۔ اور انہوں تے اپنے اسلوب کو کبھی نقش ونگار سے سجانے کی کوشش نہیں کی۔

سہیل عظیم آبادی کے افسانوں کا تجزیہ کرتے ہوئے احمد یوسف لکھتے ہیں کہ سہیل عظیم آبادی کے افسانوں میں اکثر گاؤں کے ایسے جھگڑے بھی مل جاتے ہیں جن میں قبائلی زندگی کی جھلکیاں نظر آتی ہیں۔ ان کا کمال یہ ہے کہ وہ ان جھگڑوں کے درمیان سے بھی انسان دوست کرداروں کو برآمد کرتے ہیں۔ سہیل عظیم آبادی کے اسلوب فن کا جائزہ لیتے ہوئے قمر رئیس اس نتیجے پر پہنچتے ہیں کہ سہیل عظیم آبادی ان ادیبوں میں ہیں جن کے قلم کی سیاہی کبھی خشک نہیں ہوتی۔ وہ آخر وقت تک لکھتے رہے اور اپنے گردوپیش کے مسائل کے بارے میں سوچتے رہے۔ ان کی آخری دور کی کہانیوں میں فطری طور پر زیادہ فنی پختگی اور گہرائی کے آثار نظر آتے ہیں۔ سہیل عظیم آبادی کے چند نسوانی کردار پر خامہ فرسائی کرتے ہوئے شمیم نکہت لکھتی ہیں کہ سہیل عظیم آبادی نے ترقی پسند دور کو انگارے کی ہنگامہ خیزیوں سے لے کر جدید انحراف کی لہر تک دیکھا تھا اور اس کا تاثر

قبول کیا تھا۔ وہ ذہنی طور پر ترقی پسند تھے۔ اسی لیے ان کے افسانوں کے کردار اور مسائل عام زندگی کے کردار اور مسائل ہیں۔ انہوں نے اپنے گرد پھیلی ہوئی اس سماجی حقیقت کی تصویر کشی کی ہے جس میں عورت کسی نہ کسی شکل میں سماج کے اہم رکن کی حیثیت سے سامنے آتی ہے۔ اس خصوصی شمارہ میں سہیل عظیم آبادی کی شاعری پر مظہر امام اور سہیل عظیم آبادی کی صحافت پر ریاض عظیم آبادی کے مضامین شامل ہیں۔ اعجاز علی ارشد جو سہیل عظیم آبادی کے زمانے میں نوجوان تھے۔ انہوں نے سہیل عظیم آبادی کی تحریروں کا ایک بھرپور تحقیقی جائزہ لیا تھا اور اس حیثیت سے ان کا یہ مضمون کلیدی حیثیت اختیار کر گیا کہ اعجاز علی ارشد نے اپنے اس مضمون میں سہیل عظیم آبادی کی غیر مطبوعہ تخلیقات کی ایک لمبی فہرست دی ہے۔ تعجب ہے کہ سہیل عظیم آبادی کے انتقال کو آج کم وبیش 32 سال ہونے کو آئے لیکن ان کی ان تمام چیزوں کو اب تک یکجا نہیں کیا جا سکا ہے۔ طباعت و اشاعت تو دور کی بات ہے۔ ہاں البتہ ان کے فن اور شخصیت پر کچے پکے مقالات تحریر کر کے پانچ چھ ڈاکٹریٹ کی ڈگریاں ضرور حاصل کر لی گئیں۔ سہیل صاحب خود ڈاکٹر نہ تھے لیکن کتنوں کو ڈاکٹر بنا گئے۔

زیر نظر شمارہ اسی سوچ اور فکر کی طرف ایک پیش رفت ہے کہ ان کی غیر مطبوعہ تحریروں کو تلاش وجستجو کے بعد نہ صرف اکٹھا کیا جائے بلکہ اسے خاص اہتمام کے ساتھ شائع بھی کیا جائے۔ شکر ہے کہ اس جانب ہمارے دوست پروفیسر ارتضیٰ کریم نے توجہ کی اور اس کام کو ایک پروجیکٹ کے تحت کرنا شروع کیا بلکہ یہ کام اب تقریباً تکمیل کے مرحلے میں ہے۔ 'آجکل' کے اس شمارہ میں سہیل عظیم آبادی کی غیر مطبوعہ تخلیقات انہی کا عطیہ ہیں۔ جو انہیں سہیل صاحب کے صاحبزادے شان الرحمٰن صاحب سے حاصل ہوئیں وہ ان دنوں بستر علالت پر ہیں۔

اس شمارہ میں سہیل عظیم آبادی کی شخصیت پر معصوم عزیز کاظمی، اسرار گاندھی، سید احمد قادری اور شوکت حیات کی دلچسپ تحریروں کے علاوہ سہیل عظیم آبادی کے فکروفن پر اعجاز علی ارشد اور ارتضیٰ کریم کے مضامین شامل ہیں۔ اس طرح ہم نے اس شمارہ میں سہیل عظیم آبادی کے فکروفن کا مکمل احاطہ کرنے کی کوشش کی ہے۔

(جولائی 2011)

آزادی کا مطلب

یوم آزادی مبارک'۔ یہ جملہ جتنا جذباتی ہے اتنا ہی مشینی بھی۔ 15 اگست کو ملی آزادی کی یاد میں اسے قومی تہوار کے طور پر ہم سارے دیش واسی ایک ساتھ ملک کر مناتے ہیں۔ 1947 میں اسی دن ہم نے برطانوی سامراج سے آزادی اور خود مختاری حاصل کی تھی۔ یہ دن ہندوستان کی تاریخ کا ایک نہایت ہی ناقابل فراموش دن ہے۔ چنانچہ اسے ہم پورے جوش وخروش کے ساتھ انفرادی اور اجتماعی سطح پر مناتے ہیں۔ آج اس متبرک تاریخ کو پورے 64 سال ہو چکے ہیں۔ اور اس پورے 64 سال کے دوران ہم نے جو کچھ حاصل کیا ہے وہ گرچہ بہت ہے لیکن ابھی بہت کچھ ہمیں اور حاصل کرنا ہے۔ فیض نے بہت صحیح کہا ہے:

چلے چلو کہ ابھی منزل نہیں آئی

ابھی ہم نے صرف ایک غیر ملکی سامراج سے آزادی حاصل کی ہے۔ ابھی ہمیں تعصب، تنگ نظری، ذاتی مفاد اور اپنے نفس کی غلامی سے آزادی حاص کرنا باقی ہے۔ بہ الفاظ دیگر ہمیں اب خود اپنی ذات اور اس کی خامیوں سے آزادی حاصل کرنا ہے۔ یہ لڑائی ایک غیر ملکی سامراج سے لڑکر آزادی حاصل کرنے سے زیادہ اہم اور مشکل ہے۔ اور اس لڑائی کو تیر تفنگ، گولی بارود یا کسی بھی خطرناک سے خطرناک ہتھیار سے نہیں جیتا جاسکتا۔ بلکہ اسے اپنے نفس کو قابو میں کر کے ہی حاصل کیا جاسکتا ہے۔ آج آئے دن ایک دوسرے سے دست وگریباں اور ایک دوسرے کو نیچا دکھلانے کی ہوڑ میں ہم اپنی زندگی کو تباہ و برباد کرتے نظر آتے ہیں۔ ہمارا ملک ایک وسیع وعریض ملک ہے جس میں کشمیر سے کنیا کماری تک بھانت بھانت کے لوگ رہتے بستے آئے ہیں۔ اور جہاں ہر کوس دو کوس پر بولیاں بدلتی جاتی ہیں۔ اور جہاں دنیا کے بیشتر مذاہب کے لوگ ایک ساتھ

مل کر بود و باش اختیار کرتے آئے ہیں۔ایسے ملک میں وسیع القلبی کی اہمیت کس قدر بڑھ جاتی ہے،اس کا اندازہ کرنا مشکل نہیں۔تعصب اور تنگ نظری سے بالاتر ہوکر پیار اور محبت سے ہم نے انفرادی اور اجتماعی سطح پر بہت کچھ حاصل کیا ہے اور بہت کچھ اور حاصل کر سکتے ہیں۔اس میں کوئی شبہ نہیں کہ یہ کام آسان نہیں بلکہ بہت مشکل ہے۔برطانوی غیر ملکی سامراج سے آزادی حاصل کرنے سے بھی زیادہ.....!اور یہ کام انفرادی طور پر خود اپنی ذات سے جدوجہد کر کے اس پر قابو حاصل کیا جا سکتا ہے۔اگر ہم میں سے ہر فرد اپنی ذات کے گریبان میں جھانکنے کی عادت ڈال لے بہ الفاظ دیگر خود احتسابی کرنے لگ جائے تو کامیابی بہت دور نہیں۔اپنی ذات سے شروع ہونے والا یہ کام اپنی ذات کے بعد اپنے گھر،محلہ اور گاؤں اسی طرح شہر،صوبہ اور ملک وقوم تک مرحلہ وار بڑھایا جا سکتا ہے۔

کرپشن اور بدعنوانی آج ہمارے ملک کو اندر ہی اندر کسی گھن کی طرح چاٹ چاٹ کر کھوکھلا کرتی جارہی ہے۔اگر اس کی طرف فوری طور پر دھیان نہیں دیا گیا تو ہم بہت جلد تباہی اور بربادی کے شکار ہوں گے۔آج بدعنوانی اور کرپشن کے خلاف آواز تو اٹھائی جارہی ہے لیکن کسی نتیجے پر پہنچنا مشکل نظر آرہا ہے۔کاش کہ ہم اس ایشو پر بالاتفاق کسی نتیجے پر پہنچ سکیں۔لیکن مشکل تو یہ ہے کہ آواز اٹھانے والوں میں سے بہت سے ایسے لوگ ہیں جن کے پاس خود لاکھوں اور کروڑوں نہیں بلکہ اربوں اور کھربوں کی دولت جمع ہے اور جس کے بلا شرکت غیرے وہ مالک بنے بیٹھے ہیں۔جس ملک میں غریبی،بے روزگاری،بھکمری کا بول بالا ہو اس ملک میں دولت جمع کر کے اس پر کسی ناگ کی طرح کنڈلی مار کر بیٹھے کسی دوسرے پر الزام عائد کرنا شرافت کی دھجیاں اڑانے کے مماثل ہے۔آج کرپشن اور بدعنوانی کا بول بالا ہے اور بیشک اس کے خلاف آواز اٹھائی جانی چاہئے اور ایسی ذہنیت پر قدغن لگنا چاہئے۔لیکن آواز اٹھانے والوں کو اور اس تحریک کو چلانے والوں کو پہلے خود اپنے گریبان میں جھانک کر دیکھ لینا چاہئے۔مثل مشہور ہے کہ پاپی پر پہلا پتھر وہ اٹھائے جو خود پاپی نہ ہو۔دولت جمع کرنا اور دولت کے انبار پر بیٹھ کر بدعنوانی اور کرپشن کے خلاف آواز اٹھانا ہمیں شوبھا نہیں دیتا۔ہمارے پاس دولت کا انبار ہے اور ہمارے پڑوس میں بھوکے ننگوں کی ایک لمبی قطار۔ایسے میں اس دولت کا مالک ہونا اپنے آپ میں خود سب سے بڑا کرپشن

بن جاتا ہے۔آپ کے ملک میں لاکھوں کروڑوں انسان جن کو پیٹ بھر کھانا نصیب نہ ہوایسے میں اپنی دولت کا فخر یہ انداز میں حساب کتاب دینا بھی خود اپنے آپ میں کرپشن ہی کہلائے گا۔آج متبرک اور دھارمک استھلوں سے دولت کے انبار کا انکشاف ہونا ہمیں حیران و پریشان کر دیتا ہے کہ جس جگہ پر روحانیت کا بول بالا ہونا چاہئے تھا۔ان جگہوں پر مادیت اور سرمایہ داری کا قبضہ کیوں کر ہورہا ہے۔کاش روحانیت اور مادیت کی اس کشمکش میں روحانیت کو فتح حاصل ہو۔کرپشن اور بدعنوانی آپ سے آپ خود ہی مٹ جائے گی۔اور ہمیں ایک دوسرے پر کیچڑ اچھالنے کی ضرورت بھی نہیں محسوس ہوگی۔ان بدعنوانی کرپشن، آپسی بھید بھاؤ، فرقہ پرستی، جھوٹ اور عناد، تعصب اور تنگ نظری سے ہم آزادی حاصل کرلیں، حقیقی معنوں میں ہم تبھی آزاد ہوں گے اور تبھی ہمارا ملک سارے جہاں سے اچھا کہلائے گا۔

اس بار ہم غبار کارواں کے تحت ڈاکٹر خلیق انجم کی دلچسپ خودنوشت شائع کر رہے ہیں۔ جس میں انہوں نے کہا ہے کہ یہ مقالہ میری سوانح کا پوری طرح احاطہ نہیں کرتا۔دیگر مقالات میں معروف ادیب احسن مارہروی کی حیات و شخصیت پر، سید مرتضٰی حسین بلگرامی کا ایک تحقیقی مقالہ پیش کیا جارہا ہے۔جس میں احسن مارہروی کا غیر مطبوعہ کلام بھی شامل ہے۔اس بار ہم خالص ادبی مضامین سے ہٹ کر بھی کچھ شائع کر رہے ہیں۔جس میں مقبول احمد سراج کا مضمون ''منی پال کا ہیری ٹیج ولیج'' شامل ہے اور بلاشبہ یہ رہائشی ورثے کا عجائب خانہ نظر آتا ہے۔تہذیبی اور ثقافتی سلسلے کو ہم آگے بھی جاری رکھنے کی کوشش کریں گے۔قدیم تعمیری روایات اور فنون کسی سماج کی اقدار کے آئینہ دار ہوتے ہیں۔اردو میں میڈیا تنقید پر بہت کم لکھا گیا ہے۔ایسے میں ارشد امان اللہ کا اکیسویں صدی کی چند مطبوعات کے حوالے سے اردو میں میڈیا تنقید پر تفصیل سے اظہار خیال کرنا ہمارے قارئین کو یقیناً پسند آئے گا۔افسانے اور منظومات حسب معمول شامل ہیں۔یہ کلام اور کہانیاں کتنی اچھی ہیں یا کتنی معیاری ہیں اس کا فیصلہ ہم نہیں آپ کریں گے۔ ہمارے پاس تخلیقات انبار کی صورت میں آتی رہتی ہیں انہی میں سے کچھ چیزیں چھان پھٹک کر آپ کی خدمت میں پیش کرتے رہتے ہیں۔

(اگست 2011)

بوکر کے بہانے

ایک سچا فنکار کسی صلہ اور انعام کے لالچ کے بغیر اپنا فن پارہ یا ادب پارہ تخلیق کرتا رہتا ہے۔ ایسے میں اسے اس کی بہترین تخلیق کے لیے کسی اہم ادارے سے انعام واعزاز سے بھی نواز دیا جائے تو وہ فنکار ایک نئی طاقت اور قوت سے ایک نئے عزم کے ساتھ نئی منزلوں کی طرف بڑھتا چلا جاتا ہے۔ لیکن اکثر و بیشتر ایسا کم ہی ہوتا ہے اور عام طور پر ''اندھا بانٹے ریوڑی اپنے اپنوں کو دے'' کے مصداق ہو کر رہ جاتا ہے۔ اور حق بہ حق دار رسید عام طور پر کم ہی ہو پاتا ہے۔ مال وزر اور شہرت کا جہاں عمل دخل ہو وہاں سیاست چلی ہی آتی ہے۔ یہ عام صورت حال ہے۔ اس صورت حال میں بھی انعام واعزاز کی وقعت گرچہ کم ہوتی ہے، لیکن اہمیت بہر حال برقرار رہتی ہے۔

بین الاقوامی سطح پر نوبل پرائز سب سے بڑا، اہم اور خاص اعزاز مانا جاتا ہے جو مختلف شعبوں میں اہم، اچھوتا اور خاص کارناموں کے لیے دیا جاتا ہے۔ نوبل کے بعد شاید بوکر پرائز کی خاص اہمیت ہے جو دولت مشترکہ ممالک کے ادیبوں کے لیے مخصوص ہے لیکن یہ انعام صرف انگریزی فکشن کے لیے ہر سال دیا جاتا ہے۔ انعام کے لیے ناموں کے انتخاب میں گرچہ بڑی حد تک شفافیت برتی جاتی ہے لیکن سیاست سے یہاں بھی کلی طور پر انکار نہیں کیا جاسکتا۔ بوکر پرائز جیتنے والوں کو جہاں ایک بڑا مالی فائدہ حاصل ہوتا ہے، وہیں اس انعام سے اس ادیب کو راتوں رات بین الاقوامی شہرت و کامرانی حاصل ہو جاتی ہے اور اس ناول کو جس پر یہ انعام دیا جاتا ہے ادبی حیثیت کے ساتھ ساتھ تجارتی نقطۂ نظر سے بھی اہمیت حاصل ہو جاتی ہے۔ انعام حاصل کرنا یقیناً بڑی بات ہوتی ہے لیکن ہمیں بوکر انعام کے لیے ابتدائی فہرست میں کسی فن پارے کا نام آجانا بھی بڑی اہمیت کا حامل سمجھا جاتا ہے۔ وکی پیڈیا کے مطابق 1968 میں بوکر میک کنل کمپنی کے ذریعے شروع کیے گئے بوکر میک کنل پرائز کو عرف عام میں بوکر پرائز کے طور پر جانا جاتا ہے۔ لیکن 2002 میں بوکر پرائز فاؤنڈیشن کو اس کے انتظام وانصرام کی منتقلی کے بعد بھی 'بوکر' کو آفیشیل ٹائٹل

کے طور پر برقرار رکھا گیا۔ یہ فاؤنڈیشن ایک آزاد رجسٹرڈ فلاحی ادارہ ہے جو بوکر پرائز ٹریڈنگ لمیٹڈ کے زیر اہتمام چلایا جاتا ہے۔ بوکر پرائز میں 21 ہزار پونڈ دیا جاتا رہا ہے جسے 2002 میں 50 ہزار پونڈ کر دیا گیا اور اس طرح یہ دنیا کا سب سے بڑا ادبی ایوارڈ ہو گیا۔

انعام کے لیے انتخابی عمل ابتدائی مرحلہ کو ایک ایڈوائزری کمیٹی انجام دیتی ہے جس میں ایک مصنف، دو پبلشرز، ایک لٹریری ایجنٹ، ایک کتب فروش، ایک لائبریرین اور ایک چیئر پرسن شامل ہوتے ہیں، ان بھی ارکان کا تقرر بوکر پرائز فاؤنڈیشن کرتا ہے۔ یہ ایڈوائزری کمیٹی ہی انعام کے لیے ججوں کا ایک پینل تیار کرتی ہے۔ اس پینل کی خاص بات یہ ہے کہ ہر سال اسے تبدیل کر دیا جاتا ہے۔ شاذ و نادر ہی ایک جج دوسری مرتبہ کے لیے منتخب کیا جاتا ہے۔ ججوں کے اس پینل میں عام طور پر ادبی نقاد، رائٹر، مدرس اور اہم عوامی شخصیات کو چنا جاتا ہے۔ اس انعام کا اعلان عام طور پر ہر سال اوائل اکتوبر میں لندن کے گلڈ ہال میں کیا جاتا ہے۔

1981 میں سلمان رشدی کو ان کے ناول 'مڈنائٹس چلڈرن' پر اس انعام سے نوازا جا چکا ہے۔

1993 میں 'بوکر آف بوکرز پرائز' کے نام سے یہ انعام بھی بدنام زمانہ ادیب سلمان رشدی کو ''مڈنائٹس چلڈرن'' پر ہی دیا گیا۔ یہ خاص انعام بوکر کے پہلے 25 سال مکمل ہونے کے موقع پر دیا گیا۔ اسی طرح کا ایک ایوارڈ ایک بار پھر 'دی بیسٹ آف دی بوکر' 2008 میں بوکر کے 40 سال پورے ہونے کے موقع پر دیا گیا اور یہ انعام بھی 'مڈنائٹس چلڈرن' کو ہی دیا گیا۔ 'مڈنائٹس چلڈرن' پر ان نوازشوں کو نہ صرف ادبی حلقوں میں بلکہ عوامی حلقوں میں بھی مشکوک نظروں سے دیکھا گیا۔ آخر اس کے پیچھے وہ کون سے عوامل تھے جو ایک خاص ادیب کو ایک خاص ادب پارہ پر ہی بار بار نوازا جاتا رہا۔ بہرحال اس انعام سے ہندوستان کے تین ادیبوں کو بھی نوازا گیا ہے۔ 1997 میں اروندھتی رائے کو ان کے ناول دی گاڈ آف اسمال تھنگس پر، 2006 میں کرن دیسائی کو ان کے ناول 'دی ان ہیریٹنس آف لاز' پر اور 2008 میں اروند اڈیگا کو ان کے ناول ''دی وائٹ ٹائیگرز'' پر بوکر پرائز سے نوازا جا چکا ہے۔

2011 کے بوکر انعام کے لیے انتخابی عمل شروع ہو چکا ہے۔ نیوز ایجنسیوں کے مطابق بوکر انعام یافتہ ادیب ایلین ہولنگ ہرسٹ کا نام ان 13 ادیبوں میں شامل ہے جنہیں ابتدائی طور پر بوکر پرائز کے لیے نامزد کیا گیا ہے۔ ایلین ہولنگ ہرسٹ کو 2004 میں ان کے ناول 'دی لائن آف بیوٹی' کے لیے بوکر پرائز کا حق دار قرار دیا گیا تھا جب کہ اس سال ان کی نامزدگی ان کے نئے ناول

'دی اسٹرینجرس چائلڈ' کے لیے عمل میں آئی ہے۔

بوکر پرائز کے لیے نامزد ہونے والے چھ ادیبوں کی حتمی فہرست 6/ستمبر کو جاری کی جائے گی جب کہ 50 ہزار پونڈ مالیت کے ادبی ایوارڈ کا اعلان 18/اکتوبر کو کیا جائے گا۔ شارٹ لسٹ ہونے والے دیگر پانچ ادیبوں کو ڈھائی ہزار پونڈ انعام اور اعلیٰ ترین جلد سے آراستہ ان کی اپنی کتاب پیش کی جائے گی۔ ایلن ہولنگ ہرسٹ کے علاوہ جن 12 ادیبوں کے ناموں کا اعلان کیا گیا، ان میں دو ادیب سیبسٹیئن بیری اور جولین بارنز پہلے بھی بوکر انعام کے لیے نامزد ہو چکے ہیں۔ اس فہرست میں کناڈا کے تین ادیبوں ایلیسن پک، پیٹرک دوٹ اور ایسی ایڈوگیان کے نام بھی شامل ہیں۔ دیگر چار ادیبوں اسٹیفن کیلمین، اے ڈی ملر، ایوٹ ایڈورڈس اور پیٹرک میلکینس کو ان کے پہلے ناولوں کی بنیاد پر نامزد کیا گیا ہے۔

اس سال بوکر پرائز کے لیے 138 کتابوں کو منتخب کیا گیا تھا اور ان میں سے 13 ادیبوں کو ابتدائی فہرست میں شامل کیا گیا ہے۔ برطانوی خفیہ ادارہ کی سابق سربراہ ڈیم اسٹیلا ریمنگٹن اس سال ججوں کے پینل کی سربراہی کر رہی ہیں جب کہ پینل کے دیگر ارکان ادیب اور صحافی میتھیو ڈانکونا، رائٹر سوزن ہل، ادیب اور سابق رکن پارلیمنٹ کرس ملن اور ڈیلی ٹیلی گراف سے منسلک صحافی گیبی وڈ ہیں۔ گزشتہ سال بوکر پرائز ہاورڈ جیکبسن کو ان کے ناول 'دی فنکلر کوئسچن' پر دیا گیا تھا۔ انہوں نے گزشتہ سال کے فیورٹ پیٹ کیری کو ہرایا تھا۔ اس سال ایلن ہولنگ ہرسٹ کو بوکر پرائز کے لیے مضبوط دعویدار قرار دیا جا رہا ہے جب کہ ان کے بعد جولین بارنز کا نمبر آتا ہے جو ماضی میں تین بار اس انعام کے لیے شارٹ لسٹ ہو چکے ہیں۔

انعام واکرام سے بلاشبہ ادب میں یا زندگی کے دیگر کسی بھی شعبے میں مسابقت کا جذبہ پنپتا ہے۔ جس سے بہتر نتیجہ ہمارے سامنے آتا ہے۔ ہمیں حوصلہ ملتا ہے اور امنگ بھی جاگتی ہے۔ لیکن بعض اوقات انعام واکرام کی تحصیل ہی بعض لوگوں کا مقصد بن جاتی ہے اور وہ اسی تگ ودو اور توڑ جوڑ میں لگ جاتے ہیں نیز وہ اپنے ہدف سے دور بھی ہوتے چلے جاتے ہیں۔ ایسے لوگ بے شک مال ودولت اور شہرت تو ضرور حاصل کر لیتے ہیں لیکن کوئی دیرپا اور لافانی تخلیق پیش کرنے سے قاصر رہتے ہیں۔ ہمیں تو صرف اپنے قلم کی عزت وآبرو کی پرواہ کرنی چاہئے نہ کہ کسی صلے کی۔

(ستمبر 2011)

مجاز! تم بہت یاد آئے

مجاز اگر زندہ ہوتے تو آج ہم ان کی سوویں سالگرہ بڑے تزک واحتشام کے ساتھ منا رہے ہوتے۔ وہ انسان ہی ایسا ہر دلعزیز اور ہر کسی کو دوست رکھنے والا تھا، مگر ایسا نہ ہو سکا۔ اردو کے جن ادبا، وشعرار کو کم عمر نصیب ہوئی ان میں اسرار الحق مجاز جو اردو شاعری کی حقیقت تھے اور اس وقت کے آسمانِ شاعری کے چندے آفتاب اور چندے ماہتاب میں شامل تھے اور دوسرے اردو افسانے کا درخشاں ستارہ سعادت حسن منٹو۔ اس وقت اردو کے آسمان ادب پر یہ دو مختصر تارے اپنی تابانی اور ضیا پاشی کے سبب سب سے نمایاں نظر آتے ہیں۔ لیکن ان دونوں ہی ادیبوں کو شراب نے زندگی بھر بے قرار رکھا۔ اب یہ تو علام الغیوب ہی جانتا ہے کہ ان کی بادہ خواری نے اردو ادب کو ایسے لافانی ادب پارے اور فن پارے دیے یا شاید وہ بلانوش نہ ہوتے تو اس سے بھی زیادہ کچھ اور لافانی چیزیں اردو کے ادبی سرمائے میں بیش قیمت اضافہ کر سکتے۔

منٹو کا ذکر پھر کبھی۔ آج ہم مجاز کے اسرار پر باتیں کریں گے۔ ذکر ہو رہا تھا مجاز کے سوویں سالگرہ کا لیکن مجاز تو پچاس سال بھی نہ جی سکے یا شاید خدا کو ہی یہ منظور نہ تھا کہ مجاز جیسے بچہ دل معصوم انسان کو معصیت کے گڑھے میں گرنے دیا جائے۔ چنانچہ محض 44 سال کی عمر میں اسے اپنے پاس بلا لیا اور اسے مزید فرصت گناہ دینے سے چار دن پر بھی راضی نہ ہوا۔ اس کا احساس خود مجاز کو بھی ہر آن رہتا تھا:

زندگی ساز دے رہی ہے مجھے سحر و اعجاز دے رہی ہے مجھے
اور بہت دور آسمانوں سے موت آواز دے رہی ہے مجھے

مجاز کے لواحقین اور متعلقین نے کیا کیا نہ جتن کیے مگر سامان سو برس کا ہے پل کی خبر نہیں۔ مجاز اللہ کو پیارے ہو گئے۔ موت برحق ہے اور ایک دن سب کو آنی ہے سو مجاز کو بھی آئی۔ لیکن جس کم عمری میں آئی اس نے سبھوں کو رنجیدہ اور مغموم کر دیا۔ حالانکہ مجاز کی بسیار نوشی کے سبب کسی کو تعجب بھی نہ ہوا لیکن افسوس ضرور ہوا کہ ایک اچھا انسان اور ہر دلعزیز شاعر جس سے ہم

سبھوں کو بہت کچھ توقع تھی وہ اب ہمارے بیچ نہیں رہا۔

قصور وار یہ کرسی بھی ہے جس پر آج یہ ناچیز بیٹھا ہے۔اس زمانے میں جوش ملیح آبادی 'آجکل' کے ایڈیٹر تھے جو مجاز کے بہت اچھے دوست اور یار بلانوش ہوا کرتے تھے اور جب مجاز کی بلانوشی حد سے تجاوز کرنے لگی تو یہی جوش مجاز کو تلقین کرتے کہ مجاز گھڑی رکھ کر پیا کرو۔ جواب میں مجاز کہتے 'میرا بس چلے تو گھڑا رکھ کر پیوں'۔ پھر ایک وقت وہ بھی آیا جب جوش نے مجاز کی اصلاح کے لیے ایک طویل پندنامہ بھی لکھ ڈالا لیکن انسانی فطرت کا تضاد ملاحظہ ہو کہ ایک طرف پندونصیحت تو دوسری طرف سورج کے غروب ہونے اور جوش کے طلوع ہونے کا سلسلہ بھی جاری رہا جس میں مجاز ساتھ ہوتے۔اسی طرح آج کل کے سب ایڈیٹر جذبی کا ذکر بھی ضروری معلوم ہوتا ہے کہ جنہوں نے نورا کے ساتھ مجاز کے عشق کو بڑھاوا دیا۔

بہرحال ترقی پسند شاعروں میں فیض کے بعد شاید مجاز ہی ایسا شاعر ہے جس کے سب سے زیادہ اشعار زبان زد خاص وعام ہیں۔ مجاز کا خمیر عشق، انقلاب اور بغاوت سے گوندھی ہوئی مٹی سے اٹھا تھا اور اس خمیر سے کچھ ایسی چیزیں وجود میں آئیں جن کا استقبال کیا گیا اور ہاتھوں ہاتھ لیا گیا۔ مجاز کے احباب اور متعلقین نے مجاز کے تعلق سے جو باتیں کہیں اور مشہور ہوئیں وہ مجاز کی شخصیت کو افسانوی اور داستانوی حیثیت عطا کرتی ہیں۔

اسرارالحق مجاز رومانویت کے شہید تھے جو انقلاب اور بغاوت کے مجاز بن گئے۔ مجاز کی زندگی نے اگر وفا کی ہوتی تو وہ آج ترقی پسند شعرا کی صف میں سب سے اہم، نمایاں اور خاص الخاص شاعر ہوتے۔ لیکن وہ عشق مجازی میں ناکامی کے سبب اپنی شخصیت کو سنبھالنے اور سمیٹنے میں ناکام رہے اور یہی ان کی تنزلی اور بربادی کا سبب بنا۔ بہرحال مجاز کا جو کچھ بھی سرمایہ ہمارے سامنے ہے وہ انہیں زندہ رکھنے کے لیے کافی ہے اور جب جب رومانوی شاعری کا ذکر آئے گا، انہیں نظرانداز کرنا یا فراموش کردینا مشکل ہی نہیں ناممکن ہوگا اور جب جب انقلابی شاعری کا ذکر آئے گا تو وہاں بھی:

ترے ماتھے پہ یہ آنچل بہت ہی خوب ہے لیکن

تو اس آنچل سے اک پرچم بنالیتی تو اچھا تھا

اور اس قبیل کے دوسرے اشعار کے بغیر یہ ذکر نامکمل ہوگا۔

مجاز ایک ایسا خوش نصیب شاعر ہے جس کے اشعار اردو شاعری کے بیشتر شائقین کو ازبر ہیں اور ترانہ علی گڑھ تو ایسا لافانی شاہکار ہے جو علیگ برادری میں جوش وجذبہ بھرنے کا کام رہتی دنیا تک کرتا

رہے گا۔ وہیں بحیثیت عاشق وہ ایک ایسا بدنصیب شخص ہے جس نے عشق تو کیا لیکن ناکامی ہی ہاتھ آئی۔ یہ بھی قدرت کی ستم ظریفی ہے کہ جب حسین وجمیل لڑکیاں مجاز کے پیچھے بھاگتی تھیں، اس نے کوئی توجہ نہ دی اور جب مجاز نے اپنی پسند کی لڑکیوں کے تعاقب میں بھاگنا شروع کیا تو ان خوبان قاتل نے اہمیت نہ دی اور ایک وقت ایسا آیا کہ مجاز ہر کس وناکس لڑکی کے پیچھے بھاگنے لگے۔ نتیجے میں ناکامی اور فرسٹریشن ہی ہاتھ آئی اور وہ شباب کی کمی شراب سے پوری کرنے کی ناکام کوشش کرنے لگے۔

مجاز پر بہت کام ہوئے۔ مجاز کے اشعار آج بھی گنگنائے جاتے ہیں اور گنگنائے جاتے رہیں گے لیکن میری ناقص رائے میں یہ تمام باتیں مجاز جیسے شاعر کے لیے ناکافی ہیں۔ مجاز پر یوں تو مجاز کے دل وجگر فیض اور جذبی اور ان کے دست وباز و سردار اور مخدوم نے بھی لکھا ہے مگر یہ ذرا رسما ہی سے ہیں اور ان کے بعد تو جو کچھ بھی لکھا گیا وہ اکثر وبیشتر ان کا چربہ ہی ہیں اور یہ تکرار کی حیثیت رکھتے ہیں۔ البتہ ان خس وخاشاک کے درمیان دو ایک چیزیں ضرور سامنے آئیں جو قابل لحاظ اور لائق ذکر ہیں۔ شارب ردولوی کا مونوگراف اور یوسف مرزا کی ڈرامائی پیشکش قابل ذکر ہیں۔ لیکن 'غم دل وحشت دل' پروفیسر محمد حسن کا ایک ایسا دستاویزی کارنامہ ہے جو مجاز کو سمجھنے اور سمجھانے میں بہت حد تک معاون اور کارگر ہوگا۔ پروفیسر محمد حسن نے مجاز کی زندگی پر مبنی یہ سوانحی ناول تخلیق کرکے مجاز سے اپنی عقیدت اور محبت کا ثبوت دیا ہے۔ گو کہ محمد حسن کا یہ ناول تخلیق سے زیادہ تنقید اور تحقیق معلوم ہوتا ہے کہ بنیادی طور پر محمد حسن ایک نقاد ہی تھے لیکن بہر حال اس کی تخلیقیت سے بھی یکسر انکار نہیں کیا جاسکتا۔ محمد حسن کا یہ ناول ایک دو دن نہیں بلکہ کم وبیش پورے پچاس سال کی محنت کا ثمرہ ہے۔ محمد حسن نے مجاز کے انتقال کے بعد گل نغمہ کے نام سے مجاز سے متعلق اپنی ڈائری کے چند اقتباسات 1955 میں پاکستان کے مشہور رسالہ 'نقوش' میں پیش کیے تھے۔ اسی ڈائری کے مزید اندراجات شرح وبسط کے ساتھ لکھ کر ناول کی شکل دے دی جو یقیناً ایک اہم دستاویزی کارنامہ ہے۔

اسی طرح آل احمد سرور نے مجاز کے فن اور شخصیت پر 'خوب پہچان لو مجاز ہوں میں' کے عنوان سے ایک ریڈیو فیچر پیش کرنے کی کامیاب کوشش کی ہے۔ لیکن مجاز محض اتنے ہی کے حق دار نہیں، مجاز کی اسطوری، افسانوی شخصیت پر ڈرامے لکھے جانے چاہئیں اور فلمیں بھی بنی چاہئیں اور فلمی دنیا میں تو ان کے اپنے بھی موجود ہیں۔ فی الوقت، ہم نے مجاز کو ایک حقیر سا نذرانہ پیش کرنے کی کوشش کی ہے۔

(اکتوبر 2011)

نوبل کے تنازعات

زیر نظر شمارہ میں یکتائے روزگار ادیب سارتر پر ایک دلچسپ مضمون شامل ہے جس نے نوبل انعام قبول کرنے سے انکار کر کے ایک مثال قائم کی۔ کیونکہ اس کی نظر میں کوئی بھی انعام کسی کارنامہ کے ہم پلہ نہیں نیز یہ کہ کوئی بھی انعام انصاف سے حق بہ حق دار رسید نہیں ہوتا۔ نوبل انعام شروع سے ہی تنازعہ کا شکار رہا ہے۔ نوبل کمیٹیوں پر سیاسی ایجنڈے کے تحت مستحق امیدواروں کو نظر انداز کرنے کا الزام عام ہے۔ ان پر یوروپ نوازی کا بھی الزام ہے۔ ادبی انعامات کے سلسلے میں یہ خیال عام ہے۔

متنازعہ امن انعامات میں 2009 کا نوبل امن انعام شامل ہے جو بارک اوباما کو دیا گیا۔ اوبامہ بھی خود کو اس ایوارڈ کا مستحق نہیں سمجھتے۔ اوبامہ سے پہلے جمی کارٹر اور الگورے کے انعامات کے بارے میں بھی کچھ یہی صورت حال رہی۔ سب سے زیادہ نکتہ چینی ہنری کسنجر اور لے دوس تھو کو دیے گئے انعام پر ہوئی، جنہوں نے بعد میں انعام لینے سے انکار کر دیا تھا۔ اس کے نتیجہ میں ناروے کی نوبل کمیٹی کے دو اراکین مستعفی ہو گئے تھے۔ کسنجر اور تھو کو یہ انعام جنوری 1973 میں شمالی ویتنام اور امریکہ کے مابین جنگ بندی کی کوششوں کے صلے میں دیا گیا تھا۔ لیکن بہتوں کی رائے تھی کہ کسنجر امن کے حامی نہیں بلکہ جنگ کے محرک تھے۔

اسرائیل اور فلسطین کے مابین امن مساعی کے فروغ کے لیے 1994 میں یاسر عرفات، شمعون پیریز اور اسحاق رابن کو امن انعام دیا گیا تھا جب کہ نہ تو فلسطینی رفیوجیوں کا کوئی مسئلہ حل ہو پایا تھا اور نہ ہی کوئی حتمی سمجھوتہ ہوا تھا۔ 2004 کا ادبی انعام الفریڈ جیلنک کو دیا گیا تو سویڈش اکادمی کے ایک رکن کنوت اہنلوند نے یہ الزام لگاتے ہوئے استعفیٰ دے دیا تھا کہ جیلنک کے انتخاب سے تمام ترقی پسند طاقتوں کو نا قابل تلافی نقصان پہنچا ہے۔ 2009 کا ادبی انعام ہیر تا ملر

کو دیا گیا۔ اس پر بھی نکتہ چینی ہوئی تھی۔ اس سے بہتوں کو یہ احساس ہوا کہ اس انعام کے ذریعہ یوروپ والوں کو زیادہ نوازا جاتا ہے۔

1949 میں پرتگال کے نیورلوجسٹ انٹونیو ایگاس مونز کو پری فرنٹل لیوکوٹومی تیار کرنے پر فزیولوجی یا میڈیسن کا انعام دیا گیا۔ جب کہ ایک سال قبل ڈاکٹر والٹر فری مین نے اس کا تیز رفتار اور آسان عمل تیار کیا تھا۔ ناروے کی نوبل کمیٹی اس بات کی تصدیق کر چکی ہے کہ مہاتما گاندھی کو 39-1937، 1947 اور جنوری 1948 میں ان کے قتل سے چند دنوں قبل امن انعام کے لیے نامزد کیا گیا تھا۔ بعدازاں اس کے اراکین نے اس بات پر افسوس بھی ظاہر کیا کہ انہیں انعام نہیں دیا گیا۔ ناروے کی نوبل کمیٹی کے سکریٹری گیئر لندیستاد نے 2006 میں کہا کہ 106 سال کی تاریخ میں سب سے بڑی غلطی یہ ہوئی کہ مہاتما گاندھی کو نوبل امن انعام نہیں دیا گیا۔ جب 1989 میں دلائی لاما کو امن انعام سے نوازا گیا تو کمیٹی کے چیئر مین نے کہا تھا کہ ایک طرح سے یہ مہاتما گاندھی کے لیے خراج عقیدت ہے۔ اور بھی کئی لوگوں کو امن انعام سے محروم رکھا گیا جنھوں نے امن کی خاطر گراں قدر خدمات سرانجام دی تھیں۔ مؤقر جریدہ Foreign Policy سے گاندھی کے ساتھ ساتھ الینور روزاویلٹ، وکلاو حویل، کین سارو ویوا، ساری نصیبہ اور کورازن اکینو کو ان لوگوں کی فہرست میں شامل کیا ہے جنہیں کبھی انعام نہیں ملا، لیکن ملنا چاہیے تھا۔

ادبی انعام کا بھی یہی حال رہا ہے۔ بہت سارے ممتاز قلم کار سیاسی یا غیر ادبی وجوہات کی بنا پر اس انعام سے محروم رہے ہیں۔ یوروپ اور سویڈن کے مصنفین پر زیادہ توجہ رہی ہے۔ پیٹر انگلینڈ 2009 میں سویڈش اکادمی کے مستقل سکریٹری تھے۔ انہوں نے یہ بات تسلیم کی ہے کہ یوروپ نوازی اس ایوارڈ کے لیے ایک مسئلہ ہے۔ اکادمی زیادہ یوروپی مصنفین پر توجہ دیا کرتی ہے۔ ادبی انعام کے لیے جن ممتاز قلم کاروں کو نظر انداز کیا گیا ان میں امیلے زولا، جارج لوئس بورگیس، مارسل پروست، ایزرا پاؤنڈ، جیمز جوائس، اگست اسٹرنڈ برگ، جان اپڈائک، آرتھر ملر اور مارس ٹوائن شامل ہیں۔

تین سے زائد لوگوں کو ایک انعام دینے کے خلاف جو سخت ضابطہ ہے وہ بھی متنازعہ ہے۔ مثال کے طور پر 2002 میں کوچی تناکا اور جان فین کو پروٹین کیمسٹری میں ماس اسپکٹرومیٹری تیار کرنے کے لیے انعام دیا گیا لیکن یونیورسٹی آف فرینکفرٹ کے انسٹی ٹیوٹ فور فزیکل اینڈ تھیوریٹیکل کیمسٹری کے

فریز، ہیلن کیمپ اور مائیکل کر اس کے کارناموں کو تسلیم نہیں کیا گیا۔ابھی تازہ خبر کے مطابق ضابطہ شکنی کرتے ہوئے نوبل انعام کمیٹی نے میڈیسن کے شعبہ میں تین سائنسدانوں امریکہ کے بروس بیوٹلر، لگزمبرگ کے جولس ہافمن اور کناڈا کے رالف اسٹمن کو مشترکہ طور پر مزاحمتی نظام کے میدان میں ان کے غیر معمولی کارناموں کے لیے نوبل ایوارڈ سے نوازنے کا اعلان کیا ہے۔اسی طرح بعد مرگ ایوارڈ دینے پر پابندی اس فرد کے کارنامے کو تسلیم نہیں کرتی جس کا انتقال انعام دیے جانے سے پہلے ہو چکا ہو۔1962 میں فرانس کرک، جیمز ڈی واٹسن اور مورس ولکنس کو ڈی این اے کا ڈھانچہ دریافت کرنے پر فزیولوجی یا میڈیسن کے انعام سے نوازا گیا۔اس میں تعاون دینے والی اہم شخصیت روزہ لینڈ فرینکلن کا انتقال چار سال قبل رحم کے سرطان کی وجہ سے ہوا تھا۔

الفریڈ نوبل نے اپنی دولت اس لیے چھوڑی تھی کہ اس سے ان لوگوں کو انعامات دیے جائیں جنھوں نے گزشتہ ایک سال میں انسانیت کو سب سے زیادہ فائدہ پہنچایا ہو۔اس نے کہا کہ فزکس میں نوبل انعام ایسے شخص کو دیا جانا چاہئے جس نے فزکس کے شعبہ میں اہم ترین دریافت یا ایجاد کی ہو۔نوبل نے دریافت پر زور نہیں دیا تھا لیکن یہ تاریخ ہے کہ نوبل انعام کمیٹی ایجادات کے مقابلہ میں دریافتوں کو زیادہ اہمیت دیتی رہی ہے۔فزکس کے 77 فیصد انعامات دریافتوں پر اور صرف 23 فیصد ایجادات کے لیے دیے گئے۔

اب تک دو اسکالر نے نوبل انعام لینے سے انکار کیا۔1964 میں ژاں پال سارتر نے یہ کہہ کر ادب کا ایوارڈ لینے سے انکار کیا کہ کسی قلم کار کو ادارہ بننے سے گریز کرنا چاہئے خواہ وہ انتہائی باعزت طریقہ سے ہو۔دوسرے انکار کرنے والے لے ڈوک تھو تھے جنہیں امن معاہدہ میں ان کے رول کی وجہ سے 1973 کے امن انعام کے لیے منتخب کیا گیا تھا۔انہوں نے یہ کہہ کر انعام لینے سے انکار کر دیا کہ ویتنام میں حقیقی امن ابھی قائم نہیں ہوا۔

اڈولف ہٹلر نے رچرڈ کہن، اڈولف بوتینانڈت اور گرہارڈ ڈوماکک کو انعامات نہیں لینے دیا تھا۔ان سبھوں کو دوسری عالمگیر جنگ کے بعد ڈپلوما اور گولڈ میڈل دیے گئے۔1958 میں بوکس پسترناک نے اس خیال سے ادب کا انعام لینے سے گریز کیا تھا کہ اگر وہ انعام لینے اسٹاک ہوم گئے تو سوویت حکومت انہیں بخشے گی نہیں۔سویڈش اکادمی نے ان کے اس انکار کو مسترد کرتے

ہوئے کہا تھا کہ اس انکار سے ایوارڈ کا وقار مجروح نہیں ہونا چاہیے۔نوبل انعام کی طرح دوسرے بیشتر انعامات کا بھی یہی حال ہے کہ ان انعامات کے لیے توڑ جوڑ اور مختلف ہتھکنڈے اپنائے جاتے ہیں، پھر بھلا ایسے انعام کو پاکر کیوں کر خوش ہوا جاسکتا ہے؟

(نومبر 2011)

"بعض احباب نے لکھنؤ میں ایک انجمن کی بنیاد ڈالی ہے۔اس قسم کی کئی انجمنیں یہاں پہلے بھی بن چکی ہیں۔مگر بدقسمتی سے کسی نے کوئی مفید کام نہیں کیا اور شاید عملاً کسی کا وجود بھی نہیں ہے......جولوگ بالعموم انجمن سازی کے عادی اور مجلسی کاموں کو بہ کامیابی انجام دینے کے راز سے واقف ہیں انہیں اپنی زبان کی طرف سے قابل افسوس بے التفاتی ہے اور جو اصحاب اردو کے دلدادہ اور اس کے نشو ونما کے لئے حتی المقدور ساعی رہتے ہیں ان کو اجتماعی صورت میں منضبط ہوکر کام کرنے کا سلیقہ نہیں۔ایک مشکل یہ بھی ہے کہ ادبی خدمت کے لئے شعرائے گرامی کے مجتمع ہونے کی ضرورت ہے لیکن واقعہ یہ ہے کہ شعرا کی جماعت کا ایک مرکز پر جمع ہونا اور اتفاق و اتحاد سے کام کرنا اب تک ناممکن العمل پایا گیا ہے....." (الناظر، مئی 1923)

"دلگداز نے اس سال کئی حیثیتوں سے نمایاں ترقی کی ہے۔1887 میں صرف خیالات سے مدد لی گئی تھی اور پورے سال کے بارہ جزوں کے سب صفحے ایڈیٹر کے جنون انگیز ولولوں اور اس کی طبیعت کے جوش سے بھرے ہوئے تھے لیکن 1888 میں واقعات پر بھی نظر ڈالی گئی اور حتی الامکان عمدہ عمدہ تاریخی مضامین شائع کئے گئے۔قطع نظر ان مضامین کے جو مولوی شبلی صاحب کی تصانیف سے ماخوذ کر کے لئے گئے تھے ہمارے لائق فاضل دوست مولوی خلیل احمد کا وہ اعلیٰ مضمون جو دمشق سے متعلق تھا اور جن کے ذریعہ ہم نے بغداد کے عروج وزوال کی تصویریں دکھائیں ایسے نہیں ہیں کہ ہمدردان اسلام کو کبھی بھول جائیں۔ہمارے خیال میں جلد بابت 88،77 کی جلد سے کہیں قیمتی ہے.....اگر یہی دنیائے اسلام ہے اور یہی ذوق وشوق ہے تو انشاء اللہ 89ء میں بھی دلگداز کامیابی کے ساتھ ترقی کرے گا۔"

(دلگداز، دسمبر 1888)

نوبل کے انعامات؟

پچھلے شمارہ میں نوبل کے تنازعات پر گفتگو کرتے ہوئے ہم نے لکھا تھا کہ 'ابھی تازہ خبر کے مطابق ضابطہ شکنی کرتے ہوئے نوبل انعام کمیٹی نے میڈیسن کے شعبہ میں تین سائنسدانوں امریکہ کے بروس بیوٹلر، لگزمبرگ کے جولس ہافمن اور کناڈا کے رالف اسٹمن کومشترکہ طور پر مدافعتی نظام کے میدان میں ان کے غیر معمولی کارناموں کے لیے نوبل ایوارڈ سے نوازنے کا اعلان کیا ہے۔' وہیں نوبل انعام کمیٹی نے اپنے ضابطے کی دوسری خلاف ورزی کرتے ہوئے اسٹمن کو بعد از مرگ انعام کا حق دار قرار دیا جب کہ اسی بنیاد پر گاندھی جی کو محروم رکھا گیا کہ وہ آنجہانی ہو چکے تھے۔

اسی طرح نوبل انعام برائے فزکس بھی امریکہ کے تین سائنس دانوں کو کوسمولوجی یعنی علم کائنات سے متعلق ان کے کام پر دیا گیا۔ سال پیرلمٹر اور ایڈم ریس امریکی ہیں جب کہ برائن شمٹ آسٹریلوی نژاد امریکی ہیں۔ ان سائنسدانوں نے کئی برسوں تک تباہ ہوتے ہوئے ستاروں یعنی 'سپرنووا' پر تحقیق کے بعد یہ معلوم کیا ہے کہ 14 ارب سال پہلے بگ بینگ کے نتیجے میں وجود میں آنے والی کائنات اب تک کے اندازوں کے مقابلے میں زیادہ تیز رفتاری سے پھیل رہی ہے۔

نوبل انعام برائے کیمسٹری اسرائیل کے متنازعہ سائنس داں ڈینیل شٹ مین کو دینے کا فیصلہ کیا گیا ہے۔ انہیں یہ انعام 'قلموں کا مماثل' دریافت کرنے پر دیا گیا ہے۔ اس انعام کا فیصلہ کرنے والی سویڈن کی رائل سویڈش اکیڈمی کے مطابق 1982 میں شٹ مین کی دریافت سے ٹھوس مادے سے متعلق نظریے میں انقلابی تبدیلی واقع ہوئی۔ کرسٹلز یا قلموں کے بارے میں قبل ازیں یہ خیال کیا جاتا تھا کہ ان میں ایٹم ایک خاص متناسب ترتیب سے جڑے ہوتے ہیں۔ تاہم شٹ مین نے ثابت کیا کہ ان قلموں

میں ایٹموں کو اس طرح جوڑا جا سکتا ہے کہ ایک ترتیب دوبارہ نہ دہرائی جائے۔ سائنس کے شعبے میں دیے گئے انعامات کا تفصیلی جائزہ ڈاکٹر عبیدالرحمٰن نے لیا ہے۔ جو اگلے صفحات میں پیش ہے۔

اسی طرح نوبل کے امن انعام کے ساتھ بھی یہی ضابطہ شکنی اور خود اپنے اصول کو توڑنے کی مثال سامنے آئی ہے۔ اس بار امن کے شعبے میں تین خواتین کو نوبل انعام سے نوازا گیا ہے۔ ہمیں اس بات پر قطعی اعتراض یا اصرار نہیں کہ دو سے زیادہ لوگوں میں ایک انعام کو نہیں بانٹا جانا چاہئے، ہماری ہمیشہ ہی خواہش رہی کہ یہ انعامات حق بہ حقدار رسید ہونا چاہئے۔ امسال امن کا انعام مشترکہ طور پر جن تین خواتین کو دیا گیا ہے ان میں لائبیریا کی صدر ایلن جوہنسن سرلیف ، لائبیریا میں امن کے لیے کوشاں لی ماہ بووی اور یمن کی توکل کرمان شامل ہیں۔

جوہنسن (72 سال) ہاورڈ تربیت یافتہ ماہر اقتصادیات ہیں جو 2005 میں افریقہ کی پہلی صدر جمہوریہ بنیں۔ جب جوہنسن نے عہدہ سنبھالا تو انہیں لائبیریا میں مصلح اور امن کا سفیر کے طور پر دیکھا گیا۔ مگر صدر کے حالیہ انتخاب کے دوران مخالفین نے ان پر ووٹ خریدنے کا الزام لگایا۔ جوہنسن کے حامیوں نے ان الزامات کی تردید کی۔ لائبریا ابھی امن کے لیے کوشاں ہے۔ لائبریا کی امن کارکن لی ماہ بووی نے عیسائی اور مسلم خواتین کے ایک گروپ کی تشکیل کی تھی تا کہ لائبریا کے رہنماؤں کو چیلنج کیا جاسکے۔ توکل کرمان (32 سال) کی سب سے کم عمر نوبل انعام یافتہ خاتون ہے۔ وہ تین بچوں کی ماں ہیں۔ انہوں نے خواتین صحافیوں کے ایک گروپ کی رہنمائی کی۔ انہوں نے یمن کے صدر علی عبداللہ صالح کی حکومت کی مخالفت کی جب کہ ان کے والد عبداللہ صالح کی کابینہ میں وزیر قانون رہ چکے ہیں۔ توکل ایک صحافی ہیں اور اصلاح پارٹی کی رکن بھی۔ نوبل انعام کمیٹی نے اس انعام کا اعلان کرتے ہوئے کہا ہے کہ ہم دنیا میں جمہوریت اور پائیدار امن کے ہدف کو تب تک حاصل نہیں کر سکتے جب تک مردوں کی طرح خواتین کو بھی سماج کی ہر سطح پر برابر کے مواقع نہیں مل جاتے۔

وہیں ادب کا نوبل انعام سویڈن کے شاعر ٹامس ٹرانسٹرومر کو انسانی ذہن کے رازوں کو اپنی نظموں میں آشکار کرنے پر دیا گیا۔ اس تعلق سے سویڈن کی اکیڈمی کا کہنا ہے کہ اس نے 80 سالہ شاعر کی خدمات کا اعتراف اس لیے کیا کیونکہ ان کے کاموں سے انہیں حقیقت تک رسائی حاصل ہوئی۔ ادب کا نوبل انعام بھی تنازعہ سے خالی نہیں رہا۔ ادب کے نوبل انعام کا جائزہ انوار الحق پیش کر رہے ہیں۔

معاشیات کا نوبل انعام امریکہ کے دو ریسرچ اسکالرز تھامس جے سارجنٹ اور کرسٹوفر اے سمز کو دیا گیا ہے۔ ان محققین کو یہ انعام مائکرو اکانومی کے حوالے سے ان کے کام پر دیا گیا ہے۔ مائکرو اکانومی دراصل بڑے اقتصادی مسائل سے بحث کرنے والی معاشیات کی شاخ ہے۔ نوبل انعام کا اعلان کرنے والی سویڈن کی رائل سویڈش اکیڈمی آف سائنسز کے مطابق: ''مائکرو اکانومی پر اثرات کے حوالے سے ان کی اہم تحقیق پر ان ریسرچرز کو یہ انعام دیا جا رہا ہے۔''

نوبل کمیٹی کے اعلان میں مزید کہا گیا ہے کہ ''سارجنٹ اور سمز کی طرف سے تیار کردہ تجزیاتی طریقہ ہائے کار بین الاقوامی سطح پر مائکرو اکانومی کے تجزیے کے لیے استعمال کیے جا رہے ہیں۔'' نوبل کمیٹی کے پیر کروسل کے مطابق یہ طریقہ کار تعلیمی اور تحقیقی سطح کے علاوہ پالیسیوں کی تیاری کی سطح پر بھی استعمال ہو رہے ہیں۔'' رائل سویڈش اکیڈمی آف سائنسز کے مطابق ان دو محققین نے انفرادی طور پر یہ طریقہ ہائے کار 1970 اور 1980 کی دہائی میں وضع کیے تھے۔ کروسل کے مطابق ان دونوں ماہرین کی تحقیق اس طرح کے مسائل پر بحث کرتی ہے کہ ''اگر حکومت اپنے اخراجات بڑھاتی ہے یا مرکزی بینک شرح سود میں کمی کر دیتا ہے تو اس سے کسی بھی ملک کی معاشیات پر کیا اثرات مرتب ہوتے ہیں۔'' 1943 میں پیدا ہونے والے تھامس جے سارجنٹ نیویارک یونیورسٹی میں اکنامکس اور بزنس کے پروفیسر ہیں۔ ان کی تحقیق کا مرکزی نقطہ معاشی پالیسی میں تبدیلیاں مثلاً افراط زر کے اہداف وغیرہ ہیں۔

اعتراضات، اختلافات اپنی جگہ لیکن اس سے انکار نہیں کیا جا سکتا کہ ان انعامات سے مختلف شعبوں میں ایمانداری سے کام کرنے والوں میں محنت اور لگن کا جذبہ بیدار ہوتا ہے۔ مسابقت اور ایک دوسرے سے آگے نکل جانے کی چاہ میں نئی نئی ایجادات بازیافت اور دریافت کی متعدد مثالیں سامنے آتی رہتی ہیں۔ لیکن کبھی کبھی ایسا بھی دیکھنے میں آیا ہے کہ محض انعام لینے کے لالچ میں ایک دوسرے کے مال (ایجادات، دریافت اور ریسرچ) پر ہاتھ صاف کر دیا جاتا ہے۔ لیکن ایسے انعام یافتگان دیر سویر بے نقاب بھی ہو ہی جاتے ہیں۔ کسی دانا حکیم نے سچ ہی کہا ہے کہ ہمیں صلہ اور انعام کی پرواہ کیے بغیر اپنا کام کرتے جانا چاہئے۔ آپ کے کام میں اگر دم ہوگا تو اس کا اعتراف ایک دن ضرور کیا جائے گا۔

(دسمبر 2011)

مر کے بھی چین نہ پایا تو....

پیش نظر شمارہ میں ایک خاص مضمون 'یوتھینزیا کہانیاں' شامل ہے۔ یہ تبصراتی مضمون دراصل یوتھینزیا جیسے اہم مسئلے پر لکھا گیا ہے، جو برطانیہ کے ڈاکٹر صفات علوی کی مرتبہ کتاب 'یوتھینزیا' پر مبنی ہے۔ یوتھینزیا یونانی زبان میں 'آسان موت' کو کہتے ہیں۔ یہ ایسے مریض کے لیے ہوتی ہے جو ''موت آتی ہے پر نہیں آتی'' کے شکار ہوتے ہیں اور جو خود اذیت میں مبتلا ہوتے ہیں اور اپنے بال بچوں کو بھی اذیت میں مبتلا رکھنے کے نادانستہ مرتکب ہوتے ہیں۔ تو پھر آخر ایسے مسئلے کا حل کیا ہو؟ کیا ایسے مریض کو اذیت میں تڑپنے کے لیے چھوڑ دیا جائے یا اسے مار کر بہ الفاظ دیگر قتل کر کے چھٹکارا حاصل کر لیا جائے۔

دنیا کے تقریباً تمام مذاہب نے خودکشی کو حرام قرار دیا ہے کہ یہ زندگی ہمارے پاس خدا کی امانت ہے اور اس امانت کو سنبھال کر رکھنا ہر انسان کا فرض ہے۔ 'سنبھال کر رکھنے' سے میری مراد یہ ہے کہ اس زندگی کو 'یوں ہی' نہ چھوڑ دیا جائے بلکہ اسے صحت مند، کارآمد اور بامقصد بنانے کی ہر ممکن جدوجہد کرنی چاہیے۔ یہ سچ ہے کہ ہر انسان صحت مند رہنا اور صحت مند زندگی گزارنا چاہتا ہے لیکن کبھی کبھی انسان ایسا چاہتے ہوئے بھی نہیں کر پاتا ہے۔ کبھی خود کردہ گناہوں کی پاداش میں اپنی زندگی کو خود اجیرن میں ڈال دیتا ہے اور کبھی خدا اسے کسی مرض میں مبتلا کر کے امتحان میں ڈال دیتا ہے۔ ایک باشعور اور سمجھ دار انسان مذکورہ دونوں صورتوں سے نکلنے کی ہر ممکن کوشش کرتا ہے لیکن جب اس میں کامیاب نہیں ہوتا تو نتیجے میں بعض اوقات وہ مایوسی کا شکار ہو جاتا ہے اور کبھی راضی بہ رضا اللہ پر چھوڑ دیتا ہے۔ لیکن عقل و دانش کا تقاضا ہے کہ وہ اس صورت حال سے آخری دم تک نبرد آزما رہے اور اس سے باہر نکلنے کی جدوجہد کرے۔ انسان کا کام کوشش اور سعی پیہم کرنا ہے۔

کامیابی دینا نہ دینا اللہ کے ہاتھ میں ہے۔

اس بات کو اگر میں مزید طول دوں تو یہ مولویانہ ہو جائے گی۔ لہٰذا اصل مسئلہ کی طرف رجوع کرتے ہوئے ہم یوتھینز یا کے مسئلے پر اپنی گفتگو کو مرکوز رکھیں گے۔ عام طور پر یہ دیکھنے میں آیا ہے کہ لوگ ناقابل علاج مرض میں مبتلا اپنے بزرگوں کو تڑپنے، ترسنے اور سسکنے کے لیے اکیلا چھوڑ دیتے ہیں اور خود اپنی زندگی میں مست ہو کر انہیں یکسر بھلا دیتے ہیں۔ وہ یہ بھول جاتے ہیں کہ جب وہ گوشت کے لوتھڑے کی شکل میں پیدا ہوئے تھے تو انہی بزرگوں نے انہیں سہارا دیا تھا۔ اسی ماں نے دودھ کی شکل میں اپنا خون پلا پلا کر اسے طاقت دی تھی اور اسی باپ نے انگلی پکڑ کر انہیں چلنا سکھایا تھا۔ اور اس لائق بنایا کہ وہ کارزار حیات میں کامیاب و کامران ہوں۔ لیکن وائے افسوس! کہ وہ یہ سب کچھ بھلا کر عیش وعشرت میں کھو جاتے ہیں۔

اصل مسئلہ اب بھی باقی رہ جاتا ہے کہ ایک بیٹا یا گھر کے دوسرے افراد اپنے مریض اور بزرگ والدین کو رکھنے اور ان کی نگہداشت کرنے پر خوشی خوشی آمادہ ہوں اور ان کی ہر ممکن دلجوئی کی کوشش کرتے رہیں۔ لیکن کوئی بزرگ ایسے مرض لاعلاج میں مبتلا ہو جائے کہ وہ زندگی کی بھیک مانگتے مانگتے خود بیزار ہو جائے اور بیٹے بہو بھی خدمت کرتے کرتے اکتانے لگ جائیں۔ ایسی صورت میں کیا کیا جائے؟ ہاں یہ ٹھیک ہے کہ سب کچھ اللہ پر چھوڑ دیا جائے۔ لیکن انسان تو انسان ہے جو بہت جلد گھبرا جاتا ہے اور اس گھبراہٹ میں کبھی وہ خودکشی کر لیتا ہے اور کبھی وہ اپنے ڈاکٹر اور اپنے وارثین سے موت کی بھیک مانگنے لگتا ہے۔ ایسی ہی صورت حال کے پیش نظر یوتھینز یا یا 'مرگ بے اذیت' کا تصور سامنے آیا جس پر ابھی تک سبھوں کا اتفاق نہیں ہو سکا ہے اور رہتی دنیا تک اتفاق کی کوئی امید بھی نظر نہیں آتی ہے کہ قتل یا خودکشی دونوں ہی ڈراؤنے، گھناؤنے اور حرام فعل ہیں جس کے نام سے ہی ایک انسان کو گھبراہٹ سی ہونے لگتی ہے اور ہمارا تو ایمان ہے :

جان دی دی ہوئی اسی کی تھی
حق تو یہ ہے کہ حق ادا نہ ہوا

کوئی بھی مرض نہ صرف اس مریض کے لیے ایک امتحان ہوتا ہے بلکہ اس بہانے بیوی، بال بچے، احباب و متعلقین سبھوں کی آزمائش ہوتی ہے کہ کون ایسے سخت اور مشکل حالات میں اس کے

کام آتا ہے، جو آپ کے اچھے اور خوشحال دنوں میں آپ کے ساتھ اٹھنا بیٹھنا اور دوستی کا دم بھرتے رہنا اپنے لیے قابل فخر سمجھتے تھے۔ ایسے لوگ آپ کے مرض میں مبتلا ہو جانے اور نتیجے میں بدحالی کا شکار ہو جانے کے بعد آپ کا ساتھ کسی سائے کی طرح چھوڑ جاتے ہیں۔ بہر حال انسان فطری طور پر عجلت پسند، جلد باز اور چھوٹی چھوٹی مصیبتوں میں گھبرا جانے والا ذی نفس ہے اور یہ جانتے ہوئے بھی کہ مایوسی کفر ہے، وہ موت کی تمنا کرنے لگ جاتا ہے اور کبھی کبھی خودکشی جیسا ناقابل معافی جرم کا ارتکاب کر بیٹھتا ہے:

اب تو گھبرا کے یہ کہتے ہیں کہ مر جائیں گے
مر کے بھی چین نہ پایا تو کدھر جائیں گے

یہاں شاعر نے بڑے پتے کی بات کہی ہے۔ دنیا کے تمام مذاہب میں موت کے بعد ایک دوسری زندگی یا Life after death کا تصور کسی نہ کسی شکل میں موجود ہے، تو بھلا پھر گھبرا کر مر جانے کی تمنا کرنا کہاں کی دانشمندی ہے۔ ہماری موجودہ زندگی آخری زندگی نہیں بلکہ اس کے بعد ایک دوسری ابدی زندگی بھی ہوگی، جو ہماری اس زندگی کے اعمال اور کرموں پر استوار ہوگی۔ جب ہم اِس زندگی میں صبر و استقلال اور استقامت کا اگر مظاہرہ نہیں کریں گے تو اُس زندگی میں ہمیں کامیابی یقیناً نہیں ملے گی اور پھر ایسے میں مر کے بھی چین نہ پایا تو کدھر جائیں گے.....!

ہمیں کوشش کرنی چاہئے کہ مرگِ بے اذیت یا آسان موت جو کسی مصنوعی طریقے سے حاصل کی جا سکے اس کا تصور بھی اپنے خواب و خیال میں نہ لائیں۔ سچی کوشش یقیناً کامیابی اور کامرانی سے ہمکنار کرتی ہے۔

یوروپ میں خاندان کا کوئی تصور نہیں پایا جاتا۔ بلکہ وہاں بچے جیسے ہی پر نکالتے ہیں پرواز کر جاتے ہیں۔ ایسے میں وہاں بوڑھے لوگوں کی حالت ہمارے ایشیا کے ممالک کے مقابلے زیادہ اذیت کا شکار ہوتی ہے۔ 'یوتھنیزیا' دراصل وہاں کا شوشہ ہے۔ اس سے قبل کہ یہ ناسور ہمارے سماج، ہماری نسلوں میں پیوست ہو اس کے روک تھام کے لیے کوئی ایسی سبیل نکالنی چاہئے کہ یہ ناسور پھیلنے کے بجائے معدوم ہو جائے۔ ہمارا مقصد اسی نظریے کو اجاگر کرنے کے لیے اس موضوع کو آپ تک پہنچانا تھا۔ آپ کی کیا رائے ہے؟ (جنوری 2012)

آدمی بلبلہ ہے پانی کا

وائے افسوس! میرا یار مجھ سے بچھڑ گیا۔ فرید پربتی کی عمر اور ان کی صحت کچھ دنوں پہلے تک ایسی نہ تھی کہ اس کے گزر جانے کا یقین تو کیا گمان بھی کر لیا جائے۔ عمر محض پچاس سال تھی اور صحت ماشاء اللہ ایسی کہ رشک کرتے رہ جایئے۔ سچ ہے:

کیا بھروسہ ہے زندگانی کا
آدمی بلبلہ ہے پانی کا

فرید پربتی ایک لمبے چوڑے، سرخ وسفید، چست وتوانا، ہنس مکھ، ملنسار اور کشمیری روایت کا حسین مرقع تھے۔ فرید پربتی ان کا اصل نام نہ تھا۔ ان کا اصل نام کشمیریوں میں رائج غلام نبی تھا۔ وہ واقعی نبیؑ کے غلام تھے۔ اس کا عکس ان کے کلام میں جا بجا نظر بھی آتا ہے۔ لیکن غلام نبی کو شاید فرید گنج شکر سے بے حد عقیدت تھی اور وہ ان کے صوفی با صفا کردار سے متاثر تھے۔ چنانچہ ان کے نام فرید کو ان سے مستعار لے لیا اور شاید وہ کشمیر کے پربت شر نکھلا پر پیدا ہوئے اور انہیں گھاٹیوں میں ان کی پرورش ہوئی۔ چنانچہ انہوں نے پربتی کہلانا پسند کیا۔ اس طرح وہ غلام نبی سے فرید پربتی ہو گئے۔ فرید پربتی ایک انتہائی ملنسار، خوش مزاج اور دوست دار انسان تھے، جب بھی ملتے ٹوٹ کر ملتے اور جب تک ساتھ ہوتے گرم جوشی کا مظاہرہ کرتے رہتے۔ یہ محض دکھاوا نہیں ہوتا، جیسا کہ آج لوگوں کا وطیرہ ہے بلکہ یہ ان کی شخصیت کا اٹوٹ حصہ تھا۔ وہ مجھ سے جب بھی ملتے، میرے لیے دعائیں کرتے۔ انہیں دوا سے زیادہ دعا پر یقین تھا۔ ابھی پچھلے دنوں کی بات ہے جب فرید پربتی نے میر تقی میر پر ایک مختصر مگر جامع مقالہ ہمیں دیا تھا اور ہم نے اس مقالے کی اہمیت کے پیش نظر آج کل میں میر پر ایک گوشہ نکالنے کا ارادہ کر لیا۔ ہم نے اپریل 2011 کے

شمارہ میں دیگر مضامین کے ساتھ فرید پربتی کا مقالہ 'میر تقی میر اور تصور انسانیت' شامل کر کے میر تقی میر کے شایان شان ایک بھرپور گوشہ شائع کیا، لیکن یہ کیا کہ مقالہ چھپتے ہی ان کے ایک شاگرد کا ہی خط موصول ہوا کہ یہ مقالہ سرینگر کے کشمیر عظمیٰ نام کے روزنامہ میں پہلے ہی شائع ہو چکا ہے۔ یہ جان کر ہمیں انتہائی رنج ہوا اور ہم نے آج کل کے اصول کے مطابق انہیں بلیک لسٹ کرنے کی ٹھان لی۔ اسی بیچ ہماری خیریت معلوم کرنے اور اپنے مقالہ کی اشاعت پر شکریہ ادا کرنے کے لیے انہوں نے فون کیا۔ میں نے چھوٹتے ہی انہیں اس بات کے لیے بازپرس کی۔ تب انہوں نے بتایا کہ آپ کا رسالہ آجکل جو اپریل کا تھا وہ بازار میں ماشاء اللہ 17-16 مارچ کو ہی آگیا اور 20 ر مارچ کو کشمیر عظمیٰ کے شمارہ میں **آجکل** سے ہی نقل کر کے چھاپ دیا گیا ہے۔ بات معقول تھی ہماری سمجھ میں آگئی لیکن وہ جو کہتے ہیں کہ غصہ حرام ہے، ہمارے دل میں کہیں نہ کہیں ایک بال سا پڑ گیا۔ حسب معمول اس کے بعد بھی فرید پربتی کے فون آتے رہے اور خیر وعافیت کا آدان پردان ہوتا رہا۔

14 ر دسمبر کی شام جب شیخ عقیل احمد نے مجھے فون پر یہ اطلاع دی کہ فرید پربتی گزر گئے تو ایک دم سے میرا دل پھٹ کر آنکھوں کے راستے آنسو کی شکل میں نکلنے اور بہنے لگا۔ میں دیر تک نہ صرف آنسو سے بلکہ آواز سے بھی زار زار روتا رہا، اتنا کہ میری بیگم بھی گھبرا گئیں۔ بڑی مشکلوں سے میں نے خود پر قابو پایا اور پھر ایک ایک کر کے کسی سنیما کے مناظر کی مانند فرید پربتی کے ساتھ گزارے لمحات یکے بعد دیگرے آتے رہے اور جاتے رہے۔ مجھے اس بات کا بھی افسوس رہا کہ میں اپنی بیماری کے سبب دہلی کے آل انڈیا میڈیکل انسٹی ٹیوٹ میں، جہاں وہ زیر علاج تھے ان سے ملنے نہیں جا سکا۔ مجھے اس بات کا زیادہ افسوس رہا کہ ان سے بالمشافہ مل کر معافی تلافی کر لیتا۔

فرید پربتی ریاضی اور اکاؤنٹس کے راستے اردو ادب میں آئے۔ دراصل فرید پربتی کو شروع سے ہی ادب میں دلچسپی رہی۔ طبیعت موزوں پائی تھی چنانچہ شاعری کرتے رہتے تھے۔ انہوں نے 1987 سے 2001 تک کشمیر اکاؤنٹس سروس میں ملازمت کرنے کے بعد درس وتدریس کی طرف رخ کیا اور کشمیر یونیورسٹی کے شعبۂ اردو سے منسلک ہو گئے۔

فرید پربتی کو لکھنے پڑھنے اور چھپنے کا بے حد شوق تھا اور اپنا زیادہ تر وقت وہ انہیں کاموں میں

صرف کرتے تھے کہ یہ ان کا پیشہ بھی تھا اور ضرورت بھی۔ وہ آج کے عام رجحان کے برخلاف رسائل وجرائد اور اخبارات خرید کر پڑھتے تھے۔ آجکل ان کا محبوب ترین رسالہ تھا اور اسے بھی وہ ہم سے مانگ کر نہیں بلکہ خرید کر پڑھتے تھے۔ آخری دنوں میں جب وہ آل انڈیا میڈیکل انسٹی ٹیوٹ میں زیر علاج تھے تو ان کے سرہانے بقول شیخ عقیل احمد دیگر کتابوں کے ساتھ ساتھ رسالہ آجکل کا تازہ شمارہ بھی موجود تھا۔ مجھے یہ جان کر بے حد خوشی ہوئی۔ ورنہ آج کے دور میں نہ صرف رسالہ مفت حاصل کرنا لوگ اپنے لیے باعث فخر سمجھتے ہیں بلکہ مفت نہ ملنے کی صورت میں آجکل کے خلاف طرح طرح کی سازشیں کرتے رہتے ہیں اور افواہ کا بازار گرم کرتے ہیں کہ آجکل بند ہونے والا ہے۔ ابھی پچھلے دنوں ایک مشہور معاصر روزنامہ نے یہ خبریں شائع کیں کہ سرکار رسالہ 'آجکل' کو بند کرنے کا منصوبہ بنا رہی ہے اور اس طرح اردو زبان ختم کرنے کی حکومت کی پوری سازش ہے۔ یقین کیجئے کہ یہ حرکت ایسے لوگوں نے کی تھی جو رسالہ خرید کر تو کیا مانگ کر بھی پڑھنے میں دلچسپی نہیں رکھتے۔ ہاں البتہ ''اردو اخبارات'' کی سرخیوں میں بنے رہنے کے لیے اس قسم کی حرکتیں کرتے رہتے ہیں۔ حکومت نہ تو رسالہ آجکل کو بند کرنے کا منصوبہ رکھتی ہے اور نہ ہی اس کے خلاف کوئی سازش ہی کر رہی ہے۔ البتہ کچھ اردو والے خود اس جرم کے مرتکب ہو رہے ہیں اور اردو کی بدحالی کے ذمہ دار بن رہے ہیں۔ حالیہ تازہ ترین آر این آئی سالانہ رپورٹ کے مطابق ہندی اخبارات ورسائل اپنی تعداد اشاعت کے لحاظ سے سرفہرست ہے جب کہ انگریزی دوسرے نمبر پر اور اردو تیسرے نمبر پر ہے۔ کیا یہ ہم اردو والوں کے لیے شرم کی بات نہیں ہے کہ اردو انگریزی سے بھی پیچھے ہے۔ آخر کیوں؟ وجہ صاف ہے کہ ہم اردو اخبارات ورسائل پڑھنے میں زیادہ یقین نہیں رکھتے صرف زبانی جمع خرچ کرتے ہیں۔ ایسے میں ہمیں مرحوم فرید پر بتی کی یاد ستاتی رہے گی جو اردو کے سچے عاشق، خدمت گار اور اس کی نشر واشاعت کے لیے ہمیشہ کوشاں رہتے تھے۔

عین جوانی کے عالم میں فرید پر بتی کا اتنی جلد ہم سے بچھڑ جانا نہ صرف ان کے خاندان اور وارثین کے لیے غم اور افسوس کا سبب ہے بلکہ اردو، عاشقان اردو اور ہم سب کے لیے ایک بڑا نقصان بھی ہے۔ فطرت کے قانون اور اس کی منشا کے آگے کس کی چلی ہے۔

(فروری 2012)

مجھ کو تو مرنا ہے اک دن

آسمان اردو ادب پر یہ کیسا کڑا وقت آن پڑا ہے کہ ستارے ڈوبتے جاتے ہیں اور تاریکی بڑھتی ہی جاتی ہے۔ ستاروں کا کیا؟ ڈوبنا اور غروب ہونا تو ان کا کام ہی ہے۔ لیکن درخشاں ستارے جب غروب ہوتے ہیں تو احساس ضرور ہوتا ہے۔ اردو ادب کے تین درخشاں ستارے مظہر امام، بلراج ورما اور شجاع خاور بھی داغ مفارقت دے گئے۔ اپنی درخشانی کے سبب وہ اپنی کمی کا احساس دلاتے رہیں گے۔ ان تینوں ادیبوں میں ایک قدر مشترک یہ تھی کہ ان میں سے دو اپنی پیرانہ سالی کے باوجود اور تیسرا اپنی علالت اور معذوری کے باوصف اردو کی ہر محفل میں موجود ہوتے تھے۔ نہ صرف موجود ہوتے تھے بلکہ اپنی موجودگی کا احساس بھی دلاتے رہتے تھے۔

بلراج ورما اپنے رسالے 'تناظر' کے ذریعے ایک عرصہ تک اردو ادب کے تناظر کا بیان کرتے رہے۔ بلکہ اس کے بند ہو جانے کے بعد بھی اس کی کمی کا احساس دلاتے رہے۔ بلراج ورما اپنی طبعی عمر کو پہنچ کر مالک حقیقی سے جا ملے، جو ہر ذی نفس کا مقدر ہے۔ ان کی یہ سوچ کہ موت تو زندگی کی ابدی آرام گاہ ہے سو اس آرام گاہ کو رخصت ہوئے۔

مظہر امام نئی غزل اور آزاد غزل کے زلف و رخسار سنوارنے میں ساری زندگی مصروف رہے۔ چونکہ پچھلے موسم کا پھول تھے سو آخر مرجھا گئے۔ وہ پہلے ہی اپنے ایک شعر میں اس بات کا اشارہ کر چکے تھے:

سانحہ یہ بھی ایک روز کر جاؤں گا
وقت کی پالکی سے اتر جاؤں گا

رہے شجاع خاور تو ان کی عمر ایسی نہ تھی کہ ابھی ہم سے رخصت لیتے لیکن خدا کے بلاوے پر

وہ بھی لبیک کہتے ہوئے ہم سے وداع ہوئے۔ شجاع خاور سے میری پہلی ملاقات 1992 میں دفتر آجکل میں ہوئی۔ اس وقت آج کل کا دفتر پٹیالہ ہاؤس میں ہوا کرتا تھا اور شجاع خاور بھی ایک بڑے پولیس آفیسر شجاع الدین ساجد ہوا کرتے تھے۔ اس کے باوجود وہ ہم سے ایسے ٹوٹ کر ملے گویا ہم پرانے دوست ہوں۔ یہ وہ زمانہ تھا جب وہ پولیس کی ملازمت اور ڈیوٹی میں جتنے مستعد تھے اتنے ہی اپنی شاعری میں بھی۔ لیکن وہ اپنی شاعری میں اپنے عہدے کے رعب داب کا استعمال ہرگز جائز نہیں سمجھتے تھے اور اس سے وہ ہر ممکن طریقے سے اجتناب کرتے تھے۔ اور اگر کوئی اس حوالے سے ان کا تعارف کراتا تو اس پر اپنی ناراضگی کا اظہار بھی کرتے۔ چنانچہ ایک بار حیدر آباد کے مشاعرے میں جب ان کا تعارف کراتے ہوئے ناظم مشاعرہ نے ان کے آئی پی ایس افسر ہونے کا حوالہ دیا تو شجاع خاور نے احتجاج کیا اور اپنا کلام سنانے سے انکار کر دیا۔ اس کج کلاہ شاعر کے اس واقعے کا ذکر میں نے خاص طور پر قصداً کیا ہے کہ آج کے ادیب و شاعر اس سے کچھ سبق لیں۔ اور ایسی حرکتوں سے باز آئیں، جو آج ان کی صفات اور شناخت کا حصہ بن چکی ہیں۔

شجاع خاور سے میری دوسری ملاقات اس وقت ہوئی جب ان پر جان لیوا فالج کا حملہ ہو چکا تھا۔ لیکن سلام ہے اس جواں مردی کو جس نے اس سخت دور میں بھی اس سے باہر نکلنے کی ہر ممکن کوشش جاری رکھی۔ یہی وجہ ہے کہ وہ سولہ سالوں تک زندہ رہے اور اپنی زندگی کا ثبوت بھی مختلف طریقوں سے دیتے رہے۔ اب اس سے بڑا ان کے متحرک اور فعال ہونے کا کیا ثبوت ہو سکتا ہے کہ وہ اس حال میں بھی اپنے شعری مجموعہ 'اللہ ہو' کو ترتیب دیتے ہیں اور اسے بڑے اہتمام اور کروفر سے شائع بھی کرواتے ہیں۔ انہوں نے جس مثبت سوچ کا مظاہرہ کیا تھا اس کی تائید کرتے ہوئے ہم نے بھی اس پر ایک تبصرہ اس خیال سے کر دیا کہ ان کو اس سے یک گونا سہارا ملے گا اور وہ اپنی زندگی میں ایک قدم اور آگے کی طرف بڑھانے کے لائق ہوں گے۔ اس وقت کے ایڈیٹر محبوب الرحمٰن فاروقی کے مشورے پر جب میں آج کل کا وہ شمارہ لے کر ان کی سرکاری رہائش گاہ تالکٹورہ اسٹیڈیم پہنچا تو وہ بہت خوش ہوئے۔ اور گرچہ وہ ہاتھ ملانے کی پوزیشن میں نہیں تھے پھر بھی انہوں نے اپنی سی کوشش کی اور اپنی اس خواہش اور للک کا اس پر اعتماد لہجے میں اظہار کیا کہ ابرار صاحب میں 50 فیصد ٹھیک ہو چکا ہوں اور جلد ہی مکمل صحتیاب ہو جاؤں گا۔ ان کا شعری

مجموعہ 'اللہ ہو' ان کے دورِ علالت کی ایک خوبصورت اور زندہ دل پیش کش ہے۔

دتی کا یہ البیلا کرخنداری تیکھے لب ولہجہ کا شاعر جو پچھلی نصف صدی سے اپنی چونکا دینے والی شاعری کی بدولت اپنا لوہا منوا چکا تھا۔ پچھلے 16 سالوں سے موت وزیست کی کشمکش میں مبتلا رہنے کے بعد زندگی کے اپنے عزم کی بدولت بتدریج ہوش وحواس کی طرف لوٹ رہا تھا اور 'اللہ ہو' کی اشاعت ان کے اسی عزم کی دلیل تھی۔ شجاع کے شعری تصانیف میں دوسرا شجر (1970ء) وادین (1982ء) مصرع ثانی (1987ء) بات (1993ء) رشک فارسی (1993ء) کے علاوہ ترتیب وتالیف میں اردو شاعری میں تاج محل (1968ء) غزل پارے (1990ء) اورغزلیہ زیور طبع سے آراستہ ہو چکے ہیں۔

'اللہ ہو' شجاع خاور کا تازہ ترین شعری مجموعہ ہے جو 2000 میں شائع ہوا۔ اس مجموعہ میں شامل غزلیں انہوں نے اپنی جان لیوا بیماری سے تین چار روز پہلے تک کہی تھیں۔ شجاع شاعر تھے۔ ایک سچے شاعر۔ اور ایک سچا شاعر 'آمد' کے تحت شاعری کرتا ہے۔ جس میں بلاشبہ الہامی کیفیت بھی پائی جاتی ہے۔ جبھی تو انہیں اپنی بیماری سے آگاہی ہو گئی تھی:

زندگی بن گئی عدو سی شجاعؔ
اور ہمیں موت بھی نہیں آئی

جو لوگ شجاع کو قریب سے جانتے ہیں وہ یقیناً اس شعر کی الہامی کیفیت سے لطف اندوز ہوں گے۔

شجاع کے اس مجموعہ میں 73 غزلیں شامل ہیں اور یہ سب کی سب 1993ء کے بعد یعنی ان کے مجموعہ 'رشک فارسی' کے بعد کی ہیں اور چونکہ شجاع کی شاعری رجحان ساز رہی ہے لہٰذا ان کا یہ مجموعہ بیسویں صدی کی آخری دہائی کی اردو شاعری کے سمت ورفتار کو سمجھنے میں معاون ومدد ثابت ہوا۔

تنقید کی عظمت کو بھلا کیسے سمجھتے
تم پڑھتے رہے میر کے اشعار میاں جی

'اللہ ہو' کی پہلی غزل اس مجموعہ کی سب سے طویل غزل ہے جو 21 راشعار پر مشتمل ہے۔ اور دوسری غزل صرف تین اشعار پر۔ یعنی وہ اختصار پر بھی اتنی ہی قدرت رکھتے تھے جتنی طوالت

پر۔دوسری غزل ہے:

وہ روئے سخن کی خودسری کے زمانے گئے	فسانۂ غم کل ان کو بھی ہم سنانے گئے
شعور ادب خدا کا غضب یہ حال ہے اب	نئے ہی نئے کا شور ہے سب پرانے گئے
شجاع میاں یہ عشق بھلا کہاں کا ہوا	نہ آہ بھری نہ زخم جگر دکھانے گئے

لیکن اس 'روئے سخن' میں شجاع خاور نے جس خوبی سے 'فسانۂ غم' کہہ ڈالا اس کے لیے یہ تین شعر ہی کافی ہیں۔ان تین اشعار میں ہی خاور کے تجربے کی آزادہ روی اور انفرادیت کو ان کے قلندرانہ لب ولہجہ نے جس طرح پیش کیا ہے، اس سے تخلیقی تازگی اور ان کی فکری وسعت کا بخوبی اندازہ ہوتا ہے۔

شجاع کی شاعری میں ایک خاص بات یہ ہے کہ وہ سیدھی سادی زبان کا استعمال کرتے تھے اور الفاظ کی بازیگری سے قاری کو مرعوب کرنے کی کوشش نہیں کرتے تھے۔

شجاع خاور اب ہمارے درمیان نہیں رہے لیکن ان کی تخلیقات اور ان کی شجاعت ہمیں ہمیشہ پریرنا دیتی رہیں گی۔انہوں نے کتنی سچی اور کھری بات کہی ہے:

مجھ کو تو مرنا ہے اک دن یہ مگر زندہ رہے
کاریگر کی موت کا کیا ہے، ہنر زندہ رہے

(مارچ2012)

"......دلگداز کو ہمیں دو حیثیتوں سے دیکھنا چاہئے۔ایک تو یہ کہ اس کے مضامین کیسے رہے دوسرے یہ کہ اس کے انتظام کی کیا حالت رہی۔باعتبار مضامین چاہے کسی کے خیال میں کیسا ہو مگر ہمارے نزدیک برا نہیں رہا.....ابتدائے سال سے نو مہینے تک پرچہ ماہ بہ ماہ نکلتا رہا۔صرف پچھلے تین مہینوں کے پرچے بٹ بٹ کے اور دسمبر کی آخری تاریخوں میں چھپتے رہے۔یہی بدانتظامی ہے جس کا الزام ہمیں اپنے سر اٹھانا ہے۔"

(دلگداز، دسمبر 1890)

چلے چلو کہ منزل ابھی نہیں آئی

ادب کی تاریخ میں ترقی پسند تحریک ایک مضبوط ترین اور سب سے توانا تحریک رہی ہے۔ جس کا قیام 1936ء میں لکھنؤ میں چند روشن خیال ادیبوں کے ہاتھوں عمل میں آیا۔ اس طرح اپریل 2012 میں ترقی پسند تحریک کے 75 سال پورے ہو رہے ہیں۔ اس مناسبت سے ترقی پسندوں کی موجودہ نسل اس تحریک کی ڈائمنڈ جبلی منا رہی ہے۔ کیا یہ تحریک اب بھی زندہ ہے؟ کیا یہ اب بھی متحرک اور فعال ہے؟ یہ ایک بڑا سوال ہے جس پر آج کی نسل کو سب سے پہلے غور کرنا ہوگا۔ یہ محض ادبی تحریک نہیں بلکہ اس کے دائرے میں معاشرے کے دوسرے شعبے بھی شامل رہے ہیں، خواہ وہ سیاست ہو، اقتصادیات ہو، تہذیب وثقافت ہو یا زندگی کے اور دوسرے شعبے۔

ترقی پسند تحریک کا قیام کارل مارکس کے فلسفے کے زیر اثر ہوا۔ مارکس کا فلسفہ گوکہ اقتصادی اور سیاسی اہمیت کا حامل تھا مگر اس فلسفے نے خصوصاً انقلاب روس کے بعد بین الاقوامی سطح پر زندگی کے تقریباً ہر شعبے کو متاثر کیا۔ ادب بھی چونکہ معاشرہ اور ہماری زندگی کی پیداوار ہے، اس لیے اس پر بھی اس کے اثرات واضح طور پر مرتب ہوئے۔ ادب میں اب تک ادب برائے ادب کا نظریہ غالب تھا مگر مارکس کے نظریہ کے تحت ادب میں مقصدیت کی تلاش شروع ہوئی۔ ادب برائے زندگی اور ادب برائے ادب کی بحث یہیں سے شروع ہوتی ہے۔

ادب میں ترقی پسند نظریہ کو پہلے پہل پیش کرنے کا سہرا فرانز مہرنگ اور جارج پلیخ نوف کے سر جاتا ہے جس نے ادب میں اس نظریے کی وکالت کی۔ ان دانشوروں نے مارکس کے نظریے کی روشنی میں ادبی نظریے وضع کیے۔ ان کا خیال تھا کہ ادب داخلی اسباب سے زیادہ خارجی اسباب سے متاثر ہوتا ہے اور یہی خارجی اسباب ادیب کے اندرون کو متاثر کرتے ہیں۔

ادیب سماج میں ہونے والے واقعات اور حادثات سے متاثر ہوتا ہے اور اسی کو اپنی تخلیقات میں پیش کر دیتا ہے۔ اس طرح ادب اور زندگی میں ایک اٹوٹ رشتہ ہوتا ہے۔

ادب میں ترقی پسند مارکسی نظریے کا باضابطہ چلن روس میں اشتراکی نظام کے استحکام کے بعد اس وقت سے عام ہوا جب خارکاف میں 1932 میں اشتراکیوں کی کانفرنس ہوئی، جس میں ادب کو سماج کا خادم اور آلۂ کار کے طور پر پیش کیا گیا۔ ہندوستان میں بھی ادب پر اس کے اثرات نمایاں ہوئے مگر سیاست پر کچھ زیادہ ہی اس نظریے کا غلبہ ہوا۔ جس کے نتیجے میں کمیونسٹ پارٹی آف انڈیا کا قیام عمل میں آیا۔

یہی وہ حالات تھے جن میں انجمن ترقی پسند مصنفین کے قیام کے لیے فضا ہموار ہوئی اور 1936 میں ہندوستان میں اس انجمن کا قیام عمل میں آیا۔ ایک طرح سے اس انجمن کی بنیاد لندن میں ڈالی گئی جہاں سجاد ظہیر، محمد دین تاثیر اور ملک راج آنند کی سرکردگی میں ایک تنظیم انڈین پروگریسیو رائٹرس ایسوسی ایشن کے نام سے قائم ہوئی۔ اس انجمن کو جولائی 1935 کو پیرس میں ہونے والی ورلڈ کانگریس آف دی رائٹرس فار دی ڈیفنس آف کلچر سے کافی تقویت ملی۔ گو کہ ادب اور سماج کی بحث ترقی پسند نظریے سے پہلے محمد حسین آزادؔ اور حالیؔ وغیرہ کے یہاں بھی نظر آتی ہے مگر ہندوستانی ادب میں اس نظریے کی باضابطہ تبلیغ 1936 کی لکھنؤ میں منعقدہ ترقی پسند مصنفین کی کانفرنس سے شروع ہوتی ہے۔ لکھنؤ کی اس کانفرنس میں جو مینی فیسٹو پیش کیا گیا تھا اس کا خلاصہ مختصراً یہ ہے کہ ہمارے ملک ہندوستان میں بڑی بڑی تبدیلیاں رونما ہو رہی ہیں۔ ان تبدیلیوں کے نتیجے میں انحطاط پرستی، رجعت پسندی موت کے قریب پہنچ چکی ہے لیکن بالکل ختم نہیں ہو سکی ہے۔ یہ روپ بدل بدل کر ہمارے سامنے ہمیشہ آتی رہتی ہے جس سے ہماری زندگی اور ہمارے معاشرے کا ہر شعبہ متاثر ہوتا ہے۔ ایسی صورت حال میں ہندوستانی ادیبوں اور شاعروں کا فرض ہے کہ ملک میں ابھرنے والے ترقی پسند رجحانات کی ترجمانی کریں اور ان کی نشوونما میں بھرپور حصہ لیں۔ ترقی پسند تحریک سے پہلے جب ہم ماضی کے ادب پر نظر ڈالتے ہیں تو دیکھتے ہیں کہ وہ زندگی کی حقیقی کیفیتوں سے جی چراتا رہا ہے۔ بے بنیاد روحانیت اس کی پناہ گاہ رہی ہے۔ اس وجہ سے اس ادب میں بھی بہت ساری خامیاں پیدا ہو گئیں۔ اس طرح ہم دیکھتے ہیں کہ ترقی پسندوں نے ادب کو دو حصوں میں تقسیم کیا تھا۔ ایک رجعت پسند، دوسرے ترقی پسند۔ ترقی پسند ادب وہ ہے، جس میں اقتصادیات، سیاست، فلسفہ، جنسیات اور تہذیبی و تمدنی تحریکات کا عکس ہو۔ ان

باتوں کی پیش کش میں بعض ترقی پسند دانشور اس حد کو پہنچ گئے کہ ادب کو پروپیگنڈہ بنادیا۔ چنانچہ اس تحریک کے نظریہ ساز دانشوروں نے اس پرسخت گرفت کی۔ ہماری بات طویل ہوجائے گی اگر ہم ترقی پسند تحریک کی پوری تاریخ بیان کرنے لگ جائیں۔ مختصراً یہ کہ ترقی پسند تحریک ایک کارآمد مقصدی اور بروقت تحریک رہی ہے۔ جس کے اثرات آج بھی نمایاں طور پر محسوس کیے جاسکتے ہیں۔

اس تحریک نے اپنے اس طویل سفر میں کئی طرح کے کھٹے میٹھے تجربات ومشاہدات کیے۔ جہاں ایک طرف اس کے اثرات ادب پر مثبت طور پر اثرانداز ہوئے، وہیں اس کی راہ میں کئی طرح کے منفی اثرات کا بھی ہم نے مشاہدہ کیا۔ جن میں سے ایک سب سے بڑا اور تکلیف دہ واقعہ ہندی اور اردو کے تنازعہ کے شکل میں ہمارے سامنے آیا۔ خود ترقی پسندوں کے درمیان سے ہندی ادیبوں کا ایک گروہ اردو کے خلاف آوازیں بلند کرنے لگا بلکہ ہندی کے بڑے ترقی پسند ساہتیہ کارنے تو اردو کو دیے جانے والے حق کو باسی بھات میں خدا کا ساجھا قرار دیا۔ جس پر ایک بڑا تنازعہ کھڑا ہوگیا اور کافی واویلا مچا۔ ترقی پسندوں کے اس آپسی جوتم پیزار سے اس تحریک اور نظریے کو بڑا نقصان پہنچا۔ یہ بات گرچہ اب قدرے پرانی ہوچکی ہے مگر اس کے دوررس اثرات نے اس تحریک کو بدنامی کا طوق پہننے پر مجبور کردیا۔ آج بھی ہندی اور اردو کے درمیان یہ خلیج واضح طور پر دیکھی جاسکتی ہے۔

اس تحریک کے سفر میں ایک موڑ ایسا بھی آیا جب عہدے اور نام ونمود کی خاطر اس تحریک کے متوازی ایک دوسری تنظیم کا قیام بھی عمل میں لایا گیا جس کی وجہ سے بھی اس تحریک کو بڑا نقصان اٹھانا پڑا۔ مجروح سلطانپوری نے کہا تھا کہ لوگ ساتھ آتے گئے اور کارواں بنتا گیا۔ لیکن یہاں معاملہ کچھ الٹا ہی نظر آتا ہے اور کارواں بنتا، بکھرتا اور منتشر ہوتا ہوا محسوس ہوتا ہے:

وائے ناکامی متاعِ کارواں جاتا رہا
کارواں کے دل سے احساسِ زیاں جاتا رہا

آج نئی نسل کے ادیب جو ترقی پسند تحریک کی ڈائمنڈ جبلی منارہے ہیں انہیں یہ بات پیش نظر رکھنی ہوگی کہ ہم ان غلطیوں کا اعادہ نہ کرتے ہوئے ان غلطیوں کا احتساب کریں اور اتحاد، اتفاق، ایمان داری اور احساس ذمہ داری کا ثبوت دیتے ہوئے اس تحریک میں نئے عزم کے ساتھ روح پھونکنے کی کوشش کریں تب ہی ہم کامیاب وکامران ہوں گے۔ (اپریل 2012)

اردو فکشن کی آبرو

یہ محض اتفاق نہیں بلکہ حسن اتفاق ہے کہ مئی 1912 میں اردو فکشن کا سب سے اہم اور اولین نام ڈپٹی نذیر احمد کا اس جہان فانی سے کوچ ہو رہا تھا تو دوسری طرف اردو فکشن کا ایک اہم اور سب سے متنازعہ شخصیت منٹو کا ورود ہو رہا تھا۔ ڈپٹی نذیر احمد کا انتقال 3 رمئی کو ہوا جب کہ سعادت حسن منٹو کی پیدائش 11 رمئی 1912 کو ہوئی۔ اس طرح اس مئی میں نذیر احمد کی برسی کی صدی پوری ہوئی اور منٹو کی پیدائش کی۔

ہمارا ارادہ صرف منٹو پر ایک شمارہ وقف کرنے کا تھا۔ لیکن بھلا نذیر احمد کو نظر انداز کر کے کیوں کر آگے بڑھا جا سکتا ہے۔ چنانچہ تبرکاً ہی سہی ایک مضمون مولوی نذیر احمد کی نذر کیا جا رہا ہے۔ یہ مضمون مختصر مگر انتہائی جامع ہے۔ مولوی نذیر احمد اور منٹو میں ایک بات مشترک یہ ہے کہ دونوں ہی ادیب متنازعہ اور معتوب رہے۔ مولوی نذیر احمد پر کفر اور بے دینی کے فتوے تک صادر کیے گئے۔ لیکن بہر حال نذیر احمد نے اپنے زمانے میں جو کارنامے انجام دیے وہ اپنے آپ میں بے مثل ہیں۔ نذیر احمد کا سب سے بڑا کارنامہ بلاشبہ ان کا شاہکار ابن الوقت ہے۔ دیگر تصانیف بھی اہم اور نادر روزگار ہیں۔ نذیر احمد اپنے ناولوں میں کسی ماہر تعلیم کی طرح اپنے قارئین کو ذہن میں رکھ کر اسباق تیار کرتے نظر آتے ہیں۔ وہ خود لکھتے ہیں:

''میں اپنے بچوں کے لئے کتابیں چاہتا تھا کہ وہ ان کو چاؤ سے پڑھیں ..... ڈھونڈھا، تلاش کیا، کہیں پتہ نہ لگا۔ ناچار میں نے ہر ایک کے مناسب حال کتابیں بنانی شروع کیں۔ بڑی لڑکی کے لئے مراۃ العروس، چھوٹی کے لئے منتخب الحکایات، بشیر کے لئے چند پند، یہ نہیں کیا کہ کتابیں سالم لکھ لیں، تب پڑھانی شروع کیں۔ نہیں، بلکہ ہر ایک کتاب کے چار چار پانچ پانچ صفحے لکھ کر ہر ایک کے حوالے کر

دئے۔ مگر وہ بچوں کو ایسی بھائیں کہ جس کو پاؤ صفحے کے پڑھنے کی طاقت تھی، وہ آدھے صفحے کے لئے اور جس کو ایک صفحے کی استعداد تھی وہ ورق کے لئے متعجل تھا، جب دیکھو ایک نہ ایک متقاضی کہ میرا سبق کم رہ گیا ہے۔ میں اسی وقت قلم برداشتہ لکھ دیا کرتا۔ یوں کتابوں کا پہلا گھان تیار ہوا"۔

جہاں تک منٹو کا سوال ہے تو متنازعہ فیہ ادبی شخصیات میں وہ سب سے آگے نظر آتے ہیں لیکن وہ کبھی لعن طعن سے دلبرداشتہ نہیں ہوئے اور ہمیشہ وہی کرتے نظر آتے ہیں جو انہیں صحیح اور مناسب معلوم ہوتا ہے۔ کلیات منٹو کے مرتب ڈاکٹر ہمایوں اشرف نے بہت صحیح لکھا ہے:

'منٹو پر ہندوستان، پاکستان اور یورپ کے بہت سارے لوگوں نے لکھا، منفی اور مثبت۔ لیکن منٹو کو کبھی اس کی پرواہ نہیں رہی۔ انہوں نے تنقید نگاروں کو کوئی خاص اہمیت نہیں دی۔ نہ کسی کا فرمان مانا، نہ کسی کے کہنے پر چلے۔ انہیں خودسر، ضدی، جھکی، منہ پھٹ، بدزبان، فراڈ، ملحد، سیاہ قلم، فحش گو، عریاں نویس، کیا کیا نہ کہا گیا لیکن وہ اپنی بے مثال فنکاری کا مظاہرہ کرتے رہے۔ دیکھا جائے تو اچھی، بری، اعلیٰ، ادنیٰ آرا کا تصادم ان کے فن کی زندگی کی دلیل ہے۔ دراصل منٹو کا اپنا ایک واضح نقطہ نظر تھا کہ "پتی ورتا استریوں اور نیک دل بیویوں کے بارے میں بہت کچھ لکھا جاچکا ہے۔ اب ایسی داستانیں فضول ہیں۔ زندگی کو اس کی حقیقی شکل میں پیش کرنا چاہئے"۔ وہ کہتے تھے کہ میں اس تہذیب کی چولی کیا اتاروں گا جو ہے ہی ننگی۔ بعض تنقید نگاروں نے انہیں سیاہ قلم کہا تو انہوں نے صاف طور پر جواب دیا "آپ لوگ مجھے سیاہ قلم کہتے ہیں لیکن میں تختہ سیاہ پر کالی چاک سے نہیں لکھتا، سفید چاک استعمال کرتا ہوں کہ تختہ سیاہ کی سیاہی اور بھی نمایاں ہو جائے۔"

منٹو نے شاعری کو چھوڑ کر نثر کی تقریباً تمام اصناف میں طبع آزمائی کی۔ جن میں افسانہ، ناول، خاکے، انشائیہ، ڈرامہ اور ترجمے وغیرہ سبھی کچھ شامل ہیں۔ منٹو نے تقریباً 60 سے زائد چھوٹے بڑے مضامین بھی تحریر کیے۔ منٹو کے یہ مضامین ان کے تین مجموعے منٹو کے مضامین (1942 میں)، تلخ ترش اور شیریں (1954 میں) اوپر نیچے اور درمیان (1954 میں) شائع ہوئے۔ ان مضامین میں بڑی گہری اور باریک باتیں بھی ہیں اور چلتی پھرتی اور عام سی باتیں بھی۔ منٹو کے مضامین جو تقسیم سے پہلے شائع ہوئے ان میں برصغیر کی تقسیم سے پہلے کے حالات اور تنازعات کا ذکر ہے اور جو مضامین آزادی کے بعد شائع ہوئے ان میں بیشتر تقسیم کا المیہ اور فرقہ وارانہ فسادات کا نوحہ ہیں۔ جو بعض اوقات سنجیدہ پیرائے میں اور بعض اوقات طنز و مزاح کے

انداز میں تحریر کیے گئے ہیں۔ 'باتیں' کے تحت منٹو اپنے احساسات کا ذکر کچھ ان الفاظ میں کرتے ہیں: ''میرا خیال تھا کہ یہ جو فساد ہو رہا ہے اس میں ہندو اور مسلمان ایک دوسرے سے مصروف پیکار ہو جائیں گے اور دونوں کے خون کا ملاپ جو مندروں اور مسجدوں میں نہیں ہوگا۔ موریوں اور بدروں میں ہوگا۔ مگر مجھے بہت تعجب ہوا جب میرا یہ خیال بالکل غلط ثابت ہوا۔''

بہر حال منٹو بھی انسان تھے پتھر نہیں، جو حالات کے جبر سے دلبرداشتہ یا غمگین نہیں ہوتے۔ وہ بھی ایک موقع پر ایسے دلبرداشتہ ہوئے کہ اپنے اصل میدان افسانہ نگاری سے ہٹ کر کالم نگاری اور مضمون نگاری کی طرف رجوع ہوتے ہیں۔ سنجیدہ اور طنزیہ مضامین لکھنے لگے۔ 'ٹھنڈا گوشت' پر جو قضیہ اور مقدمہ شروع ہوا اس نے منٹو جیسے ضدی اور ارادے کے پکے انسان تک کو پریشان کر کے رکھ دیا۔ چنانچہ وہ 'ٹھنڈا گوشت' پر طویل مقدمے کا ذکر کرتے ہوئے لکھتے ہیں: ''سوچ سوچ کر میں عاجز آ گیا تھا۔ چنانچہ آوارہ گردی شروع کر دی۔ بے مطلب سارا دن گھومتا رہتا تھا، خود خاموش رہتا لیکن دوسروں کی سنتا رہتا تھا، بے ہنگم باتیں، بے جوڑ دلیلیں، خام سیاسی مباحثے، اس آوارہ گردی سے یہ فائدہ ہوا کہ میرے دماغ میں جو گرد و غبار اڑ رہا تھا، آہستہ آہستہ بیٹھ گیا اور میں نے سوچا کہ ہلکے پھلکے مضامین چاہئیں۔ چنانچہ میں نے 'ناک کی قسمیں، دیواروں پر لکھنا' جیسے مضامین 'امروز' کے لیے لکھے جو پسند کیے گئے۔ آہستہ آہستہ مزاج خود بخود طنزیہ رنگ اختیار کر گیا۔''

منٹو بہ حیثیت افسانہ نگار مشہور و معروف ہیں اور یہی ان کی اصل شناخت ہے۔ منٹو کے افسانے بہ آسانی دستیاب بھی ہیں اور افسانہ کے قارئین ان کا مطالعہ بار بار کر چکے ہیں۔ لیکن منٹو نے جو طنزیہ اور سنجیدہ مضامین اور کالم لکھے ہیں وہ ان کی افسانہ نگاری کے بوجھ تلے دب سے گئے ہیں۔ عام طور پر قارئین منٹو کے مضامین کو نظر انداز کرتے رہے ہیں۔ لیکن منٹو کے مضامین یا 'امروز' میں لکھے گئے ان کے کالم کے مطالعہ سے اس نتیجے پر بہ آسانی پہنچا جا سکتا ہے کہ منٹو سیاسی، سماجی اور ادبی مضامین لکھنے پر اتنے ہی قادر اور کامیاب تھے جتنے کہ افسانہ نگاری پر۔ ہم نے اس شمارہ میں اسی پہلو یعنی مضمون نگار یا کالم نویس منٹو کو ابھارنے کی کوشش کی ہے۔ چنانچہ ہم ان کے چند چنندہ مضامین 'نگارشات منٹو' کے عنوان سے پیش کر رہے ہیں۔

بہر حال اولین فکشن نگار نذیر احمد کی خالص ادبی افسانوی تحریر ہو یا علمی اور ادبی، یا منٹو کے افسانے اور دیگر مضامین ہوں۔ یہ طے ہے کہ یہ دونوں عظیم فنکار اردو فکشن کی آبرو ہیں۔ (مئی 2012)

بامقصد زندگی کا خوگر

بیسویں صدی کے ہندوستان کی چند عبقری شخصیات میں حکیم عبدالحمید کا نام خصوصیت کے ساتھ لیا جاتا ہے۔ حکیم عبدالحمید کا امتیاز یہ ہے کہ وہ اپنی ساری زندگی نام ونمود اور صلہ کی پرواہ کیے بغیر مسلسل اور متواتر کام کرتے رہے۔ وہ محض ایک طبیب نہیں جسے عرف عام میں ڈاکٹر کہا جاتا ہے بلکہ وہ ایک ماہر حکیم، نباض، چہرہ شناس اور ہمدرد دل ودماغ کے مالک تھے۔ عبدالحمید صاحب اپنے نام کے ساتھ حکیم بھی لگایا کرتے تھے اور وہ حکیم ہی کہلانا پسند کرتے تھے۔ (یہ بات ان حکمار کے لیے لمحۂ فکریہ ہے جو آج حکیم کے بدلے ڈاکٹر کہلانا زیادہ پسند کرتے ہیں)۔ ڈاکٹر یا طبیب اسے کہتے ہیں جو کسی مریض کا علاج کرتا ہے، جب کہ حکیم حکمت، دانائی اور دانشوری کا حسین امتزاج ہوتا ہے۔ عبدالحمید ان معنوں میں واقعی ایک سچے حکیم اور ہمدرد قوم وملت ہیں۔ ہیں کا لفظ میں نے قصداً اس لیے استعمال کیا ہے کہ وہ اپنے کارناموں اور خدمات کے سبب آج بھی ہمارے درمیان زندہ اور پائندہ ہیں۔

حکیم عبدالحمید نے اپنے 91 سال کی زندگی میں جو خدمات انجام دیں وہ لائق تقلید ہیں اور انہوں نے اپنی زندگی میں مختلف ادارے کی شکل میں جو چھوٹے چھوٹے پودے لگائے تھے وہ آج بڑے بڑے گھنے اور چھتنار درخت کی شکل اختیار کر چکے ہیں۔ اور ان میں مزید انکھوے اور پھل پھول کے آثار واضح طور پر دکھائی دے رہے ہیں۔ انہیں اس جہان فانی سے انتقال کیے کم وبیش 13 سال ہونے کو آئے اور اس عرصے میں ان کے کارناموں نے جو استحکام اور مضبوطی حاصل کی ہے ان کی سراہنا نہ کرنا اس عظیم شخصیت کے تئیں ناشکری اور ناسپاسی ہی ہوگی۔

یہ دیکھ کر آج خوشی ہوئی کہ حکیم عبدالحمید کی حیات وخدمات پر محیط چار ضخیم کتابیں ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس دہلی سے شائع ہوئی ہیں۔ مناسب معلوم ہوتا ہے کہ ان چاروں کتابوں کا مختصر تعارف آپ سے کراؤں۔ پہلی کتاب 'حیات حمید' کے نام سے اشاعت پذیر ہوئی ہے۔ جس میں حکیم عبدالحمید کی سرگزشت حیات بیان ہوئی ہے۔ چونکہ عبدالحمید کوئی پیشہ ور ادیب تھے اور نہ ہی ان کے پاس اتنا وقت تھا کہ وہ باضابطہ اور مربوط خود نوشت سوانح لکھتے۔ اس لیے

تقریباً500 صفحات پر بسیط اس سرگزشت حیات میں ان کے چھوٹے چھوٹے مضامین اور متفرق تحریروں کو کتاب کے مرتب عابد رضا بیدار نے کچھ اس ڈھنگ سے ترتیب دیا ہے کہ اس نے ایک مربوط خودنوشت کی صورت اختیار کرلی ہے۔ اس کتاب میں سوانحی دستاویزات اور جن مختلف اور متفرق تحریروں کو یکجا کیا گیا ہے وہ کچھ اس طرح ہیں۔

کچھ اپنے بارے میں (1934)، کتاب زندگی کے چند ورق (1941)، اعلان نامہ: ہمدرد قوم کے نام وقف (1948)، یوروپ کا سفر (1956)، صورت حال، 1958 میں، وقف نامہ ترمیم (1960)، اظہار نامہ، وقف نامہ 1948 اور ترمیم 1960 کے سلسلہ میں (1960)، ہماری لیبر پالیسی (1960)، مالی معاملات 1964 میں، ہمدرد نیشنل فاؤنڈیشن (1964)، ہمدرد کی صورت حال 1968 میں، بزنس اینڈ ایمپلائمنٹ بیورو سے 'بیک ورڈ کلاسز سینٹر آف اکنامک 'انٹیگریشن' تک (1974)، ہمدرد کی صورت حال 1976 میں، نذر حمید کی شکرگزاری (1981)، 'خاندانی انکم' کے بارے میں: وقف نامہ میں ترمیم (1958) وغیرہ کے علاوہ حکیم صاحب کے کئی انٹرویو بھی معاون ثابت ہوئے۔

حکیم عبدالحمید باضابطہ کوئی ادیب تو نہ تھے لیکن ادب سے اور ادب کے معاملات سے بڑی حد تک ان کی دلچسپی ساری زندگی رہی۔ ہندوستانی زبان، مرزا غالب، مخطوطات اور ان کی تدوین ،ان کے چند ایسے ہی ادبی کارنامے ہیں۔ چونکہ ان کا میدان بطور خاص حکمت اور طبابت تھا چنانچہ ان کی زیادہ تر تحریریں اسی نوع کی ہوا کرتی تھیں۔ لیکن ان کی تحریر میں جو فصاحت، سلاست اور روانی ہوتی تھی وہ ہم جیسے بہت سے ادیبوں کے لیے قابل تقلید ہی ہے۔ کہنا چاہئے کہ ان کی ہر تحریر با مقصد ہوتی تھی۔ لایعنی اور فضول باتوں کے لیے ان کے پاس یوں بھی وقت کہاں تھا۔

انہوں نے اپنی زندگی میں جو ادارے اور علاقے قائم کیے یا جن اداروں کو فروغ دیا وہ کچھ اس طرح ہیں: انسٹی ٹیوٹ آف ہسٹری آف میڈیسن: (آئی ایچ ایم آر)، ہمدرد ریسرچ کلینک اینڈ نرسنگ ہوم، غالب اکیڈمی، انڈین انسٹی ٹیوٹ آف اسلامک اسٹڈیز، سینٹر آف ساؤتھ ایشین اسٹڈیز، ہمدرد میڈیکل کالج، انڈیا اسلامک کلچرل سینٹر، ہمدرد نگر، تعلیم آباد، تغلق آباد، ہمدرد یونیورسٹی، ہمدرد آرکائیوز اینڈ ریسرچ سینٹر وغیرہ خاص اور اہم ہیں۔

اس سلسلے کی دوسری کتاب جو ہمارے پیش نظر ہے وہ ہے ''حمید نامے اور احباب نامے'' اور

جیسا کہ نام سے ظاہر ہے، اس کتاب میں حکیم عبدالحمید کے خطوط اور احباب کے خطوط حکیم صاحب کے نام شامل ہیں۔ تقریباً 550 صفحات پر مشتمل اس کتاب میں اس دور کی اہم شخصیات کے نام ان کے خطوط اور ان کے جوابات شامل ہیں۔ ان شخصیات میں مولانا ابوالکلام آزاد، سید ابوالاعلیٰ مودودی، ابوالحسن علی ندوی، اکبر علی خاں عرشی زادہ، مسز اندرا گاندھی، بی این پانڈے، دیوے گوڑا، نہال چند ٹنڈن، حسن نظامی، مسز ڈی سلوا، رفیع احمد قدوائی، کرنل بشیر حسین زیدی، سروپ سنگھ، سید محمود، جنرل شاہنواز، شیخ محمد عبداللہ، پروفیسر عبدالسلام، عبدالماجد دریابادی، فخر الدین علی احمد، برج موہن دتاتریہ کیفی، ڈاکٹر ماتھر، مالک رام اور نیاز فتح پوری کے نام قابل ذکر ہیں۔

بقول مرتب یہ خط 1932 سے 1998 تک کے عرصے پر پھیلے ہوئے ہیں۔ مخاطبوں/ مکتوب نگاروں میں کچھ بے تکلف دوست ہیں، کچھ بزرگ ہیں، کچھ رفقائے کار ہیں۔ ان خطوط کو ایک طور سے خودنوشت سوانح عمری یا آٹو بایوگرافی کا تتمہ مجلد سمجھا جائے جس سے حکیم صاحب کے 1932 سے 1998 تک کے ہر طرح کے کوائف پر روشنی پڑتی ہے۔

اس سلسلے کی تیسری کتاب "عبدالحمید طبیب نہیں حکیم!" کے نام سے شائع ہوئی ہے۔ جس میں حکیم عبدالحمید کی شخصیت اور کارناموں پر لکھے گئے مضامین کو شامل کیا گیا ہے۔ ان مضامین میں بہت سے ان کی حیات میں لکھے گئے اور بہت سے ان کی وفات کے بعد بطور خراج عقیدت تحریر کیے گئے۔ یہ مضامین اس دور کی تقریباً تمام قابل ذکر سیاسی، سماجی، ادبی اور مذہبی شخصیات نے حکیم صاحب کی خدمات کے اعتراف میں تحریر کیے ہیں۔ ان میں تقریباً ہر تحریر محبت اور خلوص سے لبریز ہے۔ البتہ چند ایک حضرات نے انہیں سرسید ثانی کے خطاب سے جس طرح نوازا ہے اس سے مجھے اتفاق نہیں۔ سرسید، سرسید ہیں اور حکیم عبدالحمید حکیم، دونوں کا مرتبہ اور مقام عالی ہے۔ دونوں نے ہی قابل ذکر اور لائق تحسین کارنامے انجام دیے ہیں اور دونوں کی اپنی اپنی شناخت ہے۔ کوئی کسی کا ثانی نہیں۔

اسی سلسلے کی اگلی کڑی حکیم عبدالحمید پر شائع ہونے والی چوتھی کتاب ہے جو انگریزی میں A Role Model for Leaders of change in India کے نام سے شائع ہوئی ہے۔ جس میں انگریزی میں لکھے گئے مضامین شامل ہیں۔ ان حضرات کے لیے جو فعال، متحرک اور بامقصد زندگی گزارنے کے قائل ہیں ان کے لیے چار کتابوں کا یہ سیٹ انتہائی مفید اور کارآمد ثابت ہوگا۔

(جون 2012)

ترقی پسندی کا علمبردار

لیجئے صاحبان! احتشام حسین کی 100 ویں سالگرہ بھی آ پہنچی۔ لیکن یہ کیا کہ اتنے بڑے مفکر، دانشور اور ترقی پسند تحریک کے سرگرم کارکن کی سوویں سالگرہ پر کسی قسم کا جوش وخروش، کوئی ہنگامہ یا چہل پہل نہیں۔ کیا ہم انہیں بھلا چکے ہیں۔ شاید اس کی وجہ یہ ہو کہ وہ بنیادی طور پر نقاد تھے۔ کوئی تخلیقی فنکار نہیں۔ میں یہاں تخلیق اور تنقید کے بیچ کسی تفریق، کسی خلیج یا کمتر برتر کی بحث میں پڑنا نہیں چاہتا۔ یہ سچ ہے کہ تخلیق کی حیثیت مقدم ہے اور یہ خاص وعام کی چیز ہے۔ بیشک تخلیق کو تنقید پر سبقت اور برتری حاصل ہے لیکن تنقید کی حیثیت بھی اپنی جگہ مسلم ہے۔ اگر تنقید کی گرفت کا ڈر تخلیق کار کو نہ ہو تو وہ شتر بے مہار ہو جائے۔ اور اس بے لگامی کی کیفیت میں نہ جانے کیا کیا بک جائے اور کیا کیا کچھ لکھ جائے۔

احتشام حسین کی صدی کے موقع پر اسی غیر متوازن سوچ اور بے حسی کا نتیجہ ہے کہ آج ہم احتشام حسین کو بھلا بیٹھے ہیں۔ یہاں تک کہ آج بھی احتشام حسین کے بہت سے ترقی پسند معاصرین یا ان کے شاگردوں کی ایک بڑی تعداد کے باوجود احتشام حسین کے تئیں بے اعتنائی اور بے مروتی کے ہم شکار ہیں۔ حالانکہ ایسا نہیں ہے کہ احتشام حسین نے صرف تنقید ہی کی ہو۔ بلکہ ان کی ادبی زندگی کا آغاز ہی شعر وشاعری اور افسانہ نگاری سے ہوتا ہے۔ لیکن ان کا قلم شاید تخلیق کی زرخیزی کے لیے موزوں نہیں تھا۔ چنانچہ انہوں نے اپنے اشہب قلم کو تنقید کی طرف موڑ دیا اور پھر کیا تھا ان کا قلم تنقید کے میدان میں کچھ اس قدر سرپٹ دوڑا کہ ان کی تخلیق پیچھے کہاں چھوٹ گئی انہیں خود بھی اس کا احساس نہیں رہا اور پھر انہوں نے تنقید کو ہی اپنا اوڑھنا بچھونا کچھ اس طرح بنالیا کہ اس میدان میں کوئی ان کا ہم سر اور برابری کا نقاد نظر نہیں آتا۔ البتہ ان کے معاصرین میں کلیم

الدین احمد، اپنے ضرب کلیمی کے ساتھ میدان ادب میں کچھ اس طرح وارد ہوئے کہ اردو کا ہر ادیب ان سے حراساں اور پریشاں نظر آنے لگا۔ ہم یہاں کلیم الدین احمد اور احتشام حسین کے درمیان کسی چشمک اور معرکہ آرائی پر اظہار خیال ہرگز نہیں کرنا چاہتے بلکہ ہم صرف احتشام حسین کی شخصیت اور ان کے کارنامے کا ایک اجمالی جائزہ ہی لینا چاہتے ہیں۔

احتشام حسین بلاشبہ ایک روشن خیال دانشور اور خالص مارکسی نقاد تھے اور ہم اسی حیثیت سے ان کی سوویں سالگرہ پر انہیں خراج عقیدت پیش کرنا چاہتے ہیں۔ ہمیں انتہائی خوشی ہے کہ ہمارے اس پروگرام میں بہت سے بزرگ ادیب اور نوجوان طلبہ ہماری آواز پر لبیک کہتے ہوئے اپنی کاوش کے ساتھ سامنے آئے اور اپنے مقالوں/مضامین سے احتشام حسین کے شایان شان خراج عقیدت پیش کرنے میں ہمارا ساتھ دیا۔ لیکن یہاں بھی ہمیں ایک یہی شکایت رہی کہ ہمیں موصول ہونے والی نگارشات میں بیشتر میں احتشام حسین کی تنقید کا ہی جائزہ لیا گیا اور عام طور پر ان کی تخلیقات کو نظر انداز کیا گیا۔

احتشام حسین ایک مارکسی نقاد تھے لہٰذا یہ وضاحت ضروری معلوم ہوتی ہے کہ مارکسی تنقید کو عام طور پر لوگ ترقی پسند تنقید کے نام سے بھی جانتے ہیں اور یہ حقیقت بھی ہے کہ مارکسی تنقید کا آغاز ترقی پسند تحریک کے ورود کے بعد سے ہوتا ہے لیکن ترقی پسند ناقدین کی صف میں سارے نقاد مارکسی اور اشتراکی نہیں ہیں گو کہ ان میں سے بیشتر مارکسی اور اشتراکی نظریہ کے حامل ہیں۔ اس ترقی پسند تنقید میں ایسے ترقی پسند نقاد بھی شامل ہیں جن کا نظریہ ترقی پسند ضرور ہے لیکن وہ پورے مارکسی نہیں۔ یہ نقاد مارکس کی بہت سی باتوں سے اختلاف بھی کرتے ہیں لیکن وہ کسی نہ کسی حد تک مارکسی نظریہ سے متاثر ضرور ہیں، اسی وجہ سے وہ ترقی پسند تنقید کے متحدہ محاذ میں شامل نظر آتے ہیں۔ اس طرح ہم ترقی پسند نقادوں کو دو خانوں میں تقسیم کر سکتے ہیں۔ پہلے خانہ میں خالص مارکسی نقاد ، جن میں سجاد ظہیر، اختر حسین رائے پوری، ممتاز حسین، احتشام حسین، مجنوں گورکھپوری اور محمد حسن شامل ہیں۔ اور دوسرے خانہ میں مارکسی نظریہ سے متاثر نقادوں میں وقار عظیم، اختر انصاری، آل احمد سرور، عزیز احمد اور اختر اورینوی جیسے نقاد شامل ہیں، جنہیں کئی پہلوؤں سے مارکسی نظریات سے اختلاف ہے۔ اختلاف رکھنے والے یہ نقاد خالص مارکسی نقادوں کے برخلاف کسی خاص سیاسی نظریہ کا پرچار کرنا اپنے لیے ضروری نہیں سمجھتے

لیکن ادب کو زندگی کا ترجمان ضرور مانتے ہیں۔ عزیز احمد ادب کو زندگی کا ترجمان مانتے ہوئے بھی مارکسی تنقید کا طبقاتی نظریہ تسلیم نہیں کرتے اور نہ ہی اشتراکی حقیقت نگاری کو پورے طور پر مانتے ہیں۔

ایسے ناقدوں میں احمد علی کا نام سرفہرست ہے۔ جنہوں نے جولائی 1936 میں 'آرٹ کا ترقی پسند نظریہ' پیش کر کے بہت نام پیدا کیا تھا۔ اختر حسین رائے پوری بھی ترقی پسند تحریک کے پرجوش اور سرگرم کارکن کے ساتھ ساتھ ایک اچھے ناقد بھی تھے۔ سجاد ظہیر تو ترقی پسند تحریک کے بانیوں میں سے تھے۔ بلاشبہ وہ ایک بڑے دانشور، فنکار اور ناقد تھے۔ مجنوں گورکھپوری ترقی پسند تحریک کے پہلے سے لکھتے رہے ہیں اور ان کی ناقدانہ حیثیت تحریک سے قبل ہی مسلم ہو چکی تھی۔ فرق صرف یہ ہے کہ پہلے وہ تاثراتی تنقید کیا کرتے تھے مگر جب ترقی پسند تحریک کے زیر اثر وہ مارکسی نظریات سے متاثر ہوئے تو مارکسی تنقید کے علمبردار ہو گئے۔

سید احتشام حسین مارکسی دبستان تنقید کے سب سے قد آور ناقد ہیں۔ انہوں نے جس شدومد اور پرزور طریقے سے مارکسی تنقید کی وکالت کی۔ وہ مارکسی تنقید کے لیے استحکام اور سلامتی کا ضامن ثابت ہوا۔ احتشام حسین نے اپنی قوت نقد کا زیادہ استعمال ترقی پسند ادب سے متعلق غلط فہمیاں دور کرنے میں صرف کیا۔ گویا وہ ترقی پسند ادب کے وکیل دفاع تھے۔

احتشام حسین ادب کو مقصد نہیں ذریعہ سمجھتے ہیں۔ وہ ذریعہ جس کے وسیلے سے وہ معاشی و اقتصادی مقصد پیش کرتے ہیں۔ چنانچہ ان کا یہ ذریعہ ساکن نہیں متحرک ہے، جامد نہیں تغیر پذیر ہے۔ جس کے سمجھانے کے لیے وہ ایک فلسفیانہ تجزیہ کو ضروری سمجھتے ہیں۔

احتشام حسین نے ایک ترقی پسند نقاد کا نقطہ نظر پیش کرتے ہوئے ماضی کے ادبی ورثہ پر بھی اپنی آرار کا بڑے ہی متوازن انداز میں اظہار کیا ہے۔ دراصل کچھ ترقی پسند نقاد کے ذریعہ ماضی کے ادب کے تئیں جس انتہاپسندی کا مظاہرہ کیا گیا تھا، احتشام حسین نے بڑی خوبی کے ساتھ اس کا ازالہ کرنے کی کوشش کی ہے۔

جہاں ایک طرف احتشام حسین نے قدیم ادب کی اہمیت کی وضاحت کی ہے، وہیں انہوں نے 'مواد اور صورت'، 'الفاظ اور خیالات' کے میل کا بھی اعتراف کیا ہے۔ مگر ایسا معلوم ہوتا ہے کہ 'مواد' ان پر کچھ زیادہ ہی غالب ہے۔ چنانچہ اکثر وہ 'مواد' کو اولیت دیتے ہیں اور اسلوب کو مواد کا تابع سمجھتے ہیں۔

احتشام حسین ترقی پسند تنقید کے وکیل ہیں اور ہر جگہ اس کی صفائی پیش کرتے نظر آتے ہیں۔ چنانچہ جب کبھی وہ ترقی پسند شاعر، ادیب اور ناقد پر تنقیدی نظر ڈالتے ہیں تو انہیں ان میں صرف صحت مند اور اچھا ادب ہی نظر آتا ہے اس لیے کہ وہ عوام کے لیے ادب پیش کر رہے ہیں۔ دراصل وہ ترقی پسندی اور مارکسزم کو ادب اور انسانیت کی فلاح کا ضامن سمجھتے تھے، جس پر وہ تمام عمر قائم رہے۔
(جولائی 2012)

''..... پہلے پرچہ میں ایک دو مضامین دیگر جادو نگاروں کے بھی تھے مگر اس کے بعد ہی سے قدر دانوں کا اصرار دیکھ کے پابندی کر لی گئی کہ اس کے صفحات پر سوائے ایڈیٹر کے اور کسی کی کوئی تحریر نہ ہوا کرے..... ان بارہ مہینوں میں دلگداز نے جیسے تازہ، نئے، اچھوتے اور ضروری واقعیت کے تاریخی مضامین پیش کیے ہیں اور کوئی کم پیش کر سکا ہوگا۔ پھر اس کے ساتھ دلگداز کی ادبی خصوصیات یعنی جیسی زبان، جیسے الفاظ، جیسے رنگ اور جس مستند اور دلچسپ لٹریچر میں دلگداز نے ان واقعات کو بیان کیا یہ اسی کا کام تھا..... اب زمانہ میں خالص لفاظی اور ہوا میں خیال کے قلعہ بنانے کو زیادہ پسند نہیں کیا جاتا.....'' (دلگداز، دسمبر 1910)

''خواتین کے لئے عصمت میں دینی اور دنیوی دونوں قسم کی فلاح و بہبود ملحوظ ہے۔ کنواری لڑکیوں کو، عصمت بتائے گا کہ کنوارپنے کی زندگی ان کو کس طرح گزارنی ہے۔ ماں باپ کا ادب، بھائی بہنوں کی خدمت، بڑوں کی تعظیم چھوٹوں سے محبت ان کا فرض منصبی ہے۔ جس نئی دنیا میں ان کو شامل ہونا ہے اس کے لئے انہیں کیا تیاری کرنی ہے۔ جو جو دقتیں پیش آئیں گی ان کو کس طرح دفع کرنا ہے۔ ساس نندوں کے ساتھ ان کے تعلقات کیسے ہونے چاہئیں۔ بیاہی لڑکیوں کو خانہ داری، گھر کے حساب کتاب اور بچوں کی پرورش میں عصمت سے مدد ملے گی..... عصمت انہیں بتائے گا کہ انہیں گھر کس طرح کرنا ہے۔ روپیہ کا مصرف کیا ہے۔ خاندان کس طرح بسر کرنی چاہئے۔'' (راشد الخیری، عصمت، جنوری 1909)

بے چارے مردوں کے اعصاب پر...

ایک تھی لڑکی۔ وہ کتنی خوبصورت تھی مجھے نہیں معلوم۔ خدا کی قسم مجھے نہیں معلوم۔ کیونکہ ہم نے اسے دیکھا ہے اور نہ اس سے کبھی ہماری ملاقات ہوئی۔ البتہ اس کے افسانے کچھ اس قدر رنگین، نفیس اور دل کو چھو لینے والے ہوتے تھے کہ ان تحریروں سے اس لڑکی کی جو شبیہ ہمارے تصور میں متشکل ہو کر سامنے آتی ہے وہ دنیا کی چند حسین ترین لڑکیوں میں سے ایک ہو سکتی تھی۔ چنانچہ ایک ہم ہی کیا اچھے اچھے نیک، پرہیزگار اور باشرع قسم کے حضرات بھی اس لڑکی سے ملنے کو مرغ بسمل کی طرح تڑپتے رہتے۔ لیکن وہ لڑکی جو ایسے مردوں کے خوابوں کی ملکہ بنی ہوئی تھی وہ عرصۂ دراز تک کسی بھی مرد کے سامنے حقیقتِ منتظر کی طرح کبھی نہیں آئی۔ لطف کی بات یہ ہے کہ دن بہ دن اس کے چاہنے والوں کی فہرست لمبی ہوتی جاتی تھی۔

چلیے اب ہم آپ کو مزید تجسس اور انتظار کے کرب میں مبتلا رکھنا نہیں چاہتے۔ ورنہ آپ کے صبر کا پیمانہ لبریز ہو جائے گا اور ہماری شامت آجائے گی۔ ہم اس لڑکی کا نام بتائے دیتے ہیں۔ اس کا نام تھا 'طاہرہ دیوی شیرازی'۔ راوی کا بیان ہے کہ وہ لڑکی اہل ہنود میں سے تھی اور اس کا نام اسی مناسبت سے کچھ اور تھا۔ کہتے ہیں کہ وہ لڑکی کسی مسلم لڑکے کے عشق میں مبتلا ہو کر طاہرہ دیوی شیرازی ہو گئی۔ اپنے آپ میں یہ نام بھی کچھ اتنا پیارا، خوبصورت اور دلکش ہے کہ جو اچھے اچھے دل پھینک حضرات کو اپنے زلف گرہ گیر کا اسیر بنانے کے لیے کافی ہے۔

طاہرہ نام کی یہ لڑکی کتنی پاکباز یا پارسا تھی یہ تو نہیں معلوم، البتہ نام کا دوسرا جزو خود ساختہ 'دیوی' اسے مزید ستی ساوتری ثابت کرنے کے لیے کافی تھا۔ رہی شیرازی کی بات تو شیراز نام کے اس مقام کو کون پڑھا لکھا انسان نہیں جانتا یا جاننا نہیں چاہتا۔ طاہرہ کے نام کا یہ آخری جزو طاہرہ کی

شخصیت کو مزید نفیس، پرکشش اور نرم و نازک ظاہر کرنے کے لیے کافی ہے۔

معاملہ اب بھی صاف نہیں ہوتا کہ آخر یہ طاہرہ دیوی شیرازی ہے کون؟ لیکن یہ تو طے ہے کہ اس کے چاہنے والوں میں ریشہ خطمی حضرات اس کے دور میں یعنی 20 ویں صدی کی چوتھی اور پانچویں دہائی میں بھی اچھے خاصے تھے۔ طاہرہ دیوی کے افسانے چھپتے اور ہاتھوں ہاتھ لیے جاتے۔ ٹھیک اسی طرح کہ جس طرح ابن صفی کے جاسوسی ناول حاصل کرنے والوں کو گھنٹوں لائن میں لگ کر انتظار کرنا پڑتا تھا۔ اور جب تک انہیں ناول نہیں مل جاتا وہ بے چین رہتے تھے، لیکن ان دونوں میں ایک واضح فرق ہے۔ جاسوسی دنیا کے مصنف ابن صفی کو سبھی اچھی طرح جانتے تھے کہ وہ اسرار احمد ہیں اور جو اسرار ناروی کے نام سے شاعری بھی کرتے تھے۔ لیکن طاہرہ ایک ایسی پراسرار شخصیت تھی جس کا سحر تو سب پر چلتا، لیکن اس کا خود کا کوئی پتہ ٹھکانہ کسی مرد کو معلوم نہ ہو سکا۔ ایک طرح سے یہ اچھا ہی ہوا، ورنہ نہ جانے کتنے مرد اس کے عشق میں آہیں بھرتے مجنوں کی صورت سر جھاڑ منہ پھاڑ گریباں چاک ادھر ادھر مارے پھرتے۔

واقعہ کچھ یوں ہے کہ ماہنامہ 'آجکل' کے جون کے شمارہ میں، ہم نے طاہرہ دیوی شیرازی پر ایک مضمون شائع کر دیا کہ مضمون نگار کو اس بات کی شکایت تھی کہ ان کے وطن بنگال کی ایک افسانہ نگار طاہرہ دیوی تعصب کا شکار ہوئی ہے ورنہ وہ اردو کے قابل ذکر افسانہ نگاروں میں سے ایک ہے۔ ہم نے نوشاد مومن کے شکوے اور تعصب کے طعنے کو مد نظر رکھتے ہوئے ان پر ایک مختصر مضمون 'ایک گمنام افسانہ نگار طاہرہ دیوی شیرازی' کو شائع کر دیا۔ پھر کیا تھا اس کے منظر عام پر آتے ہی باخبر حاملان ادب حضرات نے اس پر اپنے ردعمل کا اظہار کچھ اس طرح کرنا شروع کر دیا کہ جس کی ہم نے خواب میں بھی توقع نہیں کی تھی۔ طاہرہ دیوی کو اس کی زندگی میں بھی شاید اتنا شور و غوغا نہیں سننا پڑا ہوگا جتنا کہ آج اس کے نہ ہونے پر بھی ہو رہا ہے۔ حقیقت تو یہ ہے کہ وہ اپنے زمانے میں جواب دینے کے لیے موجود تھی بہ الفاظ دیگر طاہرہ دیوی شیرازی کے خالقین اس نام کے پردہ میں تفریح طبع کے لیے یہ شرارت کر رہے تھے۔ وہ ہر وقت چاق و چوبند اور مستعد رہا کرتے تھے کہ ادھر ذرا سی بھی طاہرہ پر کوئی آنچ آئی اور ادھر اس سے نمٹنے کے لیے یہ حضرات تیار۔ دوسرے لفظوں میں طاہرہ دیوی شیرازی جب کبھی مثل شعلہ دہکتی ادھر مثل فائر بریگیڈ یہ حضرات آگ بجھانے کے لیے ہمہ وقت تیار رہتے۔

طاہرہ کی شخصیت اصل ہے یا کوئی فسانہ، یہ تو اس زمانے میں ہی صاف ہو گیا تھا کہ وہ

حقیقت نہیں بلکہ ایک افسانوی کردار ہے، جسے دہلی کے چند حضرات نے تفریح طبع کے لیے خلق کیا تھا۔ ٹھیک اسی طرح جس طرح 'انارکلی' کہ جس کو نام نہاد عاشقین کراچی اور لاہور کی گلیوں میں آج بھی ڈھونڈتے پھرتے ہیں اور آج بھی بعض لوگوں کے قدم ان کوچوں کی طرف بے ساختہ اٹھ ہی جاتے ہیں۔ 'امراؤ جان ادا' کا افسانہ بھی کچھ کم دلچسپ نہیں جو اپنی ادبی اور شاعرانہ شخصیت کے باوصف زندہ و جاوید کردار بن گئی۔ انارکلی کو امتیاز علی تاج نے اپنے قلم کی جادو بیانی سے امر کر دیا اور مرزا ہادی رسوا نے امراؤ جان ادا کو لافانی بنا دیا۔ آج بھی امراؤ جان ادا کو فیض آباد اور لکھنؤ کی گلیوں میں شائقین پوچھتے پھرتے ہیں۔ کسی افسانوی تخلیق کا اس قدر حقیقی نظر آنا ان کرداروں کی مقبولیت کا جیتا جاگتا ثبوت ہے۔

اردو ادب کی یہ خوش نصیبی ہے کہ اسے انارکلی، امراؤ جان ادا اور طاہرہ دیوی شیرازی جیسے مضبوط کردار نصیب ہوئے۔ ایسے اور بھی لافانی کردار اردو ادب میں موجود ہیں لیکن اگر ہم صرف ان تین کرداروں کا مطالعہ کریں تو ان تینوں میں ایک واضح فرق نظر آتا ہے کہ جہاں ایک طرف امراؤ جان اودھ کی تہذیب و ثقافت کا نمونہ پیش کرتی ہے وہیں دوسری طرف مغلیہ عہد حکومت کی تہذیب و ثقافت کی عکاسی انارکلی کے وسیلے سے پیش کرنے میں امتیاز علی تاج پوری طرح کامیاب ہیں۔ جہاں تک طاہرہ دیوی شیرازی کا سوال ہے تو وہ امراؤ جان اور انارکلی کی طرح کسی کہانی کا کردار نہیں بلکہ خود تخلیق کار نظر آتی ہے۔ یہ اور بات ہے کہ اس تخلیق کو خلق کرنے والے پردۂ زنگاری میں چھپے بیٹھے مزے لیتے رہے البتہ طاہرہ دیوی شیرازی بطور کہانی کار اپنی کہانیوں کے کرداروں سے بنگال کی تہذیب و ثقافت کو پیش کرتی رہی ہے۔ سوال یہ ہے کہ اگر طاہرہ دیوی شیرازی کوئی حقیقی اور اصلی وجود نہیں تو پھر آخر کون اس پردۂ زنگاری میں لوگوں کو بیوقوف بناتا رہا ہے۔ بہ الفاظ دیگر سادہ لوح حضرات کے جذبات سے کھیلتا رہا ہے۔ تحقیق سے پتہ چلتا ہے کہ اس پردۂ زنگاری میں کئی جانی مانی ہستیاں شامل رہی ہیں۔ انہی ہستیوں میں دو ہستیاں وہ شامل ہیں جو ماہنامہ 'آجکل' کے حلقہ ادارت سے منسلک رہی ہیں۔ جس سے آج یہ بندۂ ناچیز منسلک ہے۔ میری مراد آج کل کے اولین دور کے مدیران محمد یعقوب ددائی (یکم جون 1943 تا یکم اکتوبر 1946) اور فضل حق قریشی (15 فروری 1945 تا اگست 1947) سے ہے۔ جن کے نام اس قضیے میں اہم اور نمایاں ہیں۔ بلاشبہ آج کل کے ان مدیران نے تفریح طبع کے لیے شوخی طبع

کا جو کھیل کھیلا اس میں وہ پوری طرح کامیاب رہے کہ اس دور میں بھی لوگ طاہرہ دیوی شیرازی سے ملنے کے لیے بے تاب رہے اور آج تقریباً ستر پچھتر برسوں بعد بھی اس فرضی کردار کو نہ صرف ڈھونڈتے ہیں بلکہ اس کا حق دلانے کے لیے پورے جوش و جذبہ سے دو دو ہاتھ کرنے کو تیار ہیں اور طاہرہ کے تئیں متعصبانہ رویہ روا رکھنے کے خلاف آواز اٹھاتے ہیں۔ اور نتیجتاً لڑکھڑا کر چوٹ کھاتے ہیں۔ شاعر نے سچ کہا ہے:

بے چارے مردوں کے اعصاب پر عورت ہے سوار

دور کوئی بھی ہو، یہ سلسلہ یوں ہی چلتا رہے گا۔ عورت معشوق دلفریب اور مرد مرغ بسمل کی طرح تڑپتا رہے گا اور اسی طرح دنیا کا کاروبار چلتا رہے گا۔

(اگست 2012)

''عصمت نے شروع کے تقریباً چار سال تک ملک وقوم کی جو خدمت کی اس کے مفصل بیان کی ضرورت نہیں۔ اس نے اپنی دلچسپی سے ہزاروں دل فتح کر لئے۔ ایک دنیا اس کی مداح تھی اور ہندوستان کے زنانہ پرچوں میں سب سے بہتر تھا۔ وہ لڑکیوں میں ہر دل عزیز نہیں تھا بلکہ مرد بھی اس کے گرویدہ تھے۔ میری طبیعت نے یہ گوارا نہیں کیا کہ میں بیبیوں کو آزادی اور حریت کی ترغیب دوں۔ خود لکھنا تو درکنار میں نے دوسروں کے مضامین بھی عصمت میں لکھنے سے پرہیز کیا جو بغاوت پیدا کریں اور لڑکیوں کو اپنے حقوق کی طلبی پر آمادہ کریں..... میرا دل مجھ کو ملامت کرتا تھا اور کہتا تھا کہ کمبخت یہی بیماریاں اطاعت اور فرماں برداری کے لئے پیدا کی گئی ہیں یا ان مظلوموں کے بھی کچھ حقوق مردوں کی ذات پر ہیں.....''

(عصمت، نومبر 1915)

''میں ناظرین عصمت کو دو نہایت باتوں کی طرف متوجہ کرنا چاہتا ہوں۔ سب سے پہلی چیز خلع ہے اور دوسری چیز ان بدبخت لڑکیوں کے حقوق کا مطالبہ جو ترکہ پدر سے محروم کر دی گئی ہیں.....''
(عصمت، جنوری 1927ء)

ایسے پراگندہ طبع لوگ

یہ ایک اتفاق ہی ہے کہ حال کے دنوں میں راہی ملک عدم ہونے والی معروف ادبی شخصیات میں اردو کے کئی اساتذہ شامل ہیں جو اپنے خاص علمی شغف کے سبب پہچانے جاتے تھے۔ آج ہم ان اساتذہ میں سب سے پہلے جواہر لال نہرو یونیورسٹی کے اشفاق محمد خاں کا ذکر کریں گے۔ گوکہ وہ ہمارے استاد تھے لیکن وہ ہمارے بے تکلف دوست بھی تھے۔ بے تکلفی کا عالم یہ کہ اگر ان کے بال سارے کے سارے چاندی کے نہ ہو گئے ہوتے تو کسی نووارد کے لیے تمیز کرنا مشکل ہوتا کہ ہم دس بارہ لوگوں کے اس مجمع میں کون استاد ہے اور کون شاگرد؟ باتوں میں بے تکلفی کا یہ عالم تھا کہ بات اکثر شروع تو ہوتی سبق سے کہ آج کیا پڑھنا ہے؟ لیکن جلد ہی موضوع سخن کا ٹریک بدل جاتا اور ہم پہنچ جاتے سماجی اور سیاسی گفتگو پر جو مقامی سیاست سے شروع ہو کر قومی اور بین الاقوامی سیاست تک پھیل جاتی۔ اس زمانے میں یو ایس ایس آر کی سیاست ان کا پسندیدہ موضوع تھا۔ اس موضوع پر میری پکڑ ذرا کمزور سی تھی بلکہ نا کے برابر تھی کہ کمیونزم سے کبھی میری دلچسپی نہیں رہی، لہٰذا میں جلد ہی چپ ہو جاتا۔ ایک طرح سے میں ہتھیار ڈال دیتا۔ استاد کی کوشش ہوتی کہ میں بھی اس موضوع پر کچھ بولوں اور وہ مزے لیں۔ لیکن ہوتا اس کا الٹا۔ میں چپ، ایک چپ ہزار چپ۔ اور وہ میری چپی پر جب جھنجھلاتے تب میری باری ہوتی لطف لینے کی۔ باقی طلبہ لبوں پر معنی خیز مسکراہٹ لیے اشفاق محمد خاں کی ہاں میں ہاں ملایا کرتے۔ اور جب یہی یو ایس ایس آر ٹوٹ گیا تو ان کے دل کے ٹکڑے بھی ہزار ہو گئے اور کوئی یہاں گرا اور کوئی وہاں۔ اس سانحہ کے بعد وہ کچھ چپ چپ جلائے سے رہنے لگے اور اگر کبھی بولتے بھی تو اس سانحہ کے لیے ذمہ دار میخائیل گورباچوف کو بے نطق کی خوب خوب سناتے اور ہم شاگردوں کی

جماعت لطف لیتی گرچہ ان سے اظہار افسوس بھی کچھ اس طرح کرتے گویا یہ ان کا ذاتی نقصان ہو۔ پھر جب ذرا طبیعت ہلکی ہوتی تو ہم سب کو چائے پلاتے۔ لیجئے صاحب ہوگئی کلاس۔

اشفاق محمد خاں ایک زندہ دل انسان تھے اور ہم شاگردوں کو زندہ دلی کا درس دیتے رہتے تھے۔ یہ ان کی بدنصیبی ہی تھی کہ وہ پروفیسر نہ بن سکے، جو یونیورسٹی میں پڑھانے والے ہر استاد کا خواب ہوتا ہے۔ شاید وہ اردو والوں کی سیاست میں ذرا کمزور یا کچے تھے۔

دلّی یونیورسٹی کے ڈاکٹر شریف احمد (20 جولائی) بھی کچھ ایسی ہی سیاست کے شکار ہوئے وہ بھی کبھی پروفیسر نہیں بن سکے۔ وہ نام کے ہی شریف نہ تھے بلکہ عملاً بھی شرافت کا بے مثال پیکر تھے۔ وہ جب بھی ہم سے ملتے، عاجزی اور انکساری کا نمونہ نظر آتے۔ باتیں کرتے ہوئے ان کا لہجہ ایک خاص حد تک دھیما ہوتا اور ان کی کوشش ہوتی کہ وہ اپنی گفتگو میں کچھ نہ کچھ ایسا ضرور چھوڑیں جو سامنے والے کے لیے ایک توشہ اور بے مثل تحفہ کا حکم رکھتی ہو۔ وہ دلّی یونیورسٹی میں استاد تھے اور میں جواہر لال نہرو یونیورسٹی میں طالب علم۔ چنانچہ ان سے ملاقات مختلف سمینار میں ہی ہو پاتی تھی۔ بحیثیت صدر جلسہ شریف صاحب مجھ جیسے نوواردان ادب کی تعریف اور حوصلہ افزائی کرنا اپنا فرض سمجھتے۔ کبھی کبھی ان کی تعریف سے ہم خوش فہمی کے شکار بھی ہو جاتے تھے۔

ان اساتذہ میں سب سے تیز طرار اور فعال شخصیت پروفیسر وہاب اشرفی کی رہی ہے۔ وہاب اشرفی کے انتقال کی خبر سے ہمیں واقعی جھٹکا سا لگا اور میری سماعت میں ایک جملہ بار بار گونجنے لگا کہ کیا واقعی وہاب اشرفی ہمارے درمیان نہیں رہے۔ کیونکہ پچھلے کئی برسوں سے وہاب صاحب کا ایک معمول سا بن گیا تھا۔ اکثر ان کے بارے میں کسی اسپتال کے آئی سی یو میں داخل ہونے کی خبریں ملتی رہتیں اور پھر اگلے ہفتہ ہی دہلی یا پٹنہ کے کسی سمینار کی صدارت کرتے نظر آجاتے۔ اتنی بیماری اور کمزوری کے باوجود وہ جس ہمت اور قوت ارادی کے ساتھ اردو پروگراموں میں نظر آتے کہ ہم عش عش کرتے رہ جاتے۔ لیکن کب تک؟ آخر ایک دن ملک الموت کے سامنے سپر ڈالنا ہی پڑا۔

دیکھنے والوں نے دیکھا کہ موت سے کچھ ہی دنوں پہلے 4 رجولائی 2012 کو وہ قومی اردو کونسل میں نظر آئے۔ وہ کسی کاغذ پر دستخط کر رہے تھے اور پھر لوگوں نے یہ بھی دیکھا کہ وہ دلی میں اسپتال کے بیڈ پر بے چارگی کی مورت بنے لیٹے ہیں۔ ایسے میں ہم ان کی ہمت کی داد نہ دیں تو اور

کیا دیں۔ وہ ہمارے بزرگ تھے اور ہم سے بڑی محبت سے پیش آتے۔ لیکن کبھی کبھی وہ ہم سے ناراض بھی نظر آتے۔ غلطی ہماری ہی ہوتی کہ ہم اپنی چھوٹی سی نوکری میں ایک ایسی جگہ بیٹھے ہیں جہاں ہر کوئی توقع لگائے بیٹھا ہے۔ کوئی کہتا ہے کہ مجھے دوسرے نمبر پر چھاپا۔ تو کسی کو شکایت ہے ہمیں فلاں صاحب کے بعد کیوں لگایا اور کسی کو شکایت ہے کہ میرا نمبر کب آئے گا؟ ہمارے بزرگ کچھ انہیں اسباب سے شاید مجھ سے ناراض رہتے تھے لیکن ان کی سب سے بڑی خوبی یہ تھی کہ وہ جلد ہی مان بھی جاتے تھے۔

بشری کمزوریاں کس کے اندر نہیں ہوتیں۔ آخر وہ بھی تو انسان ہی تھے۔ ترقی اور آگے نکل جانے کی ہوڑ میں انہوں نے بھی وہ سارے حربے اور ہتھکنڈے اپنائے جو عام طور پر ترقی کا خواہاں کوئی بھی انسان اپناتا ہے۔ خدا کے سوا کسی اور کے در پر حاضری لگانا کوئی بھی پسند نہیں کرتا لیکن ہوس اور لالچ جو نہ کرائے۔ وہاب صاحب کو اس عمل قبیح کی خباثت کا خوب خوب احساس تھا۔ چنانچہ اکثر دبی زبان میں اس کا اعتراف بھی کرتے اور اس اعتراف میں سامنے والے کے لیے ایک تنبیہ بھی ہوتی کہ للہ تم یہ سب نہ کرنا۔ ''قصہ بے سمت زندگی کا'' میں انہوں نے اپنی ان کمزوریوں کا اعتراف کیا اور یہی اس کتاب کی سب سے بڑی خوبی ہے۔ یہ وہاب صاحب کا ہی بوتا تھا جو توبہ کی صورت اس کتاب میں الفاظ کا جامہ پہنے اعلان کر رہا ہے:

دیکھو مجھے جو دیدۂ عبرت نگاہ ہو

علمی، ادبی اور دانشورانہ معاملات میں بھی وہ کسی سے پیچھے نہیں نظر آتے۔ وہ استاذ الاساتذہ تھے، وہ جس بات کو صحیح سمجھتے اس پر اڑ جاتے اور دلائل و شواہد کی بنیاد پر اپنی بات کی صداقت کو ثابت کرتے۔ ساتھ ہی یہ بھی حقیقت ہے کہ اگر کہیں ان کی غلطی ہوتی تو وہ اس کا بھی کھلے دل سے اعتراف کر لیتے۔ خواہ مخواہ کی باتوں میں نہ تو خود الجھتے اور نہ سامنے والے کو الجھانے کی کوشش کرتے۔ یہ ان کا بڑپن تھا۔ آجکل کے ستمبر 2011 کے شمارہ میں شاد عظیم آبادی پر وہاب اشرفی کا مضمون شائع ہوا۔ اس مضمون پر جہاں اس کی تعریف میں خطوط آئے وہیں ایک خط تنقیص میں بھی آیا۔ یہ سارے خطوط نومبر کے شمارے میں شائع ہوئے۔ الٰہ آباد کے ایک قاری کے خط کا لہجہ عاجلانہ، تلخ اور سخت تھا۔ لہٰذا اس خط کا جواب دینا وہاب صاحب نے ضروری سمجھا۔ وہاب صاحب

نے اس خط کا جواب لکھا جس سے واقعی عالمانہ شان ٹپکتی نظر آتی ہے۔ اس خط (آجکل دسمبر 2011) میں وہاب صاحب نے اپنی چوک کا نہ صرف کھلے دل سے اعتراف کیا بلکہ اس کے لیے معذرت بھی کی۔

بلاشبہ عالمانہ شان کی یہ تحریر ان کی چند قیمتی تحریروں میں سے ایک ہے جو ہم جیسوں کے لیے نہایت سبق آموز ہے۔ بہر حال ہم ان تینوں اساتذہ کو سلام کرتے ہیں۔

پیدا کہاں ہیں ایسے پراگندہ طبع لوگ

(ستمبر 2012)

"..... مگر کیا کیا جائے تمدن کی توقعات پوری نہیں ہوئیں اور وہ صرف اس وجہ سے کہ وہ حقوق نسواں کا مطالبہ کرتا ہے عزیز نہ ہوسکا۔ رفتار زمانہ متقاضی تھا کہ اب تمدن اس خیال کو دور کرے، وقت کا ساتھ دے اور اپنے کام سے کام رکھے۔ مگر ان معصوم بچیوں کی تصویر آنکھوں کے سامنے ہے..... طرہ یہ ہے کہ ایک مردانہ پرچہ حقوق نسواں کی آواز منہ سے نکالے تو اس کا گلہ گھونٹنے کو تیار ہو جائیں۔ 'شہید مغرب' کے نام سے جو مضمون لکھا گیا اس میں حقوق نسواں کے متعلق جو الفاظ اس قلم سے نکلے اور ان پر جو کچھ شورش ہو رہی ہے اس کو دیکھ کر خدائی شان یاد آتی ہے۔ جس مذہب نے علی الاعلان یہ حکم دیا کہ عورتیں مردوں کے ساتھ ویسا ہی سلوک کریں گے جیسا مردانے کے ساتھ۔ آج اس کے پیرو ایسے شخص کو جو صرف ان حقوق کا مطالبہ کرتا ہے جو شرع اسلام نے عطا کئے 'مار ڈالنے' کی دھمکی دیتے ہیں۔"

(رسالہ تمدن، دسمبر 1913)

آل احمد سرور کے سو سال

قارئین کرام! ایک بار پھر آل احمد سرور کو ان کی پیدائش کی صدی کے موقع پر انہیں یاد کرنے کا ایک اور بہانہ ہاتھ آ گیا۔ لیکن آجکل کی اس پیش کش کو ہم خراج عقیدت نہیں کہیں گے۔ خراج عقیدت تو ہم ان کی وفات (9رفروری 2002) پر پیش کر چکے ہیں۔ جب ہم نے آجکل کا ایک شمارہ ان کے نام مخصوص کیا تھا۔ جون 2002 کے اس شمارہ میں ہم نے ان کی شخصیت اور کارناموں کا بھرپور جائزہ لیا تھا۔ مقالات میں آل احمد سرور کی وراثت، سرور صاحب کا طرز نقد، معاصر تنقید اور آل احمد سرور، سرور کی تنقید اور نثری زبان، آل احمد سرور کے اداریے، سرور اور تنقید کلام غالب، سرور کی تنقیدی بصیرت، اور تنقید اقبال کے عنوانات سے ایک بھرپور شمارہ پیش کرنے کی کوشش کی تھی اور قارئین نے بھی ہماری اس کوشش کو بہ نظر تحسین دیکھا تھا۔

آل احمد سرور ہشت پہلو شخصیت کے مالک تھے۔ اردو ادب کی تقریباً سبھی اصناف پر انہوں نے طبع آزمائی کی ہے اور تقریباً سبھی اصناف میں انہوں نے اپنا نقش چھوڑا ہے، اپنی ایک جگہ بنائی ہے۔ خواہ وہ تنقید ہو کہ تخلیق، نثر ہو کہ شاعری، مقالے ہوں کہ اداریے، لیکن ان کا ناقدان پر کچھ اس قدر حاوی اور غالب ہو گیا کہ دوسری حیثیتیں پس پشت پڑ گئیں۔ دوسری چیزوں پر نظر بھی جاتی ہے تو طائرانہ اور اگر کوئی قصداً نظر بھی ڈالتا ہے تو اچٹتی سی۔ مبادا ان کی ناقدانہ حیثیت مجروح نہ ہو۔

آج کم و بیش دس سال کے وقفے کے بعد انہیں یاد کرنے کا ایک بہانہ اور ہاتھ آ گیا۔ 2011-12 میں اردو کے نامور اور اہم شاعر و ادیب کو خراج عقیدت پیش کرنے کا سلسلہ شروع ہوا اور ہم نے کئی اعلیٰ پائے کے ادیبوں کو یاد کیا۔ ہم فیض احمد فیض، سہیل عظیم آبادی، اسرار الحق مجاز، سعادت حسن منٹو اور احتشام حسین کی صدی پر ان کے شایان شان آج کل کے شماروں کو مخصوص کر چکے ہیں۔ عام طور پر ہماری اس کوشش کو سراہا گیا، جس سے ہماری کافی حوصلہ افزائی

ہوئی۔ہم نے ترجیحی طور پر اس کام کو انجام دیا ہے۔

آل احمد سرور کی شخصیت کچھ ایسی مرنجان مرنج قسم کی تھی کہ ہر چھوٹے بڑے نے انہیں پیار کیا۔اوران کے کارناموں سے استفادہ کرنے کا جو سلسلہ ان کی حیات میں شروع ہوا تھا وہ ہنوز جاری ہے۔آج بھی یونیورسٹی کے اساتذہ اور طلبہ ان سے استفادہ کرتے نظر آتے ہیں۔

آل احمد سرور نے جب اس دنیا میں آنکھیں کھولیں تو اس وقت ادب میں رومانوی طرز اظہار کا دور دورہ تھا۔چنانچہ ان کی تحریروں میں رومانوی اثرات در آئے۔خلاقانہ تحریر کے وہ شروع سے ہی رسیا رہے ہیں اوران کی تخلیقی نثر اپنے معاصرین میں انہیں سب سے الگ اور نمایاں مقام عطا کرتی ہے۔ جب وہ سن شعور کو پہنچے تو اس وقت ترقی پسند تحریک کا زور وشور تھا اور ایسے میں بھلا آل احمد سرور جیسا فعال اور متحرک شخص کیوں کر دور رہ سکتا تھا۔چنانچہ وہ بھی ترقی پسند تحریک میں شامل ہو گئے، لیکن ایک ذرا فاصلہ ہمیشہ بنائے رکھا۔آل احمد سرور پورے طور پر کسی تحریک یا رجحان کے نہیں ہو سکے اور جب اور جہاں کوئی نئی چیز نظر آئی وہ اس طرف کو متوجہ ہوتے رہے۔کچھ اس طرح کہ نمایاں بھی رہے اور دوروں نزدیک کا بھرم بھی بنائے رکھا۔1960 میں جب جدیدیت کا شور وغل شروع ہوا تو وہ اس کی طرف بھی متوجہ ہوئے بلکہ جدیدیت کے بانی مبانی کے طور پر سامنے آئے اور جدیدیت کے تعلق سے اس رجحان کو فروغ دینے میں کافی محنت اور جدوجہد کی۔اور پھر ایک وقت ایسا بھی آیا جب وہ کسی تحریک اور رجحان سے بیزار سے نظر آنے لگے۔لیکن پڑھنے لکھنے کی رفتار میں انہوں نے کوئی جمود یا ٹھہراؤ نہیں آنے دیا۔انہوں نے ہر دور میں اور ہر حال میں پڑھنا لکھنا جاری رکھا۔نئے افکار اور خیالات کو اپنی تحریر وتقریر میں پوری جگہ دی اور نئی فضا میں سانس لیتے رہے۔یہی وجہ ہے کہ وہ اپنے معاصرین میں بہت نمایاں نظر آتے رہے۔ان کی کتابیں سیکڑوں طلبہ کو مستفید کر رہی ہیں اور وہ اپنے لازوال کارناموں کے باعث ہمارے بیچ موجود رہیں گے۔

آل احمد سرور نے نہ تو پارٹی بند ہونے کو پسند کیا اور نہ ہی ادبی نراج کو۔جس نظریہ میں کشش محسوس کی اس کی طرف رجوع ہوئے، اس کی اچھائیوں کو اپنانے کی کوشش کی اور اس کے لیے سنجیدگی، متانت اور غور وفکر کو ضروری سمجھا۔

آل احمد سرور ادب کو زندگی کا ترجمان بلکہ تنقید حیات سمجھتے ہیں۔وہ ادب برائے ادب کے سخت مخالفین میں سے رہے۔یہاں وہ خالص مارکسی نظریہ کے حامل نظر آتے ہیں۔

آل احمد سرور خالص ادب کو صرف 'پروپیگنڈہ والے ادب' کے مقابلے میں ایک اصطلاح مانتے ہیں لیکن یہاں قابل غور امر یہ ہے کہ پروپیگنڈہ والے ادب کی اصطلاح خود ایک قابل اعتراض اور انتہا پسندانہ اصطلاح ہے۔ دراصل یہ دونوں اصطلاحیں ادب کی دو متضاد انتہاؤں کی نشاندہی کرتی ہیں۔ آل احمد سروران دو انتہاؤں کے بیچ ایسی سوچ کو پسند کرتے ہیں جس میں سماجی رشتوں، انسانی تاریخ، نفسیات اور تہذیبی کارناموں کا پرتو ہو۔

جب آل احمد سرور جدیدیت میں شامل ہوئے تو اس نظریہ کو کافی تقویت ملی۔ انہوں نے جدیدیت اور ادب کے موضوع پر علی گڑھ یونیورسٹی کے شعبہ اردو میں باضابطہ ایک سہ روزہ سمینار بھی کروایا جس میں انہوں نے بھی ادب میں جدیدیت کا مفہوم کے موضوع پر ایک بسیط مقالہ پیش کیا تھا۔ اس مقالہ میں جہاں انہوں نے مغرب میں جدیدیت کی روایت کا جائزہ لیا، وہیں اردو ادب میں جدیدیت کے رول پر بڑی بے باکی سے روشنی ڈالی تھی۔

جدیدیت کی حمایت کے باوجود آل احمد سرور جس طرح مارکسی نہ ہو سکے اسی طرح مکمل جدیدیے بھی نہ ہو سکے۔ چنانچہ وہ ایک طرف مارکسی نقادوں کی طرح سماجی اہمیت اور خارجیت پر زور دیتے ہیں تو دوسری طرف داخلیت اور انفرادیت کو بھی اتنی ہی اہمیت دیتے ہیں۔

آل احمد سرور کے اس انداز فکر کو 'توازن' جیسے خوبصورت لفظ سے متصف کریں تو بیجا نہ ہوگا اور یہ بھی کہ آل احمد سرور پر کوئی لیبل چسپاں کرنا آسان نہیں۔ وہ رومانیت، ترقی پسندی اور جدیدیت کا حسین امتزاج نظر آتے ہیں۔

آل احمد سرور کے چاہنے والوں کا حلقہ بہت وسیع ہے لیکن ان سب کی آرا اور مضامین کو آجکل کے 50 صفحات میں بھی شامل کرنا بہت مشکل نظر آتا ہے۔ یہ ہمارے لیے ممکن نہ تھا کہ ان ساری چیزوں کو شامل اشاعت کر پاتے۔ ایک تو یہ کہ موصول ہونے والے مضامین میں اکثر خس وخاشاک کا درجہ رکھتے تھے اور دوئم یہ کہ رسالہ 'آجکل' کی ضخامت اس کی اجازت نہیں دیتی۔ بہر حال جو کچھ اور جیسا کچھ ہے آپ کی خدمت میں پیش ہے۔ ہم نے پیش نظر شمارہ کو حتی الامکان کارآمد بنانے کی سعی کی ہے۔ اگر آپ کو پسند آئے تو اسے اپنے دوست احباب اور متعلقین کے سامنے بھی پیش کریں اور اگر ہماری کوئی کمی اور کوتاہی نظر آئے تو اس سے بھی ہمیں مطلع کریں۔

(اکتوبر 2012)

افسانہ نگار سے خاتون خانہ تک

لیجئے قارئین! 15 ستمبر 2012 کو ہاجرہ مسرور نے بھی داعی اجل کو لبیک کہا۔ ویسے بھی وہ زندہ کب تھی۔ وہ پچھلے چالیس سال سے زندہ لاش کی مانند زندگی گزار رہی تھی۔ شاید کہ تقسیم ملک کا صدمہ انہیں راس نہ آیا، یا شاید ان کی شادی انہیں راس نہیں آئی۔ زندگی کا جبر شادی کے بعد خاتون خانہ بن جانے کا مطالبہ یا دباؤ انہیں تنہائی کا شکار بنا دینے کے سبب وہ الگ تھلگ ہو کر رہ گئی تھیں۔ یہ وہی ہاجرہ ہیں جنہوں نے بچپن سے ہی لکھنا شروع کر دیا تھا اور جو اپنی تخلیقات سے ایک عرصہ تک اردو کے ذخیرہ کو مالا مال کرتی رہیں، گندی سیاست و معاشرت پر تنقید کرنے اور عورتوں کے حقوق کے لیے جدوجہد کرتی رہیں۔

ہاجرہ کا بچپن اور عہد شورش زدہ رہا ہے۔ یہ اس وقت کی بات ہے جب محبان وطن اپنے ملک ہندوستان جنت نشان کی آزادی کے لیے اپنا تن من دھن سب کچھ نچھاور کر رہے تھے اور انہیں اپنے ملک کی آزادی صاف طور پر دکھائی دے رہی تھی۔ محبان وطن میں جو لوگ آلات حرب وضرب کے ماہرین میں سے تھے وہ انہیں آلات سے اپنے جذبات اور طاقت کا مظاہرہ کر رہے تھے۔ بلاشبہ ایسے حالات میں وہ کٹ بھی رہے تھے اور مر بھی رہے تھے لیکن وہ ہار ماننے کو قطعی تیار نہ تھے۔

بلاشبہ یہ مجاہدین اپنی جانوں کو ہتھیلیوں پر لیے ایک ایسی جنگ میں شامل تھے جس کے لیے وہ ہرگز ذمہ دار نہ تھے۔ ایک طرح سے یہ جنگ ظالم اور غاصب فرنگیوں کے ذریعے ہم دیش واسیوں کے سروں پر تھوپ دی گئی تھی۔ لہٰذا ایسے میں ہم اس جنگ سے راہ فرار بھی اختیار نہیں کر سکتے تھے اور امن وسکون اور شانتی کے چاہنے والے انفرادی اور اجتماعی طور سے فرنگی راج کے خلاف نبرد آزما ہے۔ ایسے حالات میں ہم میں سے جو لوگ شمشیر وسناں اٹھانے کے مخالف بہ الفاظ دیگر خون

خرابہ کے حق میں نہ تھے، ایسے لوگ جن کو خدائے ذوالجلال نے شمشیر کے بجائے قلم کی طاقت سے نوازا تھا۔انہوں نے اپنے قلم کی طاقت کا پورے زور وشور سے مظاہرہ کیا۔ایسے قلم کاروں میں اردو کے ادیب وشاعر نمایاں طور پر پیش پیش نظر آتے ہیں۔ 1936 میں ترقی پسند ادبی تحریک کا قیام عمل میں آیا، جس کے تحت ادیبوں اور شاعروں کو ایسے حالات میں اپنی ذمہ داری نبھانے کی تلقین کی گئی۔غلامی کی تاریکی سے آزادی کا اُجالا حاصل کرنے پر زور دیا گیا۔یہ وہ منظرنامہ ہے جس میں بیشتر قلم کار اپنی انقلابی تخلیقات کے ہتھیاروں سے ماحول کو بنانے اور دیش باسیوں کے لہو کو گرمانے کا کام انجام دے رہے تھے۔

کہتے ہیں کہ پوت کے پاؤں پالنے میں ہی نظر آنے لگتے ہیں۔ان مجاہدین آزادی کی صف میں دور اور ذرا پیچھے ایک چھوٹی بچی بھی نظر آتی ہے جس کا نام ہاجرہ مسرور ہے اور وہ قلم کی طاقت سے لیس ہے۔اس کی عمر کھیلنے اور کھانے کی ہے، ہنڈکلیا پکانے کی ہے، گڈے گڑیوں کی شادی رچانے کی ہے لیکن وہ یہ سب کچھ نہیں کرتی ہے بلکہ وہ بھی اپنے ادب پاروں سے ایک ماحول تیار کرتی ہے۔ہاجرہ مسرور کی عمر اس وقت جب ترقی پسند تحریک کا قیام عمل میں آیا محض چھ سال تھی اور جب ہندوستان کو آزادی ملی وہ محض 17 سال کی تھیں۔اپنی جگہ یہ امر مسلم ہے کہ ہاجرہ مسرور نے جنگ آزادی کے موضوع پر براہ راست نہیں لکھا۔ان کی کچی عمر شاید اس بات کی اجازت نہیں دیتی تھی یا وہ اس موضوع کو برتنے کا حوصلہ نہیں کرپاتی تھیں لہٰذا وہ براہ راست انگریزوں کو للکارتی ہوئی نظر نہیں آتیں ۔ چنانچہ ان کی کہانیوں کے موضوعات سماج وسیاست، قانون ومعیشت وغیرہ کی ناہمواریوں اور عورتوں کے استحصال وغیرہ تک محدود رہے اور انہی موضوعات سے انہوں نے اپنے قلم کو رواں دواں رکھا۔خاص طور پر عورتوں کے حقوق کے لیے اپنے قلم کو وقف کر رکھا تھا۔ بلاشبہ وہ ادب میں تانیثیت کی علمبردار رہی ہیں۔رشید جہاں، عصمت چغتائی اور قرۃ العین حیدر بلاشبہ ہاجرہ مسرور کی آئیڈیل رہی ہیں۔

ہاجرہ مسرور 17 رجنوری (1929 اور بعض روایت کے مطابق 1930) کو لکھنؤ میں پیدا ہوئیں۔ہاجرہ کی پانچ بہنیں اور ایک چھوٹا بھائی تھا۔بہنوں میں سب سے تیز طرار اور فعال خدیجہ مستور تھیں جو اپنے ایک ناول 'آنگن' کے سبب بہت مشہور ہوئیں۔والد کے انتقال کے بعد کنبے

کوان کی باہمت ماں نے بڑے حوصلے کے ساتھ پرورش کی۔ جیسا کہ ابھی ہم نے ذکر کیا کہ ہاجرہ مسرور نے اپنے بچپن سے ہی لکھنا شروع کر دیا تھا۔ محض 13 سال کی عمر میں اکتوبر 1943 میں ان کی کہانی 'آج عید ہے' پندرہ روزہ 'آجکل' میں شائع ہوئی جسے عام طور پر سراہا گیا۔ یہی نہیں ہاجرہ کو لاہور سے چھپنے والے اپنے پہلے مجموعہ 'چرکے' پر 40/روپے بطور رائلٹی ملی اور اس کے فوراً بعد ان کے مجموعہ ہائے 'اللہ' پر انہیں 600/روپے کی ایک کثیر رقم ملی۔ تقسیم ملک کے بعد وہ اور ان کی بہنیں پاکستان ہجرت کر گئیں اور لاہور میں قیام کیا۔ جہاں انہوں نے احمد ندیم قاسمی کے ساتھ نقوش کی ادارت بھی کی۔ دروغ برگردن راوی، ہاجرہ کی منگنی ساحرلدھیانوی سے ہوئی تھی، لیکن شادی کے نام سے خوف کھانے والے اور مختلف وقتوں میں مختلف عورتوں سے صرف عشق لڑانے والے ساحر لدھیانوی کیوں کر کسی کے بس میں یا گرفت میں رہ سکتے تھے۔ انہوں نے شادی سے صاف انکار کر دیا۔ کچھ عرصہ بعد ہاجرہ نے 'ڈان' کے ایڈیٹر احمد علی خاں سے شادی کر لی اور حقیقی معنوں میں خاتون خانہ بن گئیں۔ شادی کے بعد کہانی لکھنا تقریباً موقوف ہو کر رہ گیا۔ لیکن کیوں؟ یہ ایک معمہ ہے سمجھنے کا نہ سمجھانے کا۔ البتہ دو بیٹیوں کے روپ میں دو زندہ تخلیقات نوید احمد طاہر اور نوشین احمد کی تخلیق کار بننے کا شرف حاصل ہوا۔

حالانکہ ہاجرہ مسرور نے بہت چھوٹی عمر سے کہانیاں لکھنا اور چھپنا شروع کر دیا تھا۔ اردو حلقوں میں ان کی پذیرائی بھی ہونے لگی۔ ہاجرہ کی اولین کہانیاں پندرہ روزہ 'آجکل' میں چھپنا شروع ہوئیں جس سے انہیں نہ صرف حوصلہ ملا بلکہ انہیں از حد شہرت بھی حاصل ہوئی۔ اس وقت سے (تقسیم وطن 1947 تک) شائع ہونے والی کہانیوں میں 'فروزاں'، 'میرا بھیا'، 'نیلم'، 'آج عید ہے' اور 'شعلوں کے آغوش میں' شامل ہیں۔ بیشک یہ کہانیاں ہاجرہ کی اولین کہانیاں ہیں اور اس میں فکروفن کی وہ گہرائی اور گیرائی نظر نہیں آتیں۔ اس کے باوجود یہ کہانیاں قاری کے ذہن ودماغ پر اپنا اثر چھوڑنے میں کامیاب ہیں۔ ہاجرہ مسرور کی تحریریں معاشرے کی منافقتوں، دورخے پن اور دوہرے معیار کی کھل کر عکاسی کرتی نظر آتی ہیں۔ بیشک ان کی کہانیاں عصری حسیت سے ہم آہنگ رہیں اور وہ عصری مسائل کو کھلے لفظوں میں اٹھاتی تھیں لیکن اس کا خیال رکھا کہ فن مجروح نہ ہو۔ انہیں بھی رشید جہاں، منٹو اور عصمت چغتائی کی طرح سماج کے قدامت پسند اور روایت

پرست حلقوں کی طرف سے بدترین لعن طعن کا نشانہ بنایا جاتا رہا۔

ہم 'آجکل' کے پیش نظر شمارہ میں ہاجرہ مسرور کی تین کہانیاں 'فروزاں'، 'میرا بھیا' اور آج عید ہے، شائع کر رہے ہیں جو آجکل کی بوسیدہ فائل کے علاوہ کہیں اور یا ان کے کسی مجموعہ میں دستیاب نہیں ہیں حتیٰ کہ ان کی کلیات میں بھی نہیں۔ ہاجرہ مسرور کے شائقین کے لیے یہ ایک تحفہ ہے جسے ہم فخریہ آپ کی نذر کر رہے ہیں۔ شاید کہ یہ ہاجرہ مسرور کے تئیں ہماری سچی شردھانجلی ہو۔

(نومبر 2012)

''جس طرح کسی سے ملنے جایئے تو صاحب خانہ کا حال جو آدمی کے ڈیوڑھی پر بیٹھا ہو پہلے اس سے پوچھ لیتے ہیں کیا میاں کیا کر رہے ہیں؟ اور شاعرانہ تخیل میں شوخی نقش پا سے رفتار یار کا پتہ لگ جاتا ہے۔ اسی طرح دیباچہ سے اندر کے مضامین کا حال معلوم ہو جانا چاہیے۔ جس طرح چشم تر سے دل کی رقت معلوم ہو جاتی ہے اور بعض آدمی خط کھولنے سے پہلے لفافہ کو ٹٹول کر دیکھ لیتے ہیں کہ اندر کیا ہے؟ اور چاہنے والے خط شوق کا مضمون خط پڑھنے سے پہلے سمجھ جاتے ہیں اسی طرح آپ دیباچہ سے مضامین کا حال قیاس کر لیں.....''

(صلائے عام، اپریل 1915)

''جس طرح تعبیر سے پہلے خواب کا بیان کرنا ضروری ہوتا ہے اسی طرح 'صلائے عام' کے ہر پرچہ کے مضامین کا ذکر پہلے ہی بیان کر دینے کا دستور ہو گیا ہے۔ اس صورت میں صلائے عام کا پہلا مضمون پیرایۂ آغاز سمجھا جاتا ہے۔ یعنی جس طرح مسجد میں نماز سے پہلے اذان اور دیر و کنشت میں صدائے ناقوس اسی طرح پیرایۂ آغاز ہے.....''

(صلائے عام، جنوری 1926ء)

لمحوں کی خطا، صدیوں کی سزا

اردو کی اہمیت مسلم ہے۔ مخالفین لاکھ برا چاہیں، اسے ختم کرنے کی سازشیں رچیں، اس کو ختم کرنا مشکل ہی نہیں ناممکن ہے۔ اردو ہر دور میں فعال اور متحرک رہی ہے۔ اس نے نہ صرف جنگ آزادی میں اپنی اہمیت کو ثابت کیا ہے بلکہ آزادی کے بہت پہلے سے ہی اس نے میدان ہموار کیا ہے۔ ادبی سطح پر بھی اس نے اپنی ذمہ داری ادا کی ہے نیز تاریخی، سیاسی اور سماجی سطح پر بھی ذہنوں کی تربیت کا فریضہ انجام دیا ہے۔

اردو کے یہ سارے کارنامے کتابوں میں محفوظ ہو چکے ہیں۔ لیکن اب بھی بہت سے کارناموں کو سمیٹنا اور ان کا تجزیہ کرنا باقی ہے۔ ہم اگر پورے ملک میں پھیلے میوزیم اور آرکائیوز کا جائزہ لیں تو ہمیں ایسی سیکڑوں دستاویزات اور قلمی نسخے دستیاب ہوں گے جنہیں ہم آنکھوں کا سرمہ بنانے میں فخر محسوس کر سکتے ہیں۔ میرے ایک بزرگ دوست جلال الدین صاحب اکثر ملاقاتوں میں ادھر ادھر کی فضول گفتگو نہ کرتے ہوئے اس اہم موضوع پر گھنٹوں گفتگو کرتے ہیں اور ہمیں ایسا محسوس ہوتا ہے گویا وہ قیمتی سرمایہ ہمارے سپرد کر رہے ہیں۔ جلال الدین صاحب الٰہ آباد آرکائیوز سے 1993 میں سبکدوش ہو چکے ہیں لیکن ان کا شوق اور احساس زیاں انہیں اس موضوع پر سوچتے رہنے پر مجبور کرتا رہتا ہے۔ ایک ایسی ہی ملاقات میں انہوں نے ہمیں بتایا۔ ہمارے ہندوستان جنت نشان کی بیش بہا تاریخ زیادہ تر فارسی اور اردو میں محفوظ ہے۔ انگریزوں کی باقاعدہ حکمرانی سے قبل کی دستاویزات مختلف ریاستوں کے محفوظ ریکارڈس ہماری بیش بہا تاریخ کا سرمایہ ہیں۔

یوپی آرکائیوز میں مختلف انواع کے ریکارڈس موجود ہیں مثلاً کلکٹریٹ کے ریکارڈس، بورڈ آف ریونیو سکریٹریٹ کے ریکارڈس وغیرہ وغیرہ۔ ساتھ ہی رام پور اسٹیٹ کی تقریباً تین چار لاکھ فائلیں اور رجسٹر

بھی موجود ہیں جو رامپور اسٹیٹ کے وجود یعنی 1774 سے 1949 تک کے ریکارڈس پر مشتمل ہیں جو سب کی سب فارسی اور اردو زبان میں ہیں۔ فرامین و دستاویزات اور دیگر مخطوطات کا بھی خاصا ذخیرہ موجود ہے۔

نہ جانے کتنا بیش بہا تاریخی سرمایہ مختلف مقامات پر موجود ہے جو سب کا سب مجاہدین آزادی سے متعلق ہے چونکہ یہ اردو زبان میں ہیں لہٰذا ان کو آرکائیوز میں منتقل کرنے کی سعی نہیں کی گئی۔ الٰہ آباد آرکائیوز میں جب یہاں پر موجود اسٹاف آنجہانی گریش چند جوشی اور مسز خان نے الٰہ آباد کلکٹریٹ جا کر قدرے کوشش کی تو صرف ایک تھانے کے مشہور لیڈران کی چند سالوں کی 110/فائلیں منتقل ہوئیں جو مولانا آزاد، جواہر لال نہرو، بشمبھر ناتھ پانڈے، مظفر حسن، وجے لکشمی پنڈت اور دیگر حضرات کی اہم فائلوں پر مشتمل ہے اور یہ سب کی سب اردو زبان میں ہیں۔

ہمارے مجاہدین آزادی کے ریکارڈس آج بھی مختلف ریکارڈ روم میں بند ہیں۔ چونکہ ریکارڈس روم انچارج اردو داں نہیں ہیں لہٰذا وہ معذور ہیں اور ریکارڈس کسمپرسی کے عالم میں ہیں۔ ان ریکارڈس کو آرکائیوز میں نہیں لایا جارہا ہے کہ اس زبان کے ماہرین وہاں موجود نہیں ہیں۔ کیا ان مجاہدین آزادی کے کارناموں کو اجاگر کرنا ہمارا قومی فریضہ نہیں ہے؟

بقول جلال الدین صاحب الٰہ آباد میوزیم میں مظفر حسن مرحوم سابق منسٹر ٹرانسپورٹ یوپی نے تقریباً 500/دستاویزات اور فرامین نیشنل آرکائیوز سے Lamination کرا کے بطور عطیہ عنایت فرمائے تھے۔ اس میں بیرم خان کا واحد حکم نامہ موجود ہے جس میں الٰہ آباد کو قصبہ پیاگ لکھا گیا ہے۔ یہ اکبر کے ابتدائی عہد کا حکم نامہ ہے جس کے سرنامہ پر بہ فرمان جلال الدین محمد اکبر حکم خان خاناں محمد بیرم بہادر درج ہے اور مہر پر درج ہے غلامانِ شہ اہل کرم محمد بیرم بہادر یہ انتہائی اہم حکم نامہ ہے اسی طرح متعدد شاہی فرمان واجد علی شاہ کا خط مٹیا برج سے اور دیگر اودھ کے بادشاہوں کے فرمان موجود ہیں وہ سب ایک کمرے میں آویزاں تھے۔

یہ سارے فرامین دستاویزات و مخطوطات ایک ہزار سے زیادہ ہیں مگر سورج کی روشنی کو ترستے ہیں۔ لکھنؤ میوزیم میں 39 فرمان مغل بادشاہوں کے موجود تھے جن کو جلال الدین صاحب نے 1969 میں دیکھا تھا اس کی سرسری فہرست ان کے پاس ہے بھی۔ جس میں ہمایوں، اکبر، شہزادہ سلیم، جہانگیر، شاہ جہاں، اورنگ زیب، شاہان اودھ شاہ عالم وغیرہ کے فرامین ریکارڈس روم کے

اندھیرے کمرے میں بند ہیں وہاں بھی کوئی اسٹاف نہیں ہے جو ان کی قدر و قیمت بتا سکے۔

بھارت کلا بھون میں مغل بادشاہوں کے ذاتی استعمال کی اشیا بیش بہا فرامین و مخطوطات کا ذخیرہ موجود ہے۔ مغلوں کے ذاتی استعمال اور ان کے کندہ نام کی اشیا کا ذخیرہ ہندوستان کے کسی بھی میوزیم میں موجود نہیں۔ یہ سب آنجہانی رائے کرشن داس کی ذاتی کاوشوں کا نتیجہ ہے بالخصوص اورنگ زیب کا مشہور فرمان جو گورنر ابوالحسن کے نام جاری کیا گیا ہے اور شائع شدہ ہے۔

غالباً 75-1974 کی بات ہے کہ مرحوم صفی الرحمٰن خدا بخش لائبریری کے ڈائریکٹر تھے ان کے زمانے میں فرامین کا ایک ذخیرہ منتھی کیا ہوا ایک بڑے رجسٹر کی شکل میں دیکھا گیا تھا۔ شہزادہ سلیم کی بغاوت کے زمانے کا بھی فرمان تھا۔ ان تمام فرامین کو تین بکسوں میں محفوظ رکھ دیا گیا ہے اور ابھی تک کوئی فہرست نہیں بنی ہے۔

سارا راجستھان اور بہادر راجپوت جو مغلوں کے شریک کار حکومت تھے۔ (مغل عہد حکومت کو مغل راجپوت عہد کہنا زیادہ مناسب ہے)۔ وہاں پر فارسی دستاویزات کا بیش بہا ذخیرہ موجود ہے۔ جے پور میوزیم، سٹی پیلس میوزیم، جودھپور میوزیم، بیکانیر آرکائیوز و دیگر اداروں میں ریکارڈس بھرے پڑے ہیں ان کی دیکھ ریکھ کرنے والا کوئی نہیں ہے۔ آخر میں ایک اہم فرمان کا تذکرہ خالی از دلچسپی نہیں ہے جو شہنشاہ اورنگ زیب نے پہلے سال جلوس میں شیواجی کو راجہ کے خطاب سے نوازا تھا۔ صوبہ داری صوبہ جات دکن عنایت کیا تھا۔ اس فرمان کا عکس در عکس جس کی عبارت دھندلی ہے مگر اصل نفس مضمون واضح ہے۔ بڑا ہی مفصل فرمان ہے، کاش اصل حاصل ہو جائے۔

دکن میں حیدرآباد، سکندرآباد کے ایک درجن سے زائد اداروں میں دستاویزات و مخطوطات لاکھوں پر مشتمل ذخیرہ موجود ہے۔ آصفیہ لائبریری، سالار جنگ میوزیم، اسٹیٹ آرکائیوز وغیرہ میں بے شمار دستاویزات موجود ہیں۔ مگر ان کی نگرانی کرنے والا کوئی بھی نہیں ہے۔ حیدرآباد کے علاوہ مدراس میں متعدد ادارے ہیں۔ قاضی بدرالدولہ کی لائبریری میں اورنگ زیب کا عالیشان فرمان مطلّا و مذہّب اور شاہکار خطاطی کا نمونہ ہے۔ ہمارے عظیم ملک میں ایک سو سے زائد سرکاری ادارے موجود ہیں جن میں دستاویزات و مخطوطات کا بیش بہا خزانہ موجود ہے مگر بیشتر کی فہرست تک موجود نہیں ہے۔

اس بیش قیمتی سرمایہ کو محفوظ کرنا اور اس کا مطالعہ و تجزیہ کر کے کسی نتیجہ پر پہنچنا ہمارا قومی فریضہ

ہے۔اس سرمایہ کے مطالعہ وتجزیہ سے عین ممکن ہے کہ تاریخ کے بعض پوشیدہ پہلو سامنے آئیں۔اس ضمن میں یونیورسٹیوں کے شعبہ اردو، شعبہ فارسی اور شعبہ تاریخ کے اساتذہ اور ریسرچ اسکالر کو خاص دھیان دینے کی ضرورت ہے۔اس سمت میں دلچسپی رکھنے والے ریسرچ اسکالر اگر چاہیں تو اس کو اپنی پی ایچ ڈی کا موضوع بنا کر اس پر بہت کارآمد کام کرسکتے ہیں اور گھسے پٹے فرسودہ موضوعات سے بچ سکتے ہیں۔کہیں ایسا نہ ہو کہ ہماری لاپروائی کے سبب ہمارا یہ عظیم سرمایہ ضائع ہوجائے اور ہم ہاتھ ملتے رہ جائیں:

یہ جبر بھی دیکھا ہے تاریخ کی نظروں نے
لمحوں نے خطا کی تھی صدیوں نے سزا پائی

(دسمبر 2012)

"....آپ کی زبان کی ترقی بغیر دونوں صاحبوں (ہندو مسلمان) کے ممکن نہیں۔ بلکہ زیادہ تر اہل ہنود کی توجہ کی ضرورت ہے۔ مسلمانوں کو اردو سے ہندوستان میں آنے کی وجہ سے بعد میں کام پڑا ورنہ اردو مسلمانوں کی زبان نہ تھی۔اس وقت اردو میں نظم سے زیادہ نثر کی ضرورت ہے۔نظم میں ترقی کی بہت گنجائش نہیں برخلاف اس کے نثر میں جس قدر لکھا جائے تھوڑا ہے....."

(میر ناصر علی، صلائے عام، اگست 1924)

"یوں تو صلائے عام اردو کے رسالوں اور اخباروں کے برابر ہے مگر اس میں ایک دو خاص باتیں بھی ہیں۔ اول تو سوداگری اور بازاری اشتہاروں سے اس کا تعلق نہیں۔ دوسرے کچہریوں اور دفتروں کے نوٹس اور سمن وغیرہ اس میں نہیں ہوتے یہی دونوں ذریعے اخبار اور رسالوں کی آمدنی کے لئے بہت کارگر سمجھے جاتے ہیں۔ تیسرے ایک خاص خوبی یہ ہے کہ بغیر کسی کی شراکت امداد کے یہ عرصہ سے جاری ہے.....جب یہ سارے ذرائع آمدنی کے صلائے عام پر بند ہیں تو اس کا نکالنا معمولی زیر باری سے زیادہ زیر باری کا باعث کیوں نہ ہو....."

(صلائے عام، اپریل 1925)

موت ایک مفکر کی

کوئی تین سال ہونے کو آئے، وہ ہم سب سے الگ تھلگ ہو کر رہ گئے تھے۔ گوشہ نشیں تو وہ پہلے ہی سے تھے۔ اسی لیے لوگوں کو ان کی کمی شاید ہی کھلتی تھی۔ لیکن یہ گوشہ نشینی جب ذرا لمبی ہو جاتی تو دوستوں کو ان کی تلاش ہوتی۔ مگر اس تلاش میں بہت تیزی یا سرگرمی کبھی نہیں ہوتی تھی۔ ادھر ادھر سے خبر مل جاتی کہ اسر صاحب خیریت سے ہیں اور اپنے وسیع مکان کے ایک چھوٹے سے کمرے میں مقید ہو کر کچھ خاص چیز لکھ رہے ہیں۔ اور جب یہ خاص چیز مکمل ہو جاتی تو وہ اپنے کمرے سے نکلتے اور سیدھے بس پکڑ کر دفتر 'آجکل' کے لیے روانہ ہو جاتے۔ ایڈیٹر **آجکل** نے کبھی ان کی کوئی چیز رد نہیں کی کہ وہ اپنے موضوع کے اعتبار سے خاص ہی ہوتی اور اکثر و بیشتر نئے موضوع پر ہوتی، جس تک ہم سہل پسندوں کی پہنچ نہیں ہوتی یا ہماری تساہلی ان موضوعات تک ہماری رسائی نہیں ہونے دیتی۔

اس بار دیوندر اسر کی خود نافذ کردہ نظر بندی ذرا لمبی ہو گئی تھی اور کبھی کبھی ہمیں تشویش بھی ہوتی، لیکن جلد ہی ہم انہیں بے جا مصروفیات کے سبب اس تشویش کو بھلا دیتے۔ پچھلے سال جب ہم نے آجکل میں 'غبار کارواں' کا سلسلہ ایک بار پھر شروع کیا تو ہمیں دیوندر اسر کی یاد آئی۔ ہم نے فون بھی کیا کہ اب تو اپنی مختصر سوانح 'غبار کارواں' عنوان کے تحت لکھ ڈالیں کہ زندگی کا بھروسہ نہیں۔ اسر صاحب نے ہم سے وعدہ کر لیا لیکن ان کی بیماری نے انہیں مہلت ہی نہیں دی۔ ہم نے ان کے سب سے قریبی دوست نند کشور وکرم سے بھی گزارش کی کہ وہ ان سے 'غبار کارواں' لکھوائیں لیکن وہ بھی ناکام ہی رہے اور دیوندر اسر کی بیماری نے آخرش انہیں موت کے حوالے کر دیا۔

موت کا ایک دن معین ہے۔ ہر ذی نفس کو ایک دن موت کا مزہ چکھنا ہے، لیکن ایسی گمنامی،

تنہائی اور بے بسی کے عالم میں وہ موت کا مزہ چکھیں گے یہ ہمارے وہم وگمان میں نہ تھا۔ ہمیں 21 رنومبر کو اردو اخبار کے ذریعہ وکرم صاحب کے حوالے سے خبر ملی کہ معروف فکشن نگار اور ترقی پسند نقاد دیوندر اسر کا پچھلے 6 رنومبر کو انتقال ہوگیا۔ بس اتنا ہی پڑھنا ہمارے لیے کافی تھا۔ ہماری آنکھوں کے سامنے دیوندر اسر کی شخصیت ان کے تمام تر کارناموں اور لوازمات کے ساتھ کسی فلم کی مانند گھومنے لگی۔ ہمیں سب سے زیادہ صدمہ اس بات کا ہوا کہ اپنے زمانے کا مشہور ادیب اور فنکار کس بے چارگی کے عالم میں موت کی ابدی نیند سوگیا۔ ہم نے اخبار ایک طرف رکھ کر وکرم صاحب کو فوراً فون ملایا تو انہوں نے پوری کہانی سنائی کہ کس طرح وہ 20 رنومبر کو جنک پوری میں واقع دیوندر اسر کے مکان پر ان کی خیریت معلوم کرنے پہنچے اور تب اسر صاحب کے بیٹے نے یہ اطلاع دی کہ ان کا تو 15 روز قبل ہی دیہانت ہو چکا ہے۔ یہ خبر سن کر وکرم صاحب پر کیا گزری ہوگی، وہ کس کیفیت سے دوچار ہوئے ہوں گے وہ ہی بتا سکتے ہیں، جو اسر صاحب کے لنگوٹیا یار تھے۔ ہم تو صرف اسر صاحب کی بے چارگی اور بے بسی پر کف افسوس ہی مل سکتے ہیں لیکن اردو والوں کی بے حسی کو کیا کہیں گے۔ ہم انہیں کوسیں یا لعن طعن کریں۔ چلئے ہم اردو والوں کو چھوڑ دیتے ہیں۔ ہم خود کو ہی اس کا ذمہ دار سمجھتے ہیں کہ ہم نے کیوں نہیں ان کی خبر لی؟

دیوندر اسر صاحب کی ذات ایک طویل عرصے سے جیسا کہ ہم نے اوپر ذکر کیا بے چارگی اور تنہائی سے عبارت ہو کر رہ گئی تھی۔ اچھے خاصے ایک وسیع مکان کے مالک ہوتے ہوئے وہ صرف ایک کمرے میں محصور ہو کر رہنے پر مجبور تھے۔ ان کا ایک بھرا پرا کنبہ بھی تھا لیکن نہ جانے کیوں انہیں ان کے کنبہ نے قید تنہائی کی سزا دے رکھی تھی۔ ایک دفعہ ہمیں خود اسر صاحب نے بتایا کہ ایک عرصے سے وہ اکیلے ہی رہ رہے ہیں اور اب تو عادت سی ہوگئی ہے۔ لیکن آخر کب تک؟ جب تک وہ جوان تھے اکیلے پن کا درد جھیلتے رہے، لیکن جب وہ عمر طبعی کو پہنچ گئے تو بے چارگی کا احساس انہیں شدت سے ستانے لگا۔

دیوندر اسر صاحب کتنے عرصے سے اس کیفیت سے دوچار رہے، وثوق سے بتانا مشکل ہے۔ لیکن داد دینی چاہئے اسر صاحب کو کہ ان حالات میں بھی کبھی وہ بحیثیت ادیب اپنی ذمہ داریوں سے غافل نہیں ہوئے۔ وہ ایک مفکر اور ادیب کا کردار بھلی بھانتی پوری ذمہ داری کے ساتھ نبھاتے رہے۔ ہمیشہ نئے نئے موضوعات پر اپنے قلم کا جوہر دکھاتے رہے۔ ادب پر بھی اور

ادب کے علاوہ بھی، جس پر سکہ بند اردو ادیبوں اور مفکروں کو سوچ کر ہی سر درد ہونے لگتا ہے اور جب سر کا درد ذرا ہلکا ہوتا ہے تو اپنی جھینپ کچھ اس طرح مٹاتے ہیں کہ پتہ نہیں اسر صاحب کیا لکھتے ہیں اور کس اسلوب میں لکھتے ہیں؟ ہماری تو سمجھ میں ہی نہیں آتا۔

دیوندر اسر جب تک چست درست اور چاق و چوبند رہے، ان کا روز کا معمول تھا کہ وہ صبح نو بجے اپنے گھر سے نکلتے اور بس پکڑ کر سیدھے سینٹرل سکریٹریٹ کی لائبریری پہنچتے اور نئی کتابوں کی تلاش شروع کر دیتے۔ ساہتیہ اکیڈمی کی لائبریری بھی ان کی پسندیدہ لائبریریوں میں سے ایک تھی۔ جہاں وہ سب سے پہلے انگریزی کی کتابیں دیکھتے پھر اردو، ہندی اور پنجابی کی کتابیں۔ ان چار زبانوں پر انہیں عبور حاصل تھا۔ وہ ان چاروں زبانوں کی کتابوں کی بہترین چیزوں کا مطالعہ کرتے اور ان سے استفادہ کرتے۔ ان کا ماننا تھا کہ بہترین اور اہم چیزیں لکھنے کے لیے ضروری ہے کہ ہم زیادہ سے زیادہ مطالعہ اور مشاہدہ کرتے رہیں جبھی آپ اس اہم ذمہ داری سے عہدہ برآ ہو سکتے ہیں۔ دیوندر اسر صحیح معنوں میں ایک ترقی پسند ادیب کے ساتھ ساتھ جدیدیت اور مابعد جدیدیت کے بھی رہنما تھے۔ خاموشی سے کام کرتے جانا ان کا وطیرہ تھا۔ ان کی کتابوں میں مستقبل کے روبرو (1986)، ادب کی آبرو (1996) اور نئی صدی اور ادب (2000) اہم ہیں جو اپنے موضوع اور مواد کی اہمیت کے سبب تادیر یاد رکھی جائیں گی۔ جن سے اردو کے طلبہ اور ریسرچ اسکالر استفادہ کرتے رہیں گے۔ ان مطبوعات کے علاوہ ان کی دیگر تنقیدی کتابوں میں فکر اور ادب، ادب اور نفسیات، ادب اور جدید ذہن، اہم، قابل ذکر اور لائق مطالعہ ہیں۔

دیوندر اسر نہ صرف مغربی اور اردو ادب و تنقید اور فکشن کے ماہر تھے بلکہ وہ ہندی اور پنجابی فکشن کے بھی دلدادہ تھے اور اردو میں ان کے کئی افسانوی مجموعے اپنے موضوع کے لحاظ سے اہم اور قابل قدر ہیں۔ گیت اور انگارے (1952) شیشوں کا مسیحا (1955)، کینوس کا صحرا (1983)، پرندے اب کیوں نہیں اڑتے (1992) اور خوشبو بن کے لوٹیں گے (1988) اہم ہیں۔ منٹو اور ٹیگور ان کے پسندیدہ ادیبوں میں رہے ہیں، اور زمانہ طالب علمی میں ہی وہ ان پر مضامین لکھ کر اپنی پسندیدگی کا اظہار کر چکے ہیں۔ ان مضامین میں منٹو ایک ادبی جراح اور کچھ ٹیگور کے بارے میں اہم ہیں۔ 2012 کا سال اس لحاظ سے اہم ہے کہ اس سال منٹو اور ٹیگور دونوں کو

یاد کیا جا رہا ہے اور ادب سے تعلق رکھنے والا ہر چھوٹا بڑا ان دونوں ادیبوں کو اپنی اپنی بساط بھر یاد کر رہا ہے۔ اس موقع پر دیویندر اسر اگر پچھلے دو تین سالوں سے اپنی بیماری سے نہ جوجھ رہے، ہوتے تو ضرور وہ بھی ان کے شایان شان خراج عقیدت پیش کرتے۔ لیکن اب تو موت نے خود دیوندر اسر کو خراج عقیدت وصول کرنے پر مجبور کر دیا ہے۔ سچ ہے:

موت سے کس کو رستگاری ہے
آج وہ کل ہماری باری ہے

(جنوری 2013)

''اردو کی ترقی میں بہت جلسے، کانفرنسیں، اسپیچیں، تقریریں، خطبے اور بحث مباحثے دیکھنے اور سننے میں آئے۔ ریزولوشن اور تجویزوں کی تو حد نہیں مگر اردو اگر بگڑی نہیں تو ترقی بھی نہیں کی۔ بلکہ ایک یہ بڑا نقص آ گیا کہ زبان اساتذہ جسے انگریزی میں Classical (کلاسیکل) کہتے ہیں دہن یار کی طرح معدوم اور کمر یار کی طرح غائب ہے.....'' (صلائے عام، جنوری 1926)

''یہ سال کا آخری نمبر ہے اور اس کی اشاعت کے ساتھ ہمایوں اپنی عمر کی سات منزلیں طے کر رہا ہے۔ خدا کا شکر ہے کہ ہمایوں کے بلند و بالا مقاصد کو مدنظر رکھتے ہوئے ہم اس سال کامیاب و کامران رہے ہیں۔ اپنی استعداد کے مطابق ہم نے جتنی بھی کوششیں کی ہیں وہ بہ نظر استحسان دیکھی گئی ہیں..... آپ کی اعانت کو جاری رکھتے ہوئے ہماری مساعی کی جو قدر افزائی آپ نے کی ہے اس کے لئے ہم آپ کے شکر گزار ہیں..... ہم امید کرتے ہیں کہ آپ ترقی و توسیع میں ہمایوں کی طرف پہلے سے زیادہ توجہ مبذول فرمائیں گے۔'' (ہمایوں، دسمبر 1928)

غالب کون ہے؟

اردو ادب کا سب سے بڑا نام 'غالب' کا ہے۔ بلکہ اگر ہم یہ کہیں کہ پورے ہندوستانی ادب کا سب سے بڑا نام غالب کا ہے، تو غلط نہ ہوگا۔ البتہ عالمی ادب میں غالب، غالب ہونے کے باوجود چند ایک زبانوں کے ادبا کے مقابل غالب ہونے کی کشاکش میں الجھے نظر آتے ہیں۔ لیکن اس سے کس کو انکار ہوسکتا ہے کہ عالمی ادب میں غالب غالب نہ سہی مگر اپنی ایک الگ اور منفرد شناخت ضرور رکھتے ہیں اور دنیائے ادب میں ان کی اسی پہچان اور اہمیت کے سبب انہیں ہاتھوں ہاتھ لیا گیا اور ان کی شاعری کے متعدد ترجمے کیے گئے، کیے جارہے ہیں اور کیے جاتے رہیں گے۔

غالب اپنی حیات میں جتنا پریشان رہے آج وہ خود اپنے نام پر ہونے والی تقریبات دیکھتے تو شاید خوشی سے مرجاتے۔ آج غالب کے نام پر کیا کچھ نہیں ہو رہا ہے۔ ہندوستان میں بھی اور ہندوستان کے باہر بھی۔ غالب انسٹی ٹیوٹ، غالب اکیڈمی تو خاص اسی مقصد کے لیے وقف ہیں۔ اس کے علاوہ مختلف ریاستوں کی اردو اکادمیاں بھی اس قسم کے پروگرام ترتیب دیتی آئی ہیں۔ خود ماہنامہ 'آجکل' دہلی نے اپنے فروری کے شمارہ میں کچھ صفحات غالب کے لیے وقف کر رکھے ہیں۔ یہ سب شعرِ غالبؔ کی عظمت کی دلیل ہے۔

مگر اسی غالب نے زندہ رہتے اپنی ضروریات زندگی کے لیے کیا کیا جتن نہیں کیے۔ کبھی رامپور کا سفر کیا تو کبھی کلکتہ کا اور کبھی بادشاہ وقت کے استاد بننے کی جوڑتوڑ کرتے نظر آئے اور ساری زندگی اسی تگ ودو میں لگے رہے۔ کچھ اس طرح اور اس حد تک کہ اگر ان کی شاعری اور ان کی نثر نگاری اتنی زوردار اور پاورفل نہ ہوتی تو شاید ہی کوئی انہیں منہ لگاتا یا اتنی اہمیت دیتا۔ اس کا دوسرا پہلو یہ ہے کہ جس غالب کو اپنی ضروریات زندگی کے لیے اتنی تگ ودو کرنی پڑی، اسی غالب کے

نام پر آج جشن اور مختلف تقریبات کا انعقاد کیا جا رہا ہے۔ اس کی یاد میں احباب پلاؤ کھا رہے ہیں اور قبر پر فاتحہ خوانی کی جا رہی ہے۔ یہ سلسلہ دسمبر (غالب کی پیدائش) سے شروع ہو کر فروری (غالب کا انتقال) تک جاری رہتا ہے۔ آج عالم ارواح سے غالب یہ سب دیکھ رہے ہوتے تو شاید مرنے کی تمنا بار بار کرتے، ہزار بار کرتے کہ وہ مفلوک الحالی سے زندگی بھر نبرد آزما رہے اور تاحیات اس سے پیچھا نہیں چھڑا سکے۔

اتنے بڑے پیمانے پر اور اتنے تواتر کے ساتھ غالب پر تقریبات کے انعقاد کے باوجود، غالب کے نت نئے پہلو سامنے آتے رہتے ہیں۔ یہ سب غالب کی ڈرامائی اور کرشماتی شخصیت کا اعجاز ہے۔ غالب پر اتنا کچھ لکھا اور پڑھا جا چکا ہے کہ لگتا ہے کہ اب اس میں مزید کی گنجائش نہیں۔ ہمارا خیال ہے کہ اب غالب پر لکھنا جتنا آسان نظر آتا ہے اتنا ہی مشکل بھی ہے۔ آسان اس لیے کہ غالب پر کچھ بھی لکھنا تن آسانوں اور سہل پسندوں کے لیے مشکل نہیں کہ غالب پر وافر ریڈی میڈ مواد سہل الحصول ہے اور آپ ان سے چاہے جس طرح سے استفادہ کر لیں۔ بس حوالہ یا ریفرنس ضرور دے دیں تاکہ آپ پر سرقہ کا الزام نہ آنے پائے اور آپ شوق سے ایک مضمون کے مصنف ہی نہیں بلکہ بزعم خود ماہر غالبیات بھی کہلا سکتے ہیں۔

البتہ غالب پر کچھ بھی لکھنا کسی بھی مضمون نگار/تنقید نگار کے لیے اس وقت مشکل ہو جاتا ہے جب وہ دیکھتا ہے کہ غالب کی حیات اور کارنامے کے تعلق سے کوئی بھی گوشہ اچھوتا نظر نہیں آتا۔ ایسے میں کوئی دانشور جب کوئی نیا گوشہ نکال کر سامنے لاتا ہے تو سبھی اسے قابل رشک نظروں سے دیکھنے لگ جاتے ہیں۔ آج بھی ایسے محققین اور دانشوروں کی کمی نہیں جو ایسا نادر و نایاب کارنامہ انجام دیتے رہتے ہیں۔ مگر مشکل یہ ہے کہ آج کچھ بھی مشکل نہیں۔ اگر آپ غالب پر نہیں لکھ سکتے تو آپ پر حرف آتا ہے۔ چنانچہ آپ غالب پر کچھ نہ کچھ ضرور ہی پیش کر دیتے ہیں کہ یہ آپ کی دانشوری کا تقاضا ہے۔

مشکل یہ بھی ہے کہ آپ غالب پر کچھ بھی اور کہیں سے بھی لکھ کر لے آتے ہیں کہ یہ آپ کی دانشوری کے عین موافق ہے اور اسے کسی پروگرام میں بہ بانگ دہل پیش بھی کر دیتے ہیں لیکن جب آپ کی پکڑ ہوتی ہے کہ یہ مال کہیں سے اڑایا ہوا ہے تو آپ انتہائی بے باکی (جی ہاں آج بے شرمی کو بے باکی کہا جاتا ہے) سے اس معترض کو ایسی کھری کھری سناتے ہیں کہ اس کو بھاگنے کے لیے بھی کوئی راہ سجھائی نہیں دیتی اور آپ اپنا مقالہ پیش کر کے کسی فاتح کی مانند اپنی گدی

پرآ کر براجمان ہو جاتے ہیں۔

غالب نے اپنے وظیفہ کے سلسلے میں ایک ہی بار کلکتہ کا سفر کیا تھا۔لیکن اس ایک سفر کو نہ جانے کتنے ماہرین غالبیات نے اپنے اپنے طور پر پیش کیا ہے کہ جس کے پڑھنے یا سننے سے ہی اب ذہن مکدر ہو جاتا ہے۔ غالب دہلی سے کب روانہ ہوئے اور کس تاریخ کو رامپور پہنچے، کب بنارس، کب عظیم آباد اور کب کلکتہ وارد ہوئے۔ وہاں کتنے روز گزارے اور کب ان کی واپسی ہوئی۔ یہ سب اتنی دفعہ لکھا جا چکا ہے کہ اس کی بوسیدگی سے طبیعت منغض ہوتی ہے۔

سفر کلکتہ کے علاوہ غالب نے اپنی ضرورت کے تحت دو سفر رامپور کے بھی کیے۔ اب ان دونوں اسفار کو مختلف بیانات، مضامین اور مقالات میں اتنی دفعہ اپنے اپنے طور پر پیش کیا جا چکا ہے کہ توبہ ہی بھلی۔ غالب یا کوئی بھی شخص رامپور جاتے ہوئے غازی آباد ہاپوڑ، بابوگڑھ اور مراد آباد سے ہو کر ہی گزرے گا۔ غالب نے اپنے خطوط میں اسے بہ صراحت رقم بھی کر دیا ہے۔ اب اس سے غالب کی تفہیم میں کوئی فرق نہیں آنے والا کہ غالب نے پریشان ہو کر مراد آباد کی ایک سرائے میں قیام کیا یا کہیں اور؟ اب اس ایک خط کو بنیاد بنا کر غالب اور میرٹھ یا غالب اور مراد آباد جیسے موضوع پر کچھ بھی لکھا جائے وہ فضول ہی کہلائے گا اور جسے ذرا بھی وقت کے زیاں کا احساس ہو وہ اس سے شاید ہی دلچسپی لے گا۔

ادب کے علاوہ مختلف فنون لطیفہ سے جس طرح غالب کی شاعری کو ہم آہنگ کیا گیا وہ بھی اپنے آپ میں ایک مثال ہے۔ غالب کو پردہ سیمیں پر فلموں میں پیش کیا جانا، تھیٹر گروپوں کے ذریعہ ڈراموں میں غالب کی زندگی اور شاعری پر مختلف انداز سے اسٹیج پر پیش کرنا، غالب کی شاعری کو اپنے رقصوں میں نئے نئے انداز میں پیش کرنا، رنگ و نور کے ذریعہ غالب کی شاعری کو درشانا اور ان کی شاعری کو پینٹنگز میں پیش کرنا وغیرہ وغیرہ یہ سب غالب کی شاعری کا کمال ہے۔ جو شاید کسی اور کو یہ اعزاز حاصل نہ ہو سکا۔ پھر بھی ان کے معترضین زندگی بھر ان کو نیچا دکھانے کی کوشش کرتے رہے اور غالب کو کہنا پڑا:

پوچھتے ہیں وہ کہ غالب کون ہے
کوئی بتلاؤ کہ ہم بتلائیں کیا

(فروری 2013)

جے پور کا بے ادب میلہ

دیکھنے ہم بھی گئے تھے پہ تماشہ نہ ہوا۔ جی ہاں! جے پور لٹریچر فیسٹول میں رشدی آئے لیکن کوئی ہنگامہ نہیں ہوا، جس سے بعض حضرات کو مایوسی ہوئی۔ جے پور کا سالانہ لٹریچر میلہ دنیا کے چند بڑے ادبی میلوں میں سے ایک ہے۔ اس ادبی میلہ میں پوری دنیا کے چیدہ چیدہ ادیب، دانشور، مفکر، مصور، آرٹسٹ اور اس قبیل کی معروف و مشہور ہستیاں شریک ہوتی آئی ہیں۔ ہم کہہ سکتے ہیں کہ جے پور ادبی میلہ پوری دنیا کے ادب اور زبانوں کا ایک انتہائی خوبصورت گلدستہ نظر آتا ہے، جس سے وہاں موجود شرکا، محظوظ اور مستفید ہوتے ہیں۔ مختلف زبانوں کے ادب کے بارے میں جاننے، سمجھنے، بوجھنے اور ان کے درمیان افہام و تفہیم کا یہ بہترین موقع ہوتا ہے اور دنیا کے بہترین ادب عالیہ کے جویا حضرات وہاں جا کر موقع کا فائدہ بھی اٹھاتے ہیں۔ پچھلے چھ سالوں (2006) سے جاری اس میلہ کی اہمیت مسلّم ہے۔

لیکن حال کے دنوں میں کچھ عاقبت نااندیش اور شر پسند عناصر کی بے جا دلچسپی لینے کے سبب اس تاریخی ادبی میلہ کی شبیہ کافی بگڑی ہے۔ ایسا محسوس ہوتا ہے کہ 'کچھ لوگ' اس میلے کا سال بھر اس لیے انتظار کرتے ہیں کہ اس موقع سے اپنے ذاتی مفاد کو سادھ سکیں۔ ایسے کچھ حضرات 'تنازعات' کو ہوا دینے کے لیے کوئی بھی شوشہ چھوڑ دیتے ہیں اور پھر الگ ہو کر دور سے تماشہ دیکھتے ہیں۔

ان باتوں کے پیش نظر اگر ہم اسے ادب میلہ کے بجائے 'بے ادب میلہ' سے موسوم کریں تو بے جا نہ ہوگا۔ ہر سال اس میلہ کی تاریخ جوں جوں قریب آتی جاتی ہے تنازعات اسی تیزی سے سر ابھارنے لگتے ہیں۔ اس عاقبت نااندیشانہ حرکت میں اب نہ صرف جانے مانے ادیب ملوث نظر آتے ہیں بلکہ عام شائقین ادب بھی تماش بین کی صورت اس تنازعہ سے لطف اندوز ہوتے

ہیں۔اور جنہیں اس میلہ سے کچھ لینا دینا نہیں بھی ہے وہ بھی 'اپنا حصہ دور کا جلوہ' کے مصداق دور بیٹھے مزے لیتے ہیں اور ماحول خراب کرنے کا سبب بنتے ہیں۔

لیکن ان سارے تنازعات میں سب سے زیادہ ذمہ دار منتظمین ہوتے ہیں، جو جانتے بوجھتے ایسی حرکتیں کرتے ہیں جس سے خواہ مخواہ بدنظمی اور انتشار پیدا ہو۔ممکن ہے کہ منتظمین شاید اسے پبلسٹی اسٹنٹ کے طور پر لیتے ہوں اور دانستاً ایسی حرکتیں کر بیٹھتے ہوں کہ جس سے مفت میں اس میلہ کی پبلسٹی ہو جائے اور اس مد کے لاکھوں روپے بچ جائیں۔

اس 'بے ادب میلہ' میں امسال ایک بار پھر رشدی کو شرکت کی دعوت دی گئی اور میڈیا کے کانوں میں بڑی آہستگی سے یہ بات ڈال دی گئی۔ پھر کیا تھا مخالفین آپے سے باہر نظر آنے لگے اور جو صرف شائقین یا تماش بین تھے وہ بھی ہمہ تن گوش اس سے لطف اندوز ہونے لگے۔شکر ہے کہ کوئی تماشہ کھڑا نہیں ہوا۔رشدی کہیں دبکے ہوئے بھی نظر نہیں آئے۔یہ ایک معمہ ہے سمجھنے کا نہ سمجھانے کا۔

آیئے !ایک نظر اس بے ادبی میلہ پر ڈالتے چلیں۔جے پور کا یہ چھٹا ادبی میلہ 24/ سے 28/جنوری تک منعقد کیا گیا لیکن اس سے کافی پہلے اس تنازعہ کو جان بوجھ کر اچھال دیا گیا کہ اس بار بھی سلمان رشدی کو میلے میں شرکت کی دعوت دی گئی ہے اور وہ ہر حال میں اس میں شرکت کرے گا۔پھر کیا تھا مخالفین مختلف طریقوں سے اسے روکنے کے لیے منصوبہ بنانے لگے۔منتظمین کے خلاف مظاہرے شروع ہوئے۔پورے ملک میں خاص طور پر دہلی، ممبئی، دیوبند، جے پور اور دیگر شہروں سے صدائے احتجاج بلند ہونے لگی اور رشدی ایک چپ ہزار چپ۔

میلہ کے افتتاح سے ایک دن پہلے، اخبارات میں خبر چھپتی ہے کہ بدنام زمانہ ادیب سلمان رشدی دہلی پہنچ گیا ہے۔ وہ یہاں پر فلم ڈائریکٹر دیپا مہتا کی فلم 'مڈ نائٹس چلڈرن' کی چیریٹی اسکریننگ کے لیے آیا ہے۔یہ فلم سلمان رشدی کے اسی نام کے ناول پر مبنی ہے۔گویا ایک سوچی سمجھی پلاننگ کے تحت رشدی کو سیدھے جے پور ادبی میلہ میں نہ لاکر پہلے دہلی لایا گیا تا کہ مخالفین کی پلاننگ کو ناکام کیا جاسکے اور بڑی حد تک منتظمین اپنے اس مقصد میں کامیاب بھی ہوئے۔ ادھر سلمان رشدی نے بھی کسی تنازعہ کو ہوا نہ دینے میں ہی عافیت سمجھی۔

اُدھر ایک دوسرا ہی تماشہ کھڑا ہو گیا۔اور وہ میلہ ہی کیا جس میں تماشہ نہ ہو۔اس ادبی میلہ

میں پاکستانی ادیبوں کی موجودگی کے سبب سخت سیکورٹی کا انتظام کیا گیا تھا، کیونکہ کچھ انتہا پسند تنظیمیں اس بات پر مصر تھیں کہ پاکستانی ادیبوں کو کسی بھی صورت میں میلہ میں شریک نہیں ہونے دینا چاہئے۔ لیکن افتتاح والے دن ہی پاکستانی ادیبوں کو خطاب کی دعوت دی گئی، مخالفین پاکستانی ادیبوں کی اس وجہ سے مخالفت کر رہے تھے کہ اس ماہ کے اوائل میں کشمیر میں لائن آف کنٹرول پر ہندوستانی اور پاکستانی فوج کے درمیان فائرنگ اور ہلاکتوں کے بعد پیدا ہونے والی کشیدگی کے سبب دونوں ملکوں کے درمیان تعلقات پہلے جیسے نہیں رہے۔

اس 'بے ادب میلہ' میں ایک اور واقعہ رونما ہو گیا جو اس میلہ کی تشہیر یا بدنامی کا سبب بن گیا۔ ماہر سماجیات اور ادیب آشیش نندی کے ایک متنازعہ بیان کی وجہ سے ایک بار پھر ایک نیا موضوع بحث ہاتھ آ گیا۔ نندی نے موجودہ دہائی میں بدعنوانی کے لیے براہ راست پسماندہ طبقہ کو ذمہ دار ٹھہرا دیا۔ پھر کیا تھا چوطرفہ تنقید اور مذمت کی صدائیں بلند ہونے لگیں اور نندی نے عافیت اسی میں سمجھی کہ معافی مانگ لی جائے۔ اس کے باوجود ان کے خلاف ایف آئی آر درج کرا دی گئی، ان پر غیر ضمانتی دفعات لگائے گئے۔ جے پور ادبی فیسٹول کے آرگنائزر کے خلاف بھی مقدمہ درج ہوا ہے۔ آگے آگے دیکھئے ہوتا ہے کیا۔

اپنے جارحانہ تیور کے لیے پہچانے جانے والے دلت دانشور کانچا الیا نے آشیش نندی کے جواب میں یہ کہہ کر ہنگامہ کھڑا کر دیا کہ ہندوستان میں خواتین کے ساتھ جنسی زیادتی کے کلچر کی جڑیں ویدک ادب میں موجود ہیں۔ کانچا نے 'میں اور میری دنیا: وقار کی تلاش' کے موضوع پر ایک خصوصی ورکشاپ سے خطاب کرتے ہوئے یہ بات کہی۔ کانچا الیا نے دیوراج اندر کو زانیوں کا ہیرو قرار دیتے ہوئے کہا کہ دہلی گینگ ریپ کے خلاف راج پتھ/ جنتر منتر پر اٹدا سیلاب دکھاوا تھا۔ ان کی دلیل تھی کہ ہندوستان کے گاؤں میں زمیندار آئے دن دلت خواتین کی عصمت دری کرتے رہتے ہیں، جس کی کوئی مخالفت نہیں کرتا۔ کانچا الیا نے نوجوانوں سے اپیل کی کہ تعلیمی اداروں سے سرسوتی کی فوٹو ہٹا کر ساوتری بائی پھولے کی فوٹو لگائیں اور اس کی پوجا کریں۔

دوسری طرف نندی کی مخالفت کو دیکھتے ہوئے منتظمین نے انہیں اس کانفرنس سے دور ہی رکھا۔ اشوک واجپئی، بھال چندر ناماڈے، اودے نارائن سنگھ اور ارا پنڈت کے ساتھ نندی کو بھی 'ہندی انگلش بھائی بھائی' کے موضوع پر ایک سیشن میں خطاب کرنا تھا، جس میں نندی غیر حاضر

رہے۔تعجب ہے کہ میلہ میں موجود شائقین اور تماش بین نے آخر اس موضوع کی مخالفت کیوں نہیں کی۔ ہندی انگلش بھلا بھائی بھائی کس طرح اور کیوں کر ہو سکتے ہیں۔انگلش تو ہمارے عہد غلامی کی دین ہے جسے ہم اب تک حرز جاں بنائے ہوئے ہیں۔ اگر ہندی انگلش بھائی بھائی ہیں تو ہندوستان کی بیسیوں زبانیں کیا ہیں؟ اردو، پنجابی، اڑیہ، مراٹھی، گجراتی، بنگلہ، تلگو، تمل، کنڑ، ملیالی اور دیگر زبانوں کی حیثیت کیا ہے؟ سیشن کا موضوع ''ہندی، اردو جڑواں بہنیں'' ہوسکتا تھا۔ٹھیک اسی طرح ہندوستان کی دوسری زبانوں کے ساتھ ہونا چاہئے تھا۔یہ حقیقت ہے کہ میلہ میں بڑی تعداد میں اردو والے موجود نہیں تھے۔افسوس ہم ہنگامہ آرائی کے وقت تو موجود ہوتے ہیں لیکن جب اپنی بات رکھنے کا وقت ہوتا ہے تو ہم اکثر غائب کیوں ہو جاتے ہیں؟

ایک آخری بات۔اظہار رائے کی آزادی کا مطلب ہرگز کسی کی دل شکنی یا دلآزاری نہیں۔چہ جائیکہ دشنام طرازی اور گالی گلوج کی جائے۔ہمیں کسی سخت بات کا جواب بھی انتہائی ضبط وتحمل کے ساتھ دینا چاہئے کہ یہی ادب اور تہذیب کا تقاضا ہے۔ورنہ حال وہی ہوگا:

لگے منہ بھی چڑانے دیتے دیتے گالیاں صاحب
زباں بگڑی تو بگڑی تھی خبر لیجے دہن بگڑا

(مارچ2013)

''ہتیا، جناب مجنوں گورکھپوری کا ایک ایسا افسانہ ہے جس پر ان کو فخر کرنا چاہئے۔ یہ افسانہ نہ صرف اپنے جذبات انداز بیان بلکہ تجزیہ سیرت، فلسفہ اثر و تاثر اور نظریہ فعل و انفعال کے لحاظ سے بھی ایک ایسی چیز ہے جو اردو افسانہ نگاری کی طرف سے بہترین نمونہ کی صورت میں پیش کی جاسکتی ہے۔ پلاٹ کے متعلق البتہ مجھے بعض جگہ کلام ہے ۔ جوتشی کی پیشین گوئی کہ سرلا اپنے شوہر کو بھی قتل کرے گی جس انداز سے افسانہ میں پوری کرکے دکھائی گئی ہے وہ میرے نزدیک قابل اصلاح ہے۔ قتل کا وقوع اس طرح بھی ہوسکتا تھا کہ 'سرلا' اس کا قصد و اہتمام نہ کرتی، یا پھر اس سے پہلے اس کی دماغی حالت میں مخصوص اضطراب و ہیجان دکھانا چاہئے تھا جو ہندوستان کی ایک دہقانی عورت کی طرف سے اس حرکت کو ممکن الوقوع بنا دیتا.....'' (نگار، نومبر 1927)

بچھڑے سبھی باری باری

جو بھی ذی نفس دنیا میں آیا ہے وہ ایک دن رخصت بھی ہوگا۔ یہی قدرت کا قانون ہے۔ رخصتی کا یہ سلسلہ ان دنوں اردو ادب میں کچھ زیادہ ہی تیز معلوم ہو رہا ہے۔ ابھی ایک ادیب کا سوگ منا کر فارغ بھی نہیں ہوئے تھے کہ دوسرے نے داغ مفارقت دے دیا۔ گزشتہ دنوں ناقد، فکشن نگار اور مفکر و دانشور دیویندر اسر بڑی ہی خاموشی سے بے بسی اور لاچاری کی موت کو گلے لگا کر اپنے چاہنے والوں کو سکتے میں ڈال گئے۔ دیویندر اسر کا غم ابھی ہلکا بھی نہیں ہوا تھا کہ اردو کے ایک اہم محقق اور ماہر غالبیات حنیف نقوی راہی ملک عدم ہوئے۔ یقیناً حنیف نقوی کے انتقال سے اردو تحقیق اور غالب تنقید میں جو خلا پیدا ہوا ہے اسے پُر ہونے میں وقت لگے گا۔ ادھر امین اشرف، مانک ٹالا، تنویر احمد علوی، ڈاکٹر حامد الانصاری انجم (17رفروری) اور قیوم ناشاد (8رفروری) بھی رخصت ہوئے۔

19رفروری کو مانک ٹالا بڑی خاموشی سے ہم سے رخصت ہو گئے۔ شاید ان کے انتم سنسکار میں بھی اردو کے دانشوروں اور ادیبوں کو شرکت کا موقع نہیں ملا۔ اردو والوں کو یہ خبر 24رفروری کو یعنی چار دنوں بعد ڈاکٹر عبدالستار دلوی اور ظہیر انصاری (روزنامہ انقلاب) کے ذریعہ ہم تک پہنچی۔ مانک ٹالا کا ہمارے درمیان سے اٹھ جانا نہ صرف ایک ایماندار ماہر پریم چند کا اٹھ جانا ہے بلکہ ایک ایسے پرآشوب دور میں جب اردو ادب سے غیر مسلم ادیبوں کا دھیرے دھیرے فقدان ہوتا جا رہا ہے، جس کے نتیجے میں اردو ادب اپنی ایک بڑی خوبی یعنی اپنے سیکولر کردار سے محروم ہوتی جا رہی ہے۔ یقیناً یہ اردو کا نقصان عظیم ہے۔ قحط الرجال کے اس دور میں گوپال کرشن مانک ٹالا کا گزر جانا ناقابل تلافی نقصان ہے۔ عام طور پر تنہا زندگی گزارنے والے مانک ٹالا اپنے انتقال کے وقت اپنے پسماندگان یعنی بیٹی، نواسے اور اس کی نومولود بیٹی کے ساتھ خوش تھے اور اسی

خوشی کے عالم میں سوتے میں جان جان آفریں کے سپرد کردی۔ وہ اپنی عمر کے 89 سال گزار چکے تھے۔ وہ اپنی زندگی اور قسمت پر نازاں تھے۔ ان کے چار افسانوی مجموعے 'پیاسی بیل' (1964)، 'گناہ کا رشتہ' (1974)، 'پنجرے کے پنچھی' (1984)، اور 'ہوری کا دوسرا جنم' (1999) کے علاوہ دو ناولٹ 'ماڈرن قصہ چہار درویش' (1971) اور 'دامن کی آگ' (1972) پر اپنے قارئین سے داد حاصل کر چکے ہیں۔

'ہوری کا دوسرا جنم' کو قارئین نے خاص طور پر اس لیے پسند کیا تھا کہ اس میں پریم چند کے مشہور کردار ہوری کی توسیع سے ایک خاص لطف پیدا کیا گیا تھا۔ مانک ٹالا پریم چند کی تخلیقات کو نہ صرف پسند کرتے تھے بلکہ فی زمانہ اردو میں پریم چند ادب کے سب سے بڑے محقق اور ناقد تھے۔ بلاشبہ پریم چند پر ان کی کتابیں اردو کے ذخیرے میں ایک اہم اضافہ ہیں، جس میں پریم چند اور تصانیف پریم چند، کچھ نئے تحقیقی گوشے، پریم چند: کچھ نئے مباحث، پریم چند: حیات نو، پریم چند کا سیکولر کردار اور دیگر مضامین اور توقیت پریم چند شامل ہیں۔

مانک ٹالا کی صورت میں بلاشبہ پریم چند کو ایک ایسا سچا اور بے غرض محقق و نقاد ملا تھا جس نے بغیر کسی شور شرابہ کے پریم چند پر کئی اہم کام انجام دیے۔ دو تین سال پہلے کی بات ہے جب مانک ٹالا نے اپنی آنکھوں کی روشنی چھن جانے کے بعد اپنی بے چینی کا اظہار کرتے ہوئے اپنا سرمایۂ کتب کسی ایماندار ادیب کو تحفتاً دینے کا ارادہ کیا۔ میرے دوست ڈاکٹر پردیپ جین جو پریم چند ادبیات سے حد درجہ دلچسپی رکھتے ہیں انہوں نے جب یہ خبر سنائی تو میں نے انہیں فوراً ممبئی جانے اور مانک ٹالا سے مل کر ان کا ذخیرۂ کتب لے آنے کا مشورہ دیا۔ پردیپ جین فوراً ممبئی کے لیے روانہ ہو گئے اور مانک ٹالا سے وہ سارا سرمایہ حاصل کر کے کسی فاتح کی مانند دہلی لوٹ آئے۔ پردیپ جین بہت خوش تھے، لیکن افسوس ابھی تک مانک ٹالا کی ان کتابوں سے پردیپ جین نے کوئی اہم کام انجام نہیں دیا ہے۔

نامور محقق، ناقد اور ہردلعزیز استاذ ڈاکٹر تنویر احمد علوی نے بھی تقریباً دس برس اپنی بیماری سے جوجھتے رہنے کے بعد آخر 20 رفروری کو داعی اجل کے سامنے ہتھیار ڈال دیے۔ اپنے بعض علمی کارناموں کے سبب تنویر احمد علوی اپنے طلبہ و طالبات کے درمیان مقبول اور پسندیدہ استاد تھے۔ تنویر احمد علوی تنازعوں سے ذرا دور ہی رہا کرتے تھے۔ ذوق پر پی ایچ ڈی کرنے کی وجہ سے وہ اہل ذوق یا ذوقیے کے خطاب سے پکارے جاتے تھے۔ وہ بھی ایک ایسے دور میں جب بھیڑ

چال چلتے ہوئے اکثر ادیب ماہر غالبیات کہلانا پسند کرتے ہیں۔ تنویر احمد علوی کو ذوقیے ہونے پر ناز تھا اور اگر کوئی انہیں اس موضوع پر چھیڑتا تو بہت رسان سے اور بڑے ہی عالمانہ انداز میں جواب دیتے تھے۔ علوی صاحب کے دم سے ذوق غالب کے مدمقابل کھڑے نظر آتے تھے۔

تنویر احمد علوی اکیلے اور تن تنہا اہل ذوق تھے اور انہیں اس پر فخر بھی تھا۔ کبھی کبھی غالب سمینار میں وہ ذوق کی طرفداری کچھ اس طرح کر دیتے کہ اہل غالب سے تنازع کی صورت پیدا ہو جاتی۔ تنویر احمد علوی تحقیقی سوجھ بوجھ اور سلیقے سے ذوق کا دفاع کرتے۔ ذوق کے علاوہ انہوں نے تحقیق کے اصول پر ایک نہایت ہی اہم کتاب 'اصول تحقیق و ترتیب متن' نام سے تصنیف کی، جو خاص طور پر ریسرچ کے طلبہ کے لیے کارگر ثابت ہوئی۔ اس کتاب سے اساتذہ بھی استفادہ کرتے آئے ہیں۔ ہم یہ تو نہیں کہتے کہ تنویر احمد علوی میدان تحقیق کے آخری شہسوار تھے اور ان کی موت سے یہ میدان خالی ہو گیا ہے۔ لیکن احساس زیاں تو ہوتا ہی ہے۔ پرانے اٹھتے جاتے ہیں اور ان کی جگہ نئے اور پرجوش اہل ادب آتے رہتے ہیں۔ خلا پیدا ہونے کی بات محض رسمی طور پر ہی کہی جاتی ہے۔

اردو شاعری کے میدان میں ایک باوقار نام سید امین اشرف کا رہا ہے۔ 7 رفروری کو انہوں نے بھی داعیٔ اجل کو لبیک کہا۔ امین اشرف علی گڑھ یونیورسٹی میں انگریزی کے استاذ رہے ہیں لیکن ان کے اصل جوہر اردو میں ہی کھلے۔ ان کے دو شعری مجموعے 'قفس رنگ' اور 'جادۂ شب' کے علاوہ تنقیدی مجموعہ 'برگ و بار' کافی مشہور ہیں، لیکن بنیادی طور پر وہ شاعر ہیں اور شاعری خوب کرتے ہیں۔ علی گڑھ ہی میں نہیں وہ ہندوستان بھر میں اپنی بہترین کلاسیکی رنگ کی شاعری کے لیے جانے جاتے ہیں۔ وہ کسی مشاعرے میں جانے سے گریز کرتے تھے۔

یہ قانون قدرت ہے کہ ہر ذی نفس جو اس دنیا میں آتا ہے، ایک دن اپنی جان جانِ آفریں کے سپرد کر دیتا ہے۔ کسی کے آنے پر خوشی ہوتی ہے لیکن کسی کے جانے سے ہم افسردہ ہو جاتے ہیں۔ یہ انسانی فطرت ہے۔ یہ دنیا عجیب سرائے ہے، کوئی آتا ہے اور کوئی جاتا ہے۔ کسی کے آنے جانے سے کوئی فرق نہیں پڑتا البتہ کسی اہم اور کام کے انسان کے گزرنے کا ملال تو ہوتا ہی ہے۔ لیکن اس ملال پر قابو پا لینا ہی ہمارے لیے سودمند ہوگا۔ ہم ان سبھی ادبا کو اس مصرعہ کے ساتھ خراج عقیدت پیش کرتے ہیں۔

ہزاروں اٹھ گئے لیکن وہی رونق ہے محفل کی

(اپریل 2013)

سو سال کی ایک الہڑ حسینہ

یہ ایک الہڑ حسینہ کی سچی کہانی ہے۔ وہ شروع سے ہی اپنے ناز و انداز سے اپنے چاہنے والوں کے دلوں کی دھڑکن بڑھاتی رہی ہے۔ وہ اکثر انگڑائی لیتی اور اپنے عاشقوں کا قتل عام کرتی اور جو اپنی پیدائش سے ہی لوگوں کے دلوں کو موہتی بھی رہی ہے۔ کیا بچے، کیا بوڑھے اور کیا جوان سبھی اس الہڑ حسینہ کے دیوانے نظر آتے ہیں۔ اور کیوں نہ ہوں اس الہڑ حسینہ نے اپنے بچپن، اپنے شباب اور اپنی نوجوانی اور پھر جوانی کے دن جس تیز رفتاری سے طے کیے وہ اپنی مثال آپ ہے۔ حد تو یہ ہے کہ سو سال کی عمر جو کسی بھی مخلوق/تخلیق کے لیے عمر طبعی ہوتی ہے کہ اس عمر میں چمک دمک ماند پڑنے لگتی ہے اور بایں سبب اس کے عاشقین اس کی طرف سے بیزار ہوتے جاتے ہیں۔ وہ حسینہ ایک ایسی مخلوق ہے کہ جوں جوں اس کی عمر بڑھتی جاتی ہے، کسی کافر قتالہ کی مانند اور بھی حسین اور پر کشش ہوتی جاتی ہے۔ اپنی سو سال کی عمر میں اس حسینہ نے کیا کیا نہ گل کھلائے ہیں، یہ ایک طویل داستان ہے جو اپنی دلچسپی اور حیرت انگیزی کے باوجود ہمارا خاصا وقت لے لے گی اور ہم شاید یہ کہنے پر مجبور ہو جائیں گے کہ خواب تھا جو کچھ کہ دیکھا، جو سنا افسانہ تھا۔

آیئے اب ایک نظر اس حسینہ پر ڈالتے چلیں جس کو عرف عام میں، ہم فلم یا سنیما کے نام سے جانتے ہیں۔ سو سال پہلے 1911 میں اگر پھالکے نے انگلینڈ میں 'لائف آف کرائسٹ' نہ دیکھی ہوتی تو 3/مئی 1913 میں اسی کی طرز پر ایک خاموش فلم 'راجہ ہریش چندر' بھی شاید نہ بنائی ہوتی اور اگر 1913 میں خاموش فلم نہ بنی ہوتی تو اردیشیر ایرانی نے پہلی بولتی فلم 'عالم آرا' بھی 1931 میں نہ بنائی ہوتی اور 1937 میں 'کسان کنیا' کے ساتھ ہی سنیما رنگین ہو گیا۔

جب دادا صاحب پھالکے نے 1913 میں ایک بے زبان فلم 'راجہ ہریش چندر' بنائی تھی تو

کسی نے سوچا بھی نہ ہوگا کہ ہندوستانی سنیما ترقی کی اتنی ساری منزلیں اتنی تیز رفتاری سے طے کر لے گا۔ 1913 میں پھالکے نے بیشک خاموش فلم ہی بنائی تھی اور اس سے متاثر ہو کر مختلف مقامات پر، خاص طور پر جنوبی ہند کے اہم مقام مدراس میں بھی فلمیں بنائی جانے لگیں۔ اس زمانے میں فلم کے شعبہ میں بمبئی سے زیادہ مدراس کو اہمیت حاصل تھی۔

یہ وہ زمانہ تھا جب مختلف ڈرامہ/ تھیٹر کمپنیاں خانہ بدوشوں کی مانند گھوم گھوم کر ناٹک/ ڈرامے کھیلا کرتی تھیں۔ پارسی تھیٹر اور آغا حشر کے مقفیٰ و مسجع ڈراموں کو دیکھنے کے لیے لوگ امڈے پڑتے تھے کہ یہی اس زمانے میں شاید تفریح کا بڑا ذریعہ تھے اور جس شہر میں ڈرامہ کمپنی وارد ہوتی اس شہر میں ایک جشن کا سا ماحول ہو جاتا۔ تفریح اور وقت گزاری کا ایک اور ذریعہ سرکس کمپنیاں بھی ہوا کرتی تھیں۔ چونکہ سنیما انڈسٹری کی شروعات میں فلمیں خاموش ہوا کرتی تھیں اور باوجودیکہ سنیما ایک نئی چیز تھی اور لوگ اس وجہ سے ایک دوبارا سے دیکھ بھی لیتے تھے، لیکن بار بار ایک بے زبان چیز کو دیکھنے کے بدلے ایک بولتی اور چلتی پھرتی چیز سرکس اور ڈرامہ کو ایک عرصہ تک ترجیح حاصل رہی۔ ڈرامہ یا سرکس کو اس وقت تک کسی قسم کا خطرہ نہیں تھا کہ اس دور کی فلموں کو اپنی بے زبانی کے سبب لوگوں کو اپنی طرف کھینچنے کی طاقت ذرا کم کم تھی۔ لیکن جب یہی سنیما اپنے پہلے پڑاؤ 1913 کو پیچھے چھوڑتے ہوئے اپنے دوسرے پڑاؤ 1931 پر آپہنچا اور 18 سال کی اس حسینہ کو زبان مل گئی اور فلم بولنے لگی اور کچھ ہی دنوں کے بعد 1937 میں 'کسان کنیا' کے ساتھ ہی یہ حسینہ رنگین مزاج ہو گئی۔ تو لوگ اس کی طرف آپ ہی آپ کھنچنے لگے۔ ایسے میں تھیٹر اور سرکس اپنا وجود بچا پانے کی جدوجہد میں پوری قوت صرف کرنے لگے اور جب یہی سنیما کچھ عرصہ بعد رنگین بننے لگا تو گویا اس الہڑ اور دیہاتی حسینہ کو غازہ، پاؤڈر اور لپ اسٹک مل گیا اور اب اس حسینہ کی چمک دمک آنکھوں کو اس قدر خیرہ کرنے لگیں کہ اس کے آگے کوئی دوسری آنکھوں کو جچتی ہی نہ تھی۔ اس صورت میں اپنا وجود بچانے کی دوڑ میں سرکس نے ایک ترکیب اپنائی۔ وہ یہ کہ سرکس میں کام کرنے والی لڑکیاں جو پہلے بھی نیم برہنہ ہوا کرتی تھیں، اب اور زیادہ برہنگی کا مظاہرہ کرنے پر مجبور ہوئیں۔ چنانچہ لوگوں کو سرکس میں زیادہ تفریح نظر آنے لگی کہ سرکس میں کام کرنے والی لڑکیاں اپنے برہنہ وجود کے ساتھ زندہ جاوید ٹھیک آپ کے سامنے صرف گز دو گز کے فاصلہ پر ہوتی تھیں اور تماش بین کی آنکھوں کو زیادہ ٹھنڈک پہنچاتی تھیں۔

کم و بیش یہی صورت حال ناٹک منڈلیوں اور ڈرامہ کمپنیوں کے ساتھ بھی پیش آنے

لگیں۔ وہاں بھی اداکارائیں اپنے فن کی پیش کش کم اور اپنے حسن کا جادو کچھ زیادہ ہی جگاتی نظر آنے لگیں۔ تفریح کے ان تمام ذرائع کے بیچ یہ کشمکش عرصہ تک جاری رہی۔

چونکہ سنیما ایک ایسا ذریعہ تفریح ہے کہ اس میں اداکار ایک دفعہ اپنا کردار ادا کر کے چھٹکارا پالیتا ہے اور اس اداکار کو معاوضہ بھی زیادہ ملتا ہے۔ چنانچہ اس کی اہمیت اور وقعت بڑھتی رہی اور سرکس اور ڈرامے بڑی تیزی سے اپنے تنزلی کی طرف گامزن نظر آنے لگے اور اب تو سرکس تقریباً بالکل ہی ختم ہو گیا۔ البتہ ڈرامہ اپنے فن اور فکر کے نام پر اب بھی کھیلے جا رہے ہیں، لیکن اب اس کی بھی وہ شان و شوکت نہ رہی جو پہلے تھی۔

بیشک فلموں میں امکانات بہت ہیں اور آئے دن ہم ان سے روبرو بھی ہوتے رہتے ہیں۔ ڈھائی تین گھنٹے کی ایک فلم میں ہم ایک یگ جی لیتے ہیں۔ اچھی فلمیں دیکھتے ہوئے ہمیں ایسا محسوس ہوتا ہے کہ ہم بذات خود اس دور میں جی رہے ہیں۔

یہ مسئلہ ہنوز حل طلب ہے کہ اس ہندوستانی حسینہ کی زبان کیا ہے؟ سچی بات تو یہ ہے کہ ہندوستان میں بننے والی زیادہ تر فلمیں نہ تو خالص ہندی کی ہوتی ہیں اور نہ اردو کی بلکہ وہ ہندوستانی ہوتی ہیں۔ یہ اور بات ہے کہ ان فلموں کو ہندی کا سرٹیفکیٹ دیا جاتا ہے۔ اکثر و بیشتر مصلحت کے پیش نظر پروڈیوسر صاحبان بھی ہندی سرٹیفکیٹ کا مطالبہ کرتے ہیں اور اب تو یہ بہت عام بات ہو گئی ہے۔ اور اردو والے اس کا مطالبہ بھی نہیں کرتے۔ ٹھیک اسی طرح ایک فلم جو جنسی اور رومانی مناظر سے پُر ہوتی ہے اور جسے بچوں کو دکھانے میں ہمیں ہچک ہوتی ہے اور جنہیں کسی بھی صورت میں عام فلم 'U' کا سرٹیفکیٹ نہیں دیا جانا چاہیے، ایسی فلموں کو 'A' سرٹیفکیٹ کے ساتھ پاس کر دیا جاتا ہے، جنہیں اسکول جانے والے بچے بطور خاص کسی نہ کسی طریقے سے ہال میں داخل ہو کر دیکھتے ہیں اور اس طرح ہم وقت سے پہلے بچوں کو بالغ ہونے کا سامان فراہم کر دیتے ہیں۔

حال ہی میں ریلیز ہوئی فلم 'ریس 2' میں کچھ قابل اعتراض مناظر کے سبب دہلی ہائی کورٹ نے سخت ناراضگی ظاہر کی ہے۔ بنچ نے معاملے کے سلسلے میں دائر ایک درخواست پر سماعت کرتے ہوئے کہا کہ فلم ساز ہمیشہ فلموں کے کاروبار میں مصروف رہتے ہیں۔ انہیں سنجیدگی سے غور کرنا چاہیے کہ فلم انڈسٹری کس سمت جا رہی ہے۔ فلم ساز پیسے کمانے کی دوڑ میں ایسی فلمیں بنا رہے

ہیں، جس سے بچوں کی تہذیب بگڑ رہی ہے۔ بچوں کے لیے وافر تعداد میں فلم نہ بننے کے سبب بچے ایڈلٹ فلمیں دیکھتے ہیں اور اس کے لیے نہ جانے کون کون سے بہانے اور حربے اپناتے ہیں۔ بعض حربے تو ایسے مجرمانہ اور شاطرانہ ہوتے ہیں جو زیادہ استعمال کے سبب ان بچوں کے لیے مہلک ثابت ہوتے ہیں اور یہی ان کی فطرت ثانیہ بن جاتی ہیں۔

ایک زمانے تک یہ فلمیں صرف فلم ہال میں دکھائی جاتی رہی ہیں، لیکن اب جب کہ ٹی وی ہر گھر کی زینت اور ضرورت بن چکا ہے، ہمارے بچے وہ ساری چیزیں دیکھ رہے ہیں اور سیکھ رہے ہیں جنھیں دیکھنے اور کرنے میں ہمیں حجاب آتا تھا۔ ہمارے ارباب حل وعقد کو اس مسئلہ پر سوچنا چاہئے۔ مبادا یہ حسینہ ہماری اس نسل کے لیے سم قاتل نہ ثابت ہو۔

(مئی 2013)

"آپ ملاحظہ فرمائیں گے کہ اس مہینہ تقریباً سارا کا سارا رسالہ مجھی کو اپنے مضامین سے پر کرنا پڑا اور ہر چند میں نے کوشش کی کہ اس میں تنوع ہو جائے لیکن یہ کوشش کامیاب نہ ہو سکی۔ بعض حضرات اسے پسند نہیں فرمائیں گے مگر نگار کے دور حیات میں یہ کوئی نئی بات نہیں۔ گزشتہ تین سال نو ماہ کے رسالوں کی اگر ورق گردانی کی جائے تو معلوم ہوگا کہ ۴۴۷۳ صفحات میں مشکل سے ایک ہزار صفحات مضامین غیر کے ہوں گے اور باقی تین ہزار صفحات ادارت ہی کی طرف سے پیش ہوئے ہوں گے۔ اس کا ذکر میں نے اس لئے نہیں کیا کہ آپ میری کاوش کی داد دیں یا یہ کہ اس کو اپنی زندگی کا کوئی غیر معمولی واقعہ سمجھ کر آپ کے سامنے پیش کر رہا ہوں بلکہ مقصود اس ضمن میں صرف یہ ظاہر کرنا ہے کہ ملک میں اچھا لکھنے والے اس قدر کم ہیں کہ اگر ان کے اعتماد پر کوئی رسالہ جاری کیا جائے تو چند مہینے بھی زندہ نہیں رہ سکتا۔ چنانچہ جملہ دیگر اسباب کے یہ بھی ایک بڑا سبب رسائل کی ناکامیابی کا ہے۔ جس کو میں نگار کی اولین اشاعت میں بھی ظاہر کر چکا ہوں۔" (نگار، اکتوبر 1925)

نوبل ٹیگور کے سو سال

1913 میں ٹیگور کو ان کی شہرۂ آفاق تخلیق گیتا نجلی پر نوبل پرائز سے نوازا گیا تھا۔ اس طرح اب ٹیگور کے نوبل انعام کے سو سال پورے ہوئے۔ اب ہم چاہیں تو اس کی بھی صدی تقریبات منا سکتے ہیں۔ یوں بھی ہم ٹیگور کا ڈیڑھ سو سالہ جشن منا ہی رہے ہیں، جس میں ملک گیر پیمانے پر مختلف قسم کے پروگرام منعقد کیے جا رہے ہیں۔ اور کیوں نہ ہو؟ رابندر ناتھ ٹیگور وہ پہلے ہندوستانی ادیب ہیں جن کو دنیا کے سب سے بڑے انعام نوبل پرائز سے نوازا گیا۔ اس طرح بنگلہ زبان ہندوستان کی وہ پہلی زبان ہے جس کی شاہکار تخلیق 'گیتا نجلی' کو اس اعزاز سے نوازا گیا۔

امسال، ہم مختلف ادیب و شاعر کی صدی منا رہے ہیں اور آگے بھی مناتے رہیں گے۔ اک ذرا لیک سے ہٹ کر، ہم ابھی ہندوستانی سنیما کے سو سال پورے ہونے پر صد سالہ جشن منا رہے ہیں۔ اسی کڑی میں ٹیگور کے نوبل میڈل کی بھی، ہمیں یاد آئی کہ اس کے بھی سو سال پورے ہو چکے ہیں۔ بلاشبہ ہمیں اس کا بھی جشن منانا چاہیے۔ لیکن کیوں؟ اور کیسے؟ نوبل میڈل تو ہم نے تقریباً دس سال پہلے ہی کھو دیا ہے۔ اب صرف اس کی یاد ہی باقی ہے تو کیا اس کی یاد کے سہارے ہی جشن منا لیا جائے اور محفلیں برپا کی جائیں؟ جس طرح کسی ادیب و شاعر کے انتقال کے بعد بھی اس کی اہم اور ناقابل فراموش تخلیقات کے سبب اس کو یاد کرتے ہیں اور محفلیں سجاتے ہیں اسی طرح ہم اگر نوبل میڈل کے بہانے ہی جشن منائیں تو اس میں کیا حرج ہے؟ یوں بھی ہم پانے سے زیادہ کھونے میں یقین رکھتے ہیں اور ہمیں اس کا احساس بھی نہیں ہوتا۔ احساس زیاں تو کب کا ہم سے رخصت ہو چکا۔

پورے دس سال ہونے کو آئے جب ٹیگور کا نوبل میڈل وشو بھارتی سے اڑا لیا گیا اور ہم صرف ہاتھ ملتے رہ گئے۔ ابھی تک اس میڈل کا کوئی سراغ نہیں مل سکا ہے۔ البتہ نوبل انعام کمیٹی

نے اس میڈل کی نقل دینے کی ضرور پیش کش کی تھی۔ لیکن اصل اور نقل میں جو فرق ہے اس سے ہم سبھی بخوبی واقف ہیں۔ اصل میڈل کی اہمیت اخبارات میں شائع کچھ اس خبر سے لگائی جا سکتی ہے:

'ڈی این اے کی دریافت پر برطانوی سائنس داں فرانسس کرک کو دیا جانے والا نوبل انعام نیویارک میں 22 لاکھ 70 ہزار ڈالر میں نیلام ہوا ہے۔ شنگھائی سے تعلق رکھنے والے جیک وینگ اس نوبل میڈل کے نئے مالک ہیں اور وہ چین میں ایک بایو میڈیکل کمپنی چلاتے ہیں۔ پروفیسر کرک نے یہ نوبل انعام 1962 میں جیتا تھا اور یہ ان کے ورثا کی جانب سے نیلامی کے لیے پیش کی گئی دس اشیا میں سے ایک ہے۔ فرانسس کرک کا اپنے بارہ سالہ بیٹے کو تحریر کیا گیا ایک خط 53 لاکھ ڈالر میں فروخت ہوا۔ اس خط میں فرانسس نے اپنے بیٹے کو ڈی این اے کی ڈبیل ہیلکس شکل کے بارے میں بتایا تھا۔ ذرائع کے مطابق نیلامی میں نوبل انعام میڈل کے لیے سب سے زیادہ بولی لگانے والے جیک وینگ کا کہنا ہے کہ وہ اس میڈل کے لیے اس سے دوگنی قیمت بھی ادا کرنے کو تیار تھے۔ ان کا کہنا تھا کہ وہ اپنی کمپنی میں تحقیقی عمل کو فروغ دینے کے لیے نئے طریقوں کی تلاش میں ہیں۔ جیک کے مطابق ہم ایک کمیٹی بنائیں گے جو اس بات کا جائزہ لے گی کہ کن سائنس دانوں نے نئی ٹیکنالوجی میں اپنا کردار ادا کیا ہے اور پھر اس مقابلے کے فاتح کو یہ نوبل میڈل اور سند دے دیں گے۔ فرانسس کرک کی پوتی کیندرا کا خیال ہے کہ ان کے خاندان نے میڈل اور دیگر سامان نیلام کرنے کا فیصلہ سائنسی تحقیق کے لیے رقم جمع کرنے کی خاطر کیا اور نیلام سے حاصل ہونے والی رقم ان کے اندازوں سے کہیں زیادہ ہے۔ واضح ہو کہ یہ تاریخ میں صرف دوسرا موقع ہے کہ کوئی نوبل انعام کسی عوامی نیلام میں فروخت ہوا ہو۔'

اس چھوٹی سی خبر سے اندازہ لگایا جا سکتا ہے کہ اصل اور نقل کا کیا فرق ہے؟ کیا ہم ٹیگور کے نوبل میڈل کی نقل کو نیلام کر سکتے ہیں؟ کیا کوئی نقلی میڈل خرید سکتا ہے؟ کیا ہم فرانسس کرک کے میڈل کے نئے مالک جیک کی طرح ٹیگور کے اس نقلی میڈل کو کسی کام میں لا سکتے ہیں؟ کیا اپنے نقلی میڈل کو فروخت کر کے اس سے حاصل ہونے والی رقم کو کسی تحقیقی کام میں لا سکتے ہیں؟ ہر گز نہیں۔

25 مارچ 2004 کو جب ٹیگور کی دیگر قیمتی اشیا کے ساتھ میڈل کی چوری ہوئی تو ہم نے بہت ہاتھ پاؤں مارے لیکن اس تگ ودو کا کچھ نتیجہ برآمد نہیں ہوا۔ یہ قیمتی سرمایہ کن حالات میں چوری ہوا۔ مجھے یاد ہے سب ذرا ذرا، تجھے یاد ہو کہ نہ یاد ہو۔ آیئے اپنی یادداشت کے سہارے

اس پر ایک سرسری نظر ڈالتے چلیں:

25 ؍مارچ کو جس وقت ہم ہند و پاک کے مابین پانچواں اور آخری ونڈے کرکٹ میچ دیکھ رہے تھے اور کھیل کے سحر میں ایسے کھوئے تھے کہ ہمیں آس پاس کی خبر بھی نہ رہی۔ اس وقت ہمارے ملک کی ریاست مغربی بنگال کی ایک یونیورسٹی سے کچھ قیمتی سامانوں کی چوری ہورہی تھی۔ یہ قیمتی سامان کچھ اور نہیں بلکہ گرودیو رابندرناتھ ٹیگور کا نوبل میڈل اور ان کی کچھ پینٹنگس وغیرہ تھیں اور یہ چیزیں کہیں اور سے نہیں بلکہ خود ٹیگور کے گہوارۂ علم وعمل وشو بھارتی سے چوری ہوئیں۔ نوبل انعام ٹیگور کی یادگار میں اس لیے اہمیت رکھتا ہے کہ یہ ٹیگور کی گیتانجلی کا اعتراف محض تھا۔ ٹیگور کا اعتراف مختلف اداروں اور لوگوں نے اپنے اپنے طور پر مختلف انداز میں کیا ہے، لیکن نوبل کمیٹی کا یہ اعتراف سب سے اہم اور اعلیٰ ہے۔

ٹیگور نہ صرف ایک سچے دیش بھکت اور محب وطن تھے بلکہ شانتی کے ایک بہت بڑے امین بھی تھے۔ 1915 میں ٹیگور کو 'نائٹ' کے خطاب سے نوازا گیا تھا لیکن اسے انہوں نے جلیانوالا باغ قتل عام کے خلاف احتجاج کرتے ہوئے لوٹا دیا تھا۔ یہ ان کی امن پسندی اور انصاف دوستی کا تقاضا تھا۔ چنانچہ انہوں نے انگریزوں کا دیا ہوا خطاب لوٹا کر اپنے شانتی کے پیغام کو بڑے خوبصورت انداز میں پوری دنیا کے سامنے پیش کیا تھا۔ شانتی کے دوت کی حیثیت سے پوری دنیا میں ان کی ایک خاص پہچان ہے۔

ٹیگور کا ایک بڑا کارنامہ گیتانجلی ہے۔ یہ ٹیگور کی سب سے کامیاب تصنیف مانی جاتی ہے۔ جب درد وسوز اور روح کی گہرائی سے نکلا جذبہ تحریر کا روپ دھار لے تو وہ واقعی لافانی اور شاہکار ہوجاتا ہے۔ 1902 سے 1907 کے درمیان ٹیگور نے پے درپے کئی صدمے سہے۔ پہلے شریک حیات ساتھ چھوڑ گئیں، اس کے بعد بیٹا داغ مفارقت دے گیا اور پھر بیٹی نے موت کی آغوش میں پناہ لی۔ یہ تینوں ٹیگور کو بے حد عزیز تھے۔ ان کی جدائی کا درد جب ایک نقطے پر سمٹ کر آگیا تو اس نے گیتانجلی کی شکل اختیار کرلی۔

نوبل انعام چوری واقعہ کی تفتیش کے لیے سی بی آئی کی ایک ٹیم تشکیل دی گئی اور اس سلسلے میں بولپور میں چار لوگوں کو گرفتار بھی کیا گیا، لیکن لاحاصل۔ البتہ اس واقعے کا ایک دوسرا پہلو ہمارے سامنے یہ ہے کہ ٹیگور کی وراثت تو علم وعمل کی شکل میں ہمارے پاس موجود ہے۔ کاش ہم

اس کی ہی پاسداری کرلیں۔ لیکن نہیں، ہم نے اس معاملہ پر آپس میں ہی لڑنا شروع کردیا۔ سیاسی فائدے اٹھانے کے لیے طرح طرح کے ہتھکنڈے استعمال کیے گئے، طرح طرح کے بیان دیے گئے لیکن سب لاحاصل۔ کاش ہم ٹیگور کی تعلیمات اور شانتی کے پیغام پر ہی عمل پیرا ہوجائیں۔ اگر ہم ایسا کرنے میں کامیاب ہو پائیں تو یہی ٹیگور کو ہمارا سچا خراج عقیدت ہوگا اور اس طرح ہم نوبل میڈل کے کھو جانے کا غم کچھ تو کم کرسکتے ہیں۔

(جون 2013)

"....شادی کا مضمون اجتماعی نقطہ نظر سے اور ہندوستان کی معاشیات، اقتصادی زاویہ نگاہ سے قابل قدر مضامین ہیں.....'ارتقاء حقیقت' ہارڈی کی ایک نظم کا نہایت کامیاب ترجمہ ہے گو لفظی نہیں ہے۔ تعین بحر اور تقسیم اوزان میں جناب فراق گورکھپوری نے نہایت دلچسپ جدت سے کام لیا ہے۔

.....غزلیں یوں تو سب خوب ہیں لیکن جناب راز کی غزل کا پانچواں، چھٹا اور آٹھواں شعر، جناب حافظ کا چوتھا چھٹا شعر، جگر بریلوی کا پہلا چوتھا اور آخری شعر۔ جناب فرح بنارسی کا آٹھواں، بارہواں شعر اور ثمر دربھنگوی کا چھٹا شعر خصوصیت کے ساتھ مجھے پسند آیا.....نیاز فتحپوری۔" (نگار، نومبر 1927)

ایک روشن دماغ تھا، نہ رہا

معروف ادیب، دانشور اور انقلابی مفکر اور اسکالر اصغر علی انجینئر کا بھی انتقال ہو گیا۔ ان کے ہم مسلکوں نے انہیں باغی قرار دیا تھا اور اصغر علی نے بھی اپنی ساری زندگی اسی باغیانہ شان سے گزاری۔ جس قوم میں وہ پیدا ہوئے اسے عرف عام میں ہم داؤدی بوہرہ کے نام سے جانتے ہیں۔ جب اصغر علی انجینئر نے اپنی قوم میں بے راہ روی دیکھی تو انہیں روحانی تکلیف ہوئی اور انہوں نے ٹھان لیا کہ وہ ساری زندگی نہ صرف مسلمانوں کے اس خاص فرقہ داؤدی بوہرہ میں پھیلی برائیوں کی اصلاح کریں گے بلکہ اسلام کی خالصتاً اس کی اصل روح کے ساتھ تشہیر و تبلیغ کریں گے۔ چنانچہ وہ ایک مشن کی طرح اپنے اس فریضہ کو ساری زندگی انجام دیتے رہے، جس کے لیے انہیں غیروں سے زیادہ اپنوں کی مخالفت کا سامنا کرنا پڑا۔

یادش بخیر! جب تک ہمارے استاد پروفیسر محمد حسن جواہر لال نہرو یونیورسٹی سے منسلک رہے۔ اصغر علی انجینئر پابندی سے ان سے ملنے آیا کرتے تھے۔ دونوں بزرگوں کا ذہنی میلان تقریباً ایک سا رہا ہے۔ دونوں کی ذہنی ساخت اوپر والے نے تقریباً ایک سی بنائی تھی۔ اکثر و بیشتر معاملات میں دونوں کے افکار ایک سے تھے۔ ہاں دونوں میں ایک ذرا سا فرق یہ تھا کہ پروفیسر محمد حسن آزاد خیال تھے جب کہ اصغر علی انجینئر روشن خیال۔ محمد حسن کا دین دھرم سے کوئی خاص تعلق نہ تھا جب کہ اصغر علی انجینئر مذہب سے جڑے ایک انسان تھے اور یہ اکثر ان کے افعال و اقوال سے منعکس ہوتا تھا۔ وہ جب بھی جواہر لال نہرو یونیورسٹی آتے تو محمد حسن صاحب کے کمرے میں ایک چھوٹی سی محفل جم جاتی اور علم و ادب سے لے کر سیاست اور قوم کی گمرہی جیسے موضوعات و معاملات پر گفتگو شروع ہو جاتی اور گھنٹوں یہ محفل جاری رہتی۔ اس محفل سے جب ہم باہر آتے تو ہم میں کچھ حاصل کرنے کا احساس جاگزیں ہوتا۔ جب کہ اسی یونیورسٹی میں ایسے اساتذہ اور طلبہ بھی تھے جنہیں ان موضوعات سے کوئی دلچسپی تھی

اور نہ ہی وہ اس محفل میں شریک ہوتے۔اسی دور میں (تقریباً تیس سال پہلے) ہم اصغر علی انجینئر کے نام اور کام سے اچھی طرح واقف ہو چکے تھے کہ اصغر علی انجینئر ایک ایسی ذات کا نام ہے۔ جو جہد مسلسل میں یقین رکھتا ہے اور ڈر اور خوف ان کی سرشت میں تھا ہی نہیں۔

واقعہ ہے کہ انہوں نے بچپن میں ہی جب ملک کی آزادی اور نتیجے میں تقسیم وطن کا سانحہ وقوع پذیر ہوا تو اصغر علی انجینئر جو اس وقت وردھا میں تھے، بے چین ہو اٹھے۔ان دہشت ناک واقعات کو آنکھوں نے دیکھا بھی اور کانوں نے سنا بھی، لیکن کم ہی لوگوں نے ان واقعات کو قلم بند کیا اور اس کی مذمت کی۔ انہی کم لوگوں میں سے ایک اصغر علی انجینئر بھی تھے۔وہ سوچ میں پڑ گئے کہ لوگ آخر کیوں کر مذہب کے نام پر ایک دوسرے کا قتل کر سکتے ہیں۔اصغر علی انجینئر نے بچپن میں ہی اپنے کچے ذہن سے ان واقعات کا مشاہدہ کیا تھا اور اسی ناپختہ ذہن سے تجزیہ بھی کیا۔جب انہوں نے اپنی خودنوشت سوانح لکھنا شروع کی تو یہ واقعات و سانحات صف باندھے اصغر علی انجینئر کے سامنے آتے رہے جسے انہوں نے اپنے علمی و ادبی پیرائے میں 'اے لیونگ فیتھ' کے نام سے قلمبند کر کے تاریخ کا حصہ بنا دیا۔

دسمبر 2012 میں بابری مسجد کی بیسویں برسی کے موقع پر وہ بیمار ہونے کے باوجود اس مہم میں شامل تھے، جو بابری مسجد سانحہ اور نتیجے میں بمبئی میں ہونے والے فساد کے خلاف چلائی گئی تھی۔نتیجہ میں ان پر کم از کم چھ بار قاتلانہ حملے کیے گئے۔مگر جسے اللہ رکھے اسے کون چکھے۔انہوں نے اپنے مشن کو جاری رکھتے ہوئے مذہبی اصلاحات کی پرزور وکالت کی۔اس کے لیے انہوں نے متعدد کتابیں اور اخبارات میں مضامین تحریر کیے۔

راجستھان کے شہر اُدے پور کے نزدیک ایک گاؤں سلمبر میں اصغر علی کی پیدائش 10 مارچ 1939 کو ہوئی۔ان کی پرورش روایتی ماحول میں ہوئی۔ان کے والد ایک مہذب شخص تھے اور بحیثیت بوہرہ مبلغ انہیں مختلف شہروں میں جانا پڑتا تھا۔ان کے والد نے کبھی کسی مذہب کے خلاف نہیں بولا۔اصغر علی کو بشمول دوسرے مسلم طلبہ کے اپنے اسکول کے دنوں میں کافی کچھ سہنا پڑتا تھا۔انہیں پاکستانی کہا جاتا گویا وہ انہیں گالی دے رہے ہوں۔چنانچہ اسکول کے زمانے سے ہی انہوں نے خاص طور پر اسلام اور مسلمانوں کے مسائل پر تواتر سے مضامین اور کتابیں لکھنا شروع کیں۔یہ سلسلہ ان کی وفات تک جاری رہا۔حد تو یہ ہے کہ جب وہ اسپتال میں زیر علاج تھے، انہوں نے اپنے لیپ ٹاپ پر انڈونیشیا میں ہونے والے بین

العقائد میٹنگ کے لیے کلیدی خطبہ لکھ بھیجا۔ اور دوسری بار انہوں نے اسپتال سے ہی اپنے موبائل فون پر تقریباً ڈیڑھ گھنٹہ تک کانفرنس سے خطاب کیا۔ دراصل وہ اپنے کمٹمنٹ کو بہت اہمیت دیتے تھے۔ ہم جیسا کوئی اور آرام پسند انسان ہوتا تو اسے یہ کہتے ہوئے ٹال دیتا کہ چھوڑو پھر کبھی۔ لیکن اصغر علی نے کوئی عذر یا بہانہ کبھی نہیں تراشا اور اس طرح کے کام کو اپنا فرض سمجھتے ہوئے اسے انجام تک پہنچایا۔

اسلام اور مسلم مسائل کے علاوہ انہیں خواتین کے مسائل اور خواتین کے مساویانہ حقوق سے بھی کافی دلچسپی تھی اور اس موضوع پر بھی وہ تواتر سے لکھتے رہے اور اسے بھی وہ اپنے مشن کا حصہ گردانتے۔ ان تمام کاموں کو وہ قرآن کی روشنی میں ہی دیکھتے تھے۔ وہ دراصل قرآن مجید کو ایک ایسی کتاب کے طور پر لیتے تھے جس میں انسانوں کے تمام مسائل کا حل موجود ہے۔ بس اک ذرا آپ کے اندر جوش وجذبہ، لگن اور محنت اور ان سب سے زیادہ قرآن مجید کا احترام ہو۔ یہی وہ احترام تھا کہ نڈر اور بے خوف ہو کر انہوں نے حق وانصاف کی خاطر بڑے بڑے کام کر ڈالے۔

اصغر علی انجینئر نے مذہبی اصلاحات کو فروغ دینے کے لیے اودے پور میں فروری 1977 میں سنٹرل بورڈ آف داؤدی بوہرہ کی ایک کانفرنس کی، جس میں اصغر علی انجینئر کو جمہوری طریقہ سے اس بورڈ کا جنرل سکریٹری چن لیا گیا۔ اس کے بعد انجینئر نے اسلامک اسٹڈیز کے لیے ممبئی میں ایک انسٹی ٹیوٹ قائم کیا ساتھ ہی مطالعہ سماج اور سیکولرزم کے لیے بھی سینٹر قائم کیے۔

اصغر علی انجینئر اگر چہ پیشے اور ڈگری سے انجینئر تھے۔ انہوں نے ممبئی میونسپل کارپوریشن میں 63 سے 83 تک بطور انجینئر 20 سال کام کرنے کے بعد اپنی ملازمت سے استعفیٰ دے دیا اور اپنی زندگی قوم اور اپنے ملک کے لیے وقف کر دی۔

وہ پیشے سے انجینئر اور فکر سے مصلح اور مبلغ تھے۔ ایسے میں کوئی شاید یہ سوچ بھی نہیں سکتا کہ انہیں شعروادب سے بھی دلچسپی ہو سکتی ہے ۔ انہیں غالب سب سے زیادہ پسند تھے اور اقبال کے بھی وہ بڑے مداح رہے اور پریم چند کے بھی بڑے قدردان تھے۔ وہ صرف ادب سے دلچسپی ہی نہیں رکھتے تھے بلکہ وہ ان پر متعدد تنقیدی مضامین بھی لکھتے رہے اور اپنی پسند و نا پسند کا اظہار بھی کرتے رہے۔ واقعہ یہ ہے کہ ایک بار ان کے والد انہیں مذہبی پیشوا 'سیدنا' کے پاس لے گئے تا کہ وہ ان کی قدم بوسی اور سجدہ ریزی کی رسم کو انجام دے سکیں۔ اصغر علی انجینئر نے ایسا کرنے سے

صاف انکار کردیا اور کہا کہ سجدہ تو صرف ایک اللہ کو ہی روا ہے۔ تب سے ہی ان کے تیور باغیانہ ہو گئے۔ انہوں نے ٹھان لیا کہ وہ بوہرہ فرقہ میں سرایت کر چکے اوہام کو نہ صرف آشکار کریں گے بلکہ وہ ان برائیوں کے خلاف سینہ سپر ہو کر خالص اسلام کی تبلیغ و تشہیر کریں گے۔

چنانچہ انہوں نے ایسا ہی کیا اور وہ اس میں بڑی حد تک کامران و کامیاب رہے۔

آسماں تیری لحد پر شبنم افشانی کرے

(جولائی 2013)

''انسانی زندگی کے سب سے زیادہ تکلیف دہ، لیکن اس کے ساتھ نہایت دلچسپ لمحات وہ ہوا کرتے، جب حوادث روزگار اس کو اپنا نشانہ بنانا ٹھہرالیں۔ یہی وجہ ہے وہ جسے مذہب و تصوف کی زبان میں آزمائش و ابتلا کہتے ہیں اور ادبی ذوق رکھنے والے فطرت کی شوخیوں سے تعبیر کرتے ہیں۔ لیکن کاروباری دنیا اور مادی عالم میں جان کا خدا 'سلسلہ علت و معلول' کے سوا اور کچھ نہیں، 'طبعیات' کی یہ ستم رانیاں اس قدر حوصلہ فرسا اور دل شکن ثابت ہوتی ہیں کہ نہ مذہب کی تاویل اس کا مداوا کرسکتی ہے اور نہ شاعرانہ تعبیر اس کی تلخیوں میں کوئی کمی۔

ہر شخص اپنی اپنی جگہ امن وسکون کی جستجو میں سرگرداں ہے لیکن اس کا کیا علاج کہ قدرت کا محبوب ترین مشغلہ یہی ہے کہ وہ تدابیر کے اضمحلال کو برابر ہم پر ثابت کرتی رہے۔ عمارتوں کو ڈھائے اور نقوش کو مٹائے۔ پھر اکثر و بیشتر اس کا نتیجہ یہی ہوتا ہے کہ انسان اپنی تعمیری جدوجہد کو چھوڑ بیٹھتا ہے اور اپنے آپ کو سیل زمانہ کے حوالے کردیتا ہے..... اس لئے ناظرین سے صرف اس قدر التجا ہے کہ وہ اپنی موجودہ ہمدردی کو بدستور قائم رکھیں اور اپنی بے اعتنائی سے میری تکالیف میں اضافہ نہ فرمائیں کیونکہ یوں بھی مجھے حزین وملول رکھنے کے لئے کسی چیز کی کمی نہیں:

شارۂ فلک و بخت روزگارے ست۔ نیازؔ''

(نگار، مئی 1926)

ریشمی/غدر تحریک کے سو سال

ہم خوش نصیب ہیں کہ آج ہم آزادی کی فضا میں سانس لے رہے ہیں۔ اہل وطن کو یوم آزادی مبارک۔ ہر سال کی طرح امسال بھی ہم پورے جوش وخروش سے یوم آزادی منا رہے ہیں۔ کیا ہندو، کیا مسلمان اور کیا سکھ بلا تفریق مذہب وملت اس قومی تہوار کو ہم مل جل کر مناتے ہیں کہ یہ تاریخ ہند کا ایک سنہرا باب ہے اور جوں جوں وقت گزرتا جائے گا تاریخ ہند کا یہ سنہرا باب مزید سنہرا ہوتا جائے گا۔

ہم ہر سال اس کو بطور تہوار اس لیے مناتے ہیں کہ آزادی کی اہمیت کو ہماری نئی نسل سمجھ سکے اور غلامی کی دو ڈھائی سو سالہ لعنت کو یاد کر کے اس سے نفرت اور اس سے بچنے کی ہر ممکن کوشش کر سکے۔ آج ہمارا ملک آزاد ہے لیکن ہم میں سے بہت سے لوگ ایسے ہیں جو نہ تو غلامی کی لعنت کو سمجھتے ہیں اور نہ ہی آزادی کی قیمت کو۔ ایسے میں ہمارا فرض ہے کہ ہم انہیں اس سے متعارف کرائیں۔ آزادی کے حصول کے لیے ہمارے بزرگوں نے کیا کیا نہ جتن کیے، کیا کیا نہ صعوبتیں جھیلیں، کتنی جانوں کی قربانیاں بھی دیں۔ یہ آزادی ہمیں تحفے میں نہیں ملی ہے۔ ہم نے آزادی کے حصول کے لیے مختلف طرح سے جدوجہد کی، اس کی ساری تفصیل اب تاریخ کے صفحات میں محفوظ ہو چکی ہے۔

جدوجہد آزادی کئی مراحل سے گزرتی رہی۔ کبھی ایسا لگا کہ اب ہم کامیابی سے قریب ہیں اور عنقریب آزادی ہمارے قدم چوم لے گی۔ 1757ء میں جنگ پلاسی کا انجام سب سے زیادہ تکلیف دہ اور اذیت ناک صورت حال کے ساتھ ہمارے سامنے آیا اور یہی وہ موڑ ہے جب ہم تقریباً پورے طور پر غلامی کی زنجیر میں جکڑ دیے گئے۔ تب سے 1857ء تک محبان وطن اپنی آزادی کے لیے ترستے اور تڑپتے رہے۔ اپنے اپنے طور پر اپنی بساط بھر کوششیں کرتے

چلائی گئی ایک اہم تحریک ہے۔ آج اس تحریک کو سو سال پورے ہو رہے ہیں۔ یہ تحریک بلاشبہ برطانوی راج کے خلاف چلائی گئی ایک خفیہ تحریک تھی جس سے شاید صرف دیوبند کے علما واقف تھے۔ اس تحریک کو استحکام بخشنے کے لیے ترکی، جرمنی اور افغانستان کی حکومتوں سے مدد حاصل کی گئی تھی تا کہ اس تحریک کو کامیابی سے ہمکنار کیا جاسکے۔

اس تحریک کو حد درجہ خفیہ رکھنے کے باوجود اس وقت پنجاب کے سی آئی ڈی نے دیوبند کے رہنما عبیداللہ سندھی، جو اس وقت افغانستان میں تھے، ان کے خطوط پکڑ کر اس تحریک کو بے نقاب کر دیا۔ یہ خطوط منصوبے کے تحت ایک دوسرے رہنما شیخ الہند محمود الحسن کو لکھے گئے تھے جو اس وقت ایران میں تھے۔ یہ خطوط ریشمی رومال پر لکھے گئے تھے، اسی مناسبت سے یہ تحریک ریشمی رومال کے نام سے مشہور ہوئی۔

ان ہی دنوں پہلی عالمی جنگ چھڑ گئی۔ لیکن علما کی جماعت نے اس کے باوجود اپنی جدوجہد جاری رکھی۔ اپنے منصوبے کے تحت مولانا عبیداللہ سندھی اور دارالعلوم دیوبند کے مہتمم مولانا محمود الحسن اکتوبر 1915ء میں کابل جا پہنچے۔ اسی مقصد کے تحت مولانا عبیداللہ سندھی نے افغانستان کے امیر سے ملاقات کی اور ان سے درخواست کی کہ وہ برطانوی حکومت کے خلاف جنگ کا اعلان کریں۔ ادھر مولانا محمود الحسن نے جرمنی اور ترکی سے مدد کی درخواست کی۔ پھر مولانا محمود الحسن حجاز (موجودہ سعودی عرب) کے لیے روانہ ہو گئے۔ ٹھیک اسی وقت مولانا عبیداللہ افغانستان کے امیر سے دوستانہ روابط قائم کرنے میں کامیاب ہو گئے۔ کابل سے اپنے کچھ شاگردوں کے ساتھ مولانا عبیداللہ ترکی کے لیے روانہ ہو گئے تا کہ برطانوی سامراج کے خلاف خلیفہ کے جہاد میں ان کا ساتھ دیا جاسکے۔ عبیداللہ سندھی نے اس جہاد کو تحریک آزادی ہند کے پس منظر میں بہتر جانا۔ لیکن اس منصوبہ کا راز فاش ہونے کے بعد دیوبندی علما گرفتار کر لیے گئے۔ شیخ الہند مولانا محمود الحسن کو مکہ سے گرفتار کیا گیا اور حضرت حسین احمد مدنی کے ساتھ مالٹا بھیج دیا گیا۔

اس تاریخ ساز تحریک ریشمی رومال کی صدی کے موقع پر جنوری 2013 میں صدر جمہوریہ پرنب مکھرجی نے اس تحریک اور اس سے جڑے لوگوں کی قربانیوں کی یاد میں بجا طور پر ایک ڈاک ٹکٹ جاری کر کے انہیں تہنیت پیش کی ہے۔

(اگست 2013)

رہے۔ 1857ء آزادیِ وطن کی تاریخ کا وہ ٹرننگ پوائنٹ ہے جب ہمارے دیش واسی دو بہ دو اور رو بہ رو برطانوی حکومت سے دو دو ہاتھ کرتے نظر آئے۔ یہی وہ موڑ ہے جب ہمارے اندر کچھ کر گزرنے کی امنگ جاگی۔ 1857ء میں میرٹھ سے چند جوشیلے دیس واسیوں نے دہلی پہنچ کر بہادر شاہ ظفر کی قیادت میں انگریزوں سے دو دو ہاتھ کرنے کی ٹھان لی۔ لیکن افسوس اس کا انجام ہمارے لیے خوش کن ثابت نہیں ہوسکا۔ یہ صحیح ہے کہ کچھ عرصہ کے لیے ہم نے انگریزوں کو پریشانی میں ڈال دیا اور ان تک یہ میسیج پہنچا دیا کہ ہم محبان وطن نچلا بیٹھنے والوں میں سے نہیں ہیں اور دیر سویر ایک دن، ہم تم کو بھگا کر ہی دم لیں گے۔ اس کا ایک بڑا فائدہ یہ ہوا کہ ہم نے اپنے تمام دیس واسیوں اور بطور خاص نئی نسل کے سامنے ایک مثال قائم کردی۔

1857 جسے انگریزوں نے غدر سے موسوم کیا تھا، دراصل وہ ایک درخشاں باب ثابت ہوا۔ 1857 کے واقعہ کو انگریزوں نے بڑی ہوشیاری سے غدر کہہ کر ایک طرح سے ہمیں مجرم ثابت کیا تھا۔ چونکہ ہمارا یہ عمل غیر منضبط تھا اور اس کے پیچھے کوئی پلاننگ نہیں، بس انتشار ہی انتشار تھا۔ لہٰذا انگریزوں نے اسے غدر کہہ کر یہ پیغام دینے کی کوشش کی کہ ہم نے اپنے اس عمل سے گویا وطن کے تئیں غداری کی ہے۔ جب کہ سچی بات یہ ہے کہ تاریخ ہند کا یہ باب جدوجہد آزادی سے مزین ہے۔ انگریزوں کو انھی کے لہجے اور ٹون میں جواب دینے کی غرض سے لالہ ہردیال نے نومبر 1913 میں پہلے اردو اور پھر پنجابی میں سین فرانسسکو سے 'غدر' کے نام سے ہی ایک ہفتہ وار اخبار جاری کیا، جس کے سرنامہ پر لکھا ہوتا تھا 'انگریزی راج کا جانی دشمن'۔ آزادیِ وطن کے لیے تمام دیش واسی ہمیشہ اپنی اپنی سی کوششیں کرتے رہے اور جوں جوں وقت گزرتا گیا، ہم آزادی سے قریب ہوتے گئے۔ جدوجہد آزادی کے متعدد واقعات میں تحریک ریشمی رومال بھی ایک اہم واقعہ ہے جو گرچہ ناکام ہوئی لیکن وہ اپنا ایک اثر چھوڑنے میں کامیاب رہی۔

جس تحریک کو ریشمی رومال کے نام سے جانا جاتا ہے، ہم میں سے بیشتر لوگ واقف ہیں لیکن یہ تحریک اصلاً کیا ہے اور کس طرح یہ تحریک چلائی گئی، کن کن کے اذہان کی یہ اپج تھی اور کب اور کن حالات میں اس تحریک کو چلانے کی نوبت آئی اور یہ تحریک کتنی مفید اور کتنی کامیاب رہی؟ آیئے ہم اسے پھر سے یاد کریں۔

آزادی کی طویل جدوجہد میں ریشمی رومال تحریک علمائے دیوبند کے ذریعہ 1913 میں

ادب عالیہ اور جاسوسی ادب

فی زمانہ اردو میں جاسوسی ادب صرف ابن صفی کا مرہون منت ہے۔ اگر یہ کہا جائے کہ اردو جاسوسی ادب اور ابن صفی دونوں ایک دوسرے کی شناخت ہیں تو غلط نہ ہوگا۔ دوسرے ناموں کے لیے ہمیں ذہن پر خاصا زور ڈالنے کی ضرورت پڑتی ہے تب کہیں کچھ ایک نام سامنے آتے ہیں۔ لیجئے ان کے نام بھی لکھے دیتا ہوں ۔ تیرتھ رام فیروز پوری، ظفر عمر، ہمایوں اقبال، ایچ اقبال، عارف مارہروی، اکرم الٰہ آبادی اور ابن سعید وغیرہ۔ لیکن ان میں سے کسی ایک کا بھی چراغ ابن صفی کے سامنے نہیں جل سکا۔ اوراب اظہار اثر کے انتقال کے بعد تو جاسوسی ادب کا آخری ٹمٹماتا چراغ بھی گل ہوگیا۔ کہنے کا مطلب یہ کہ اب جاسوسی ادب میں کوئی فعال نام باقی نہیں رہا۔ خوشی کی بات ہے کہ ایسی خراب صورت حال میں ایک بار پھر جاسوسی ادب کے احیا کی کوششیں زور پکڑنے لگی ہیں۔ اردو جاسوسی ادب کے امام ابن صفی ایک بار پھر شائقین کے سامنے اس طرح وارد ہو رہے ہیں کہ گویا وہ کبھی ہمارے درمیان سے اٹھے ہی نہیں تھے۔ بس اک ذرا ہماری نظروں سے اوجھل سے ہوگئے تھے اور سچی بات تو یہ ہے کہ ابن صفی ہماری نظروں سے بھی اوجھل کب ہوئے تھے۔ ان کے ناول کے اصلی، نقلی، جعلی اور عکسی ایڈیشنز ہمیشہ چھاپے اور پڑھے جاتے رہے ہیں جو ابن صفی کی یاد تازہ کراتے رہے ہیں۔

ابن صفی جن کا اصلی نام اسرار احمد تھا، صحیح معنوں میں شش جہات شخصیت کے مالک تھے۔ انہوں نے اسرار ناروی کے نام سے شاعری کی اور طغرل فرغان کے نام سے طنز و مزاح اور انشایئے لکھے۔ کہا جاتا ہے کہ سنکی سولجر کے نام سے بھی کچھ چیزیں لکھی تھیں۔ لیکن جاسوسی ادب کو انہوں نے اپنا اوڑھنا بچھونا بنائے رکھا بلکہ سچ تو یہ ہے کہ یہی ان کا ذریعۂ معاش رہا، نہ

صرف ان کا بلکہ ہندوپاک میں ان کے اصلی اور نقلی متعدد ناشرین کا بھی۔

ابن صفی اور جاسوسی ادب کی صورت حال جب ایسی ہو تو پھر کا ہے کا شور وغوغا۔ آخر کیوں کر جاسوسی ادب کو ٹاٹ باہر کیا جاسکتا ہے۔ مزے کی بات یہ ہے کہ ابن صفی نے کبھی اس صورت حال کی پروانہیں کی اور جتنی جتنی مخالفت بڑھتی گئی، جاسوسی ادب اور ابن صفی کو اسی قدر اس کا فائدہ ملتا گیا۔

یہاں اصل بحث یہ ہے کہ کیا جاسوسی ادب کو ادب عالیہ کے زمرہ میں رکھا جاسکتا ہے؟ یہ ادب عالیہ کیا بلا ہے؟ اور آخر کس قسم کے ادب کو ہم ادب عالیہ کہہ سکتے ہیں اور کس ادب کو ہم ادب عالیہ کے مقابلے پاپولر ادب، مقبول عام ادب، تفریحی ادب، سری ادب یا بازاری ادب کہتے ہیں؟ یا محض اس کا ٹیگ لگا کر اسے کمترین اور رسوا کرتے رہتے ہیں۔

صورت حال آج اس کے بالکل برعکس ہے۔ میرا دعویٰ ہے کہ جو جتنا بڑا مخالف دکھائی دیتا ہے وہ اسی قدر اس کا عاشق نکلا۔ کھلے عام نہیں تو چھپ چھپ کر ہی سہی، ایسے لوگ اپنے بوجھل لمحوں کو اسی تفریحی لٹریچر کے مطالعہ سے ہلکا پھلکا اور خوشگوار بناتے رہے ہیں۔ دروغ بر گردن راوی مجاز کی عشقیہ شاعری کے تعلق سے مشہور ہے کہ علی گڑھ یونیورسٹی کی لڑکیاں اسے اپنے تکیوں کے نیچے رکھتی تھیں اور آپس میں فال نکالتی تھیں کہ مجاز کی دلہن کون بنے گی۔ جب کہ ابن صفی اور ان کے جاسوسی ادب کے تعلق سے حقیقت یہ ہے کہ اردو والوں کے تکیے کے نیچے یہی جاسوسی ناول پایا جاتا رہا ہے۔ صرف تکیوں کے نیچے ہی نہیں بلکہ مطالعہ کی میزوں پر اور بک شیلف میں بھی اس کی حکمرانی خاصی مستحکم رہی ہے۔

ادب میں آخر ان جاسوسی تخلیقات کا مقام کیا ہے؟ جاسوسی ادب کو دوسرے اور تیسرے درجے کا ادب ثابت کر کے اس کی توقیر کم کرنے کی سازش آخر کیوں کی جاتی رہی ہے؟ یہ مخالفین اپنے مقصد میں کسی حد تک کامیاب بھی ہوئے۔ کل بھی اور آج بھی۔ اور سچی بات یہ ہے کہ جاسوسی ادب کے رائٹر زیادہ تر Fake اور نام نہاد ثابت ہوئے کہ ان کی اکثریت بوجوہ اپنے اصلی نام کے ساتھ سامنے آنے کی ہمت نہ کر سکی۔ ان میں سے اکثر و بیشتر اپنے نام نہاد قلمی ناموں کا سہارا لے کر اور کچھ ایک نے تو ابن صفی سے ملتے جلتے ناموں جیسے ابّن صفی یا این صفی کے نام سے اور

کچھ ایک نے تو دیدہ دلیری سے ابن صفی کے نام سے ہی جاسوسی ادب لکھ کر جیبیں بھرنے کی ناکام کوششیں کیں۔ایسے میں اس میدان میں صرف اور صرف ابن صفی ہی تن تنہا ایسی شخصیت ٹھہرتے ہیں جو اپنے اس کام کو پوری لگن، محنت اور ایمانداری سے کرتے رہے اور کامیابی ہر ہر منزل پر ان کے قدم چومتی رہی۔

جاسوسی ادب کے تعلق سے یہ تعصب اور تنگ نظری کل بھی تھی اور آج بھی ہے۔ نام نہاد رائٹر کل بھی پیدا ہوتے رہے اور آج بھی۔وہ کبھی امر نہیں ہو سکتے۔پھرتے ہیں میرؔ خوار کوئی پوچھتا نہیں۔ ابن صفی کی بات اور ہے۔کل تک جو ان کی مخالفت کرتے رہے تھے آج انہیں عزت وتکریم دے رہے ہیں۔

خوشی کی بات یہ ہے کہ آج ابن صفی اور جاسوسی ادب کو پی ایچ ڈی کے لیے یونیورسٹی میں رجسٹر کیا جا رہا ہے اور یونیورسٹی سے باہر بھی اس سمت میں خاصی پیش رفت ہوئی ہے۔سب سے بڑی بات یہ کہ ان کے چاہنے والوں کا حلقہ آج بھی موجود ہے جو کسی بھی طرح ادب عالیہ کے پرستاروں سے کم نہیں۔بہت ممکن ہے کہ ابن صفی اور جاسوسی ادب پر ہو رہی اس تحقیق وتنقید کے بعد اسے بھی ادب عالیہ میں باضابطہ شامل کر لیا جائے۔16 / مارچ 2007 کو ساہتیہ اکیڈمی میں ابن صفی پر ایک جلسہ کا انعقاد کیا گیا جس میں کرسٹینا اوسٹر ہیلڈ کا Ibne Safi: A Neglected Bestselling Author کے موضوع پر ایک لیکچر اور پروفیسر گوپی چند نارنگ کا کلیدی خطبہ انتہائی اہم ہے۔اس سمت میں یونیورسٹی کی سطح پر جامعہ ملیہ اسلامیہ کے خالد جاوید کے مضامین اور 16-14 دسمبر 2012 کو ایک سمینار کا انعقاد قابل ذکر ہے۔معلوم ہوا ہے کہ ممبئی یونیورسٹی میں ابن صفی اور جاسوسی ادب پر پی ایچ ڈی ہو رہی ہے۔

اردو بک ریویو کے عارف اقبال کی سعی وکوشش کو بھی بنظر استحسان دیکھنا چاہیے۔انہوں نے 1032 صفحات پر مشتمل ایک ضخیم کتاب ''ابن صفی: مشن اور ادبی کارنامہ'' شائع کی ہے جسے اردو ادب کا ایک کارنامہ کہنا چاہیے۔ پاکستان میں خرم علی شفیق، راشد اشرف، مشتاق احمد قریشی، محمد حنیف اور ابن صفی کے صاحبزادے احمد صفی نے کچھ اہم اور بنیادی کام کر کے ابن صفیات میں قیمتی اضافے کیے ہیں۔پروفیسر شمس الرحمٰن فاروقی نے ابن صفی کے چار ناولوں کا انگریزی میں

ترجمہ کر کے ابن صفی اور ان کے جاسوسی ادب کی اہمیت پر مہر ثبت کر دی ہے۔

سوال یہ ہے کہ ادب عالیہ میں اگر پریم چند، منٹو، بیدی، عصمت اور کرشن چندر شامل کیے جا سکتے ہیں تو آخر کیوں ابن صفی شامل نہیں کیے جا سکتے؟ ادب میں اعلیٰ اور ادنیٰ کی بحث کئی سطحوں پر ہوتی رہی ہے جیسے فلاں ادیب کی زبان اعلیٰ پایہ کی ہے اور فلاں کا اسلوب جداگانہ ہے، فلاں کے ناولوں کے کردار اصلی معلوم ہوتے ہیں اور فلاں کی پلاٹ نگاری معیاری ہے اور اسی طرح سے ادب کی دوسری اور خوبیاں بھی اچھے برے اور اوسط ادب کے تعین میں مددگار رہی ہیں۔ ایک اعلیٰ ادب کی مذکورہ تمام خوبیاں ابن صفی کے ادب اور تحریر میں بدرجہ اتم موجود ہیں بلکہ بعض اوقات ان سب سے بڑھ کر ہیں۔ ادب کی جو چاشنی ابن صفی کی تحریروں میں پائی جاتی ہے وہ انہیں سب سے الگ اور منفرد بناتی ہے اور ابن صفی بلاشبہ ادب کے اعلیٰ اور نمایاں مقام پر فائز نظر آتے ہیں۔

(ستمبر 2013)

"..... ہم ریاست جیسے بے اصول میں یہ تحریر دیکھ کر حیران و ششدر رہ گئے۔ ہمیں معلوم نہیں کہ اصل واقعہ کیا ہے لیکن جو کچھ اس شذرہ کے مطالعہ سے معلوم ہوا ہے وہ یہ ہے کہ اخبار ریاست کے کسی مترجم نے سدرشن کا کوئی افسانہ اپنے ساتھ 'ریاست' میں شائع کر دیا ہے۔ اور اس پر جناب مدیر صاحب ریاست نے اس غلط کار مترجم کی کمینہ حرکت پر سدرشن صاحب سے معافی طلب کی ہے..... مندرجہ بالا سطور لکھنے کے بعد ہمیں ریاست کا ایک تازہ پرچہ وصول ہوا جس میں نیرنگ خیال سے دو نظمیں نقل کی گئی ہیں جن میں سے ایک غزل کے نیچے نیرنگ خیال کا کوئی حوالہ نہیں دیا گیا۔ ہم نے پنڈت ہری چند اختر سے معلوم کیا کہ کیا انہوں نے یہ غزل مدیر ریاست کو براہ راست بھیجی تھی؟ مگر پنڈت صاحب کو اس سے انکار ہے۔ یہ غزل ہم نے پنڈت صاحب سے معقول نذرانہ پیش کر کے حاصل کی تھی....."

(نیرنگ خیال، اکتوبر 1926)

کس نے تحقیقی مقالہ لکھا.....

آج بڑی تعداد میں تحقیق کا کام ہورہا ہے۔ یونیورسٹی میں بھی اور یونیورسٹی کے باہر بھی۔ لیکن کیا آج تحقیق کی صورت حال اطمینان بخش ہے؟ سچی بات تو یہ ہے کہ تحقیق کے نام پر سرقہ آج بہت عام ہے۔ ابھی پچھلے دنوں ایک یونیورسٹی میں ایم فل کے ایک وائیوا کے لیے جانے کا اتفاق ہوا۔ ایم فل کا یہ ڈیزرٹیشن اردو کی ایک بڑی شخصیت پر تھا۔ جن پر کتابیں لکھ کر یا ایم فل، پی ایچ ڈی کر کے کئی طرح کے فائدے اٹھائے جاتے ہیں۔

میں ایم فل کے جس ڈیزرٹیشن کا ذکر کررہا ہوں اس کی خاص بات یہ تھی کہ اس ڈیزرٹیشن میں ممدوح پر تین مطبوعہ کتابوں سے بھرپور استفادہ کیا گیا تھا۔ استفادہ اس حد تک کہ ایک دو اقتباسات پر ہی قناعت نہیں کیا گیا بلکہ پورے کا پورا صفحہ بلکہ کئی صفحات من وعن نقل کیے گئے تھے اور انتہائی دیدہ دلیری سے اس کے حوالے بھی دیے گئے تھے۔ کسی ستم ظریف نے کہا ہے کہ بغیر حوالے کے کسی کے مال پر ہاتھ صاف کیا جائے تو سرقہ اور اگر حوالے کے ساتھ نقل کیا جائے تو اسے ریسرچ کہتے ہیں۔ اب ہم اس طریقۂ کار یا دیدہ دلیری کو کیا نام دیں؟

یونیورسٹی کی سطح پر شاید یہ ایک عام صورت حال ہے جو جاری وساری ہے۔ ہم یہ بھی نہیں کہتے کہ سارے کے سارے اسکالر اس بدعنوانی کے شکار ہیں۔ انہیں یونیورسٹیوں میں بہت سے ایسے کام ہوئے ہیں یا ہورہے ہیں جو ایمانداری کی مثال ہیں اور یہ نہ صرف استاد (سپروائزر) کی سطح پر بلکہ ریسرچ اسکالر کی سطح پر بھی دیکھا جاسکتا ہے۔ یونیورسٹی ہی کی سطح پر ایک تیسرا پہلو بھی سامنے آیا ہے، وہ یہ کہ ریسرچ اسکالر کسی یونیورسٹی میں رجسٹریشن کرالے اور کسی پیشہ ور شخص سے ایک معقول معاوضہ پر تھیسس لکھوالے اور وقت مقررہ پر اس تھیسس کو اسکالر اپنے نام سے داخل دفتر کردے:

کس نے تحقیقی مقالہ لکھا کس کے نام سے
کون دلی جاکے پوچھے گا یہ مالک رام سے

اور اب تو تحقیق میں اس دھاندلی کا پردہ فاش کرنے کے لیے مالک رام بھی ہمارے درمیان نہیں رہے۔ ریسرچ اسکالر تھیسس جمع کرنے کے بعد اپنی پسند کے اگزامنر کے پاس تھیسس بھجوانے کی کوشش کرتا ہے اور زیادہ تر اس میں کامیاب بھی ہوتا ہے۔ ایسے اگزامنر تحریری رپورٹ بھی من چاہی بھیجتے ہیں اور زبانی امتحان کے وقت اس اسکالر کی شان میں زمین و آسمان کے قلابے ملا دیتے ہیں اور آخر کو وہ ریسرچ اسکالر کامیابی و کامرانی کا جھنڈا لہراتے ہوئے کچھ اس شان سے باہر آتا ہے گویا قلعہ فتح کرلیا ہو۔

یہ تو رہی یونیورسٹی کے اندر تحقیق کی صورت حال۔ یونیورسٹی کے باہر گرچہ وہ لعنت نہیں لیکن یہاں بھی پوری ایمانداری شاذ و نادر ہی دکھائی دیتی ہے۔ مصنف بننے اور صاحب کتاب کہلانے کی چاہ میں کیا کیا نہیں کیا جاتا۔ آپ کے پاس پیسے ہوں تو آپ ایک کیا انیک کتابوں کے مصنف بن سکتے ہیں۔ لیکن اس خراب صورت حال میں بھی کچھ لوگ ایسے ہیں جو ایمانداری سے کام کرتے ہیں جس سے کہ نہ صرف اس ایماندار اسکالر کو سچی خوشی حاصل ہوتی ہے بلکہ دوسروں کے لیے ایک مثال بھی بنتے ہیں۔ لیکن افسوس اب ایسے لوگ خال خال ہی نظر آتے ہیں۔

ایک بات اور۔ آج جس قسم کی تحقیق کی جارہی ہے وہ سرے سے تحقیق ہے ہی نہیں۔ تحقیق کے معنی حق کی تلاش و جستجو یا بازیافت ہے۔ ہم کوئی نئی چیز کی جستجو کرتے ہیں، جسے سن کر یا دیکھ کر نہ صرف ہم کو یک گونہ خوشی کا احساس ہوتا ہے بلکہ دوسرے بھی ہمارے اس کام کو بہ نظر استحسان دیکھتے ہیں۔ لیکن افسوس! ایسے لوگ انگلیوں پر گنے جاسکتے ہیں۔ یونیورسٹی سے باہر ہونے والی ریسرچ میں چونکہ روپے پیسے یعنی مالی فائدے پوشیدہ نہیں ہوتے۔ چنانچہ وہ علمی پیاس بجھانے کے لیے محنت اور ایمانداری سے اپنے لیے خوشی اور سرشاری کا سامان فراہم کرتے ہیں۔

آج آئے دن سیکڑوں کتابیں شائع ہورہی ہیں لیکن پڑھی نہیں جارہی ہیں۔ میں ایک بار پھر اپنی بات پر اصرار کرتا ہوں کہ کتابوں کا انبار جمع ہورہا ہے لیکن ان کتابوں کے ساتھ خاطر خواہ سلوک نہیں ہورہا ہے۔ صورت حال یہ ہے کہ صاحب کتاب اپنی کتابیں چھپوا تو لیتے ہیں اور مصنف بھی بن جاتے ہیں لیکن کسی صورت نکاسی نہیں ہوپاتی۔ کتابوں کے کاروبار میں صاحب کتاب کو اکثر ناکامی ہی ہاتھ آتی ہے۔ چنانچہ ایسے مصنفین تحفتاً اپنی کتابیں یار دوستوں کو بھیجنا شروع کردیتے ہیں۔ اس طرح وہ اپنے گھر کا کباڑ دوسروں کے گھر میں ڈالنے کے مرتکب ہوتے

ہیں۔اب یہ اور بات ہے کہ لاجے اور شرمے کتاب پانے والے حضرات ایک دو لائن کا خط دل بستگی کے لیے ارسال کر دیتے ہیں۔جس میں عام طور پر شکریہ ادا کرنے کے بعد اس مصنف کی تعریف وتحسین کی جاتی ہے۔جس سے صاحب کتاب کا سر فخر سے اونچا ہو جاتا ہے اور اسے ہی وہ اپنا سرمایہ زندگی تصور کر لیتے ہیں۔کتابیں جو علمی، عملی اور ادبی ہوں وہ یقیناً ہمارا بیش بہا سرمایہ ہیں۔ ہماری تنہائی کی ہمدم و دوست، ایک ایسی دوست جو ہماری تنہائی کو منور کر کے ہمارے اندر ایک نئی توانائی اور جوش بھر دیتی ہے۔

خیر بات ہو رہی تھی تحقیق کی صورت حال کی۔ ہمارے پاس آجکل کی ڈاک میں بہت سے مضامین ایسے آتے ہیں جو نام نہاد تحقیقی ہوتے ہیں۔مضمون نگار کا اصرار ہوتا ہے کہ اسے شائع کر کے انہیں ممنون کریں۔جب کہ یہ تحقیقی مضمون کے نام پر ایک ٹھس اور نا قابل مطالعہ خام مواد ہوتا ہے جو صرف صاحب مضمون کے لیے فائدہ اور خوشی کی چیز ہو سکتی ہے، عام قاری کو سوائے بیزاری اور تضیع اوقات کے کچھ اور ہاتھ نہیں آتا۔

اس قسم کے نام نہاد مضامین میں تحقیق کے نام پر حوالے اور حواشی کی کچھ اس قدر بھرمار ہوتی ہے کہ اللہ کی پناہ۔کبھی کبھی تو ایسا بھی ہوتا ہے کہ دو صفحے کا اصل مضمون اور اس پر چار صفحے کے حواشی اور حوالے۔اور وہ حواشی وحوالے بھی نقل در نقل کی مثال ہوتے ہیں۔

ادھر ایک اور مصیبت آن پڑی ہے۔یو جی سی کی نئی ہدایت کے مطابق کسی بھی ریسرچ اسکالر کو پی ایچ ڈی تھیسس جمع کرنے کی اسی صورت میں اجازت دی جا سکتی ہے جب کہ ISSN نمبر والے کسی رسالے میں اس کے کم از کم 3 مضامین شائع ہو چکے ہوں۔ اس کا سیدھا سیدھا اثر' آجکل' اور اس قسم کے چند دیگر رسائل پر پڑتا دکھائی دیتا ہے۔چنانچہ روزانہ ہی بڑی تعداد میں کچے پکے مضامین ادارے کو موصول ہوتے ہیں۔ان میں سے بعض مضامین کو تو کاٹ چھانٹ کر نوک پلک درست کر کے شائع کر دیا جاتا ہے لیکن زیادہ تر ایسے مضامین ہوتے ہیں جن کا کوئی علاج ہمارے پاس نہیں۔ان پر ہم سوائے خاموشی اختیار کرنے کے اور کچھ نہیں کر سکتے۔

(اکتوبر 2013)

ہر عاشق ہے سردار یہاں

سردار جعفری کا مشہور زمانہ یہ مصرع 'ہر عاشق ہے سردار یہاں، ہر معشوقہ سلطانہ ہے' کا محض ایک فقرہ ہے لیکن یہ ایک فقرہ ہی یہاں علی سردار کی شخصیت پر زیادہ چست نظر آتا ہے کہ یہ سلطانہ کی معشوقیت کو بھی نمایاں کرتا ہے اور علی سردار جعفری کے اپنے نصب العین کے تئیں عشق کو بھی ظاہر کرتا ہے۔

سردار جعفری بیسویں صدی کی چند اہم شخصیات میں شمار کیے جاتے ہیں۔ نہ صرف اردو زبان وادب کے حوالے سے بلکہ بحیثیت ایک مفکر اور دانشور کے بھی وہ پہچانے جاتے ہیں۔ سردار جعفری ایک بڑے ادیب تو ہیں ہی لیکن اس سے زیادہ وہ ایک بڑے دانشور بھی ہیں۔ سچی بات تو یہ ہے کہ ادیب تو کوئی بھی ہو سکتا ہے یا تھوڑی سی کوشش سے بن سکتا ہے لیکن دانشوری کسی کسی کے ہی حصے میں آتی ہے کہ دانشوری چیزے دیگر است۔

علی سردار جعفری ایک کامیاب اور جامع العلوم ادیب تھے۔ شاعر، نثر نگار، تنقید نگار، محقق، افسانہ نگار، ڈرامہ نگار، مترجم اور صحافی وغیرہ کو ایک خاص پانی اور مٹی سے گوندھ کر جو پتلا تیار کیا گیا اسے ہم علی سردار جعفری کے نام سے جانتے ہیں۔ وہ علیؓ کی طرح جری اور بہادر بھی تھے، سرداری تو انہیں قدرت نے عطیہ کے طور پر بخشی تھی اور جعفری کا لفظ ذہن میں آتے ہی حضرت جعفر طیار کی یاد تازہ ہوتی ہے کہ ہر موقع سے علی سردار تیار بھی رہتے تھے اور طیار بھی۔ ایک فعال اور متحرک شخصیت کا ایک مثالی نمونہ تھے علی سردار جعفری۔ ان کی ذہنی تشکیل میں شیعت، مارکسزم، انقلابی رومانویت اور عصری وژن سبھی کا بڑا اہم رول رہا ہے۔

علی سردار جعفری کتابی چہرہ لے کر پیدا ہوئے تھے بلکہ یوں کہیں کہ ان کے چہرے میں ایک

کتاب کی کئی خوبیاں موجود تھیں تو غلط نہ ہوگا۔ کشادہ پیشانی، جس پر موٹا سامستا، ستواں ناک، شاعرانہ لب ورخسار، خوبصورت بڑے بڑے کان ان کی شخصیت کوایک عجیب وقار بخشتے ہیں۔ یوں تو جسمانی طور پر وہ ہر طرح متحرک اور فعال تھے لیکن ان کی زلف دراز اور ان کی سوچتی آنکھیں بہت خاص ہیں جنہیں دیکھ کر ہمیں اس تضمین کی یاد آجاتی ہے 'زلف دراز مانگ کے لائے تھے چار گز' لیکن ان کی یہ زلف نہ تو بے جا آرزو میں کٹی اور نہ ہی کسی دوسری سلطانہ کے انتظار میں، کہ سردار جعفری کے یہاں ان باتوں کے لیے وقت تھا اور نہ ہی اس زلف دراز کی وجہ سے وہ اپنے فرائض سے غافل ہونا چاہتے تھے۔ سوچتی آنکھیں ان کی شخصیت کا سب سے نمایاں عنصر ہیں کہ وہ ہمیشہ نئی نئی باتوں اور کاموں کو سوچتے رہتے تھے اور بایں وجہ ان کی تخلیقات میں تازگی اور نیاپن پایا جاتا ہے۔

علی سردار جعفری کی حیثیت ایک ادیب کے طور پر مسلم ہے۔ اب یہ اور بات ہے کہ کوئی انہیں ایک بڑا شاعر مانتا ہے اور بحیثیت شاعر ہی انہیں جانتا ہے جب کہ کچھ لوگ نثر نگار کی حیثیت میں انہیں زیادہ اہمیت دیتے ہیں اور نثر میں بھی بحیثیت نقاد اور کچھ حضرات ترقی پسند تحریک کے مؤرخ کے طور پر یاد کرتے ہیں۔ اپنے گھر اور خاندان کے مرثیہ زدہ ماحول میں مرثیہ پڑھتے ہوئے جب وہ عنفوان شباب میں اردو ادب کے وسیع میدان میں داخل ہوتے ہیں تو وہ اردو افسانہ نگاری کو اپنے لیے منتخب کرتے ہیں۔ لیکن کچھ دور چلنے کے بعد ہی انہیں احساس ہوتا ہے کہ وہ اس میدان کے مرد مجاہد نہیں۔ چنانچہ افسانہ نگاری کو چھوڑ کر وہ شاعری کی طرف رخ کرتے ہیں اور کارزار حیات میں شاعری کو ہی آلات حرب وضرب بناتے ہیں۔

میرؔ اور غالبؔ ان کے پسندیدہ شاعر ہیں۔ جدید شعرا میں وہ اقبال سے بطور خاص متاثر تھے چنانچہ ان کی شاعری پر جا بجا اقبال کا رنگ نظر آتا ہے۔ یہ ان کا اقبال سے لگاؤ ہی تھا کہ انہوں نے اقبال پر ایک اہم تنقیدی کتاب 'اقبال شناسی' لکھی جو بلاشبہ اقبالیات میں ایک اہم اضافہ ہے۔ اسی طرح انہوں نے غالب کا دیوان نہ صرف اردو میں مرتب کیا بلکہ ہندی میں مرتب کردہ دیوان غالب ان کا زیادہ اہم کارنامہ سمجھا جاتا ہے۔ 'لکھنؤ کی پانچ راتیں' بھی ان کی ایک اہم تصنیف ہے۔ سردار جعفری کی نثر لکھنؤ کی شائستگی، تہذیب اور رکھ رکھاؤ کا اعلیٰ ترین نمونہ ہے نثر میں خاکہ نگاری اور یادرفتگاں رقم

کرنا ایک فن ہے، اس میں بھی سردار جعفری نے جس فنکاری کا مظاہرہ کیا ہے وہ انہیں کا حصہ ہے۔

بمبئی کی فلم نگری یا مایا نگری نے انہیں بھی خوب لبھایا اور اس گلیمر اور چمک دمک سے ان کی آنکھیں بھی خیرہ ہوئیں چنانچہ وہ بھی اس سے کسی حد تک جڑے۔ لیکن اس نگری کی واہیات اور خرافات سے اپنے دامن کو آلودہ ہونے سے بچائے رکھا۔ مگر کام کی چیزوں کا خوب خوب استعمال بھی کیا۔ انہوں نے کئی ڈاکومنٹری فلمیں بھی بنائیں، نغمے لکھے اور ٹی وی کے لیے ادبی، علمی، تفریحی اور دستاویزی پروگرام بھی پیش کیے جسے عام طور پر پسند کیا گیا۔ البتہ اس میدان میں وہ مہارت کے اس مقام پر نہیں پہنچ سکے جسے ہم کامیابی سے موسوم کرتے ہیں۔

یہ محض اتفاق ہی ہے کہ سال 2013 ہندوستانی سینما کی صدی ہے اور سردار جعفری کی بھی۔ جعفری نے سینما اور دوسرے ذرائع ابلاغ کے توسط سے اردو زبان اور اپنی قوم کی جو خدمات انجام دی ہیں وہ ناقابل فراموش ہیں۔ حقیقت یہ ہے کہ سردار جعفری جہاں کہیں بھی رہے اپنی سرداری کا سکہ جمائے رکھا۔ لکھنؤ میں رہے تو وہاں پانچ راتوں کے حوالے سے اپنی سرداری ثابت کی۔ علی گڑھ رہے تو وہاں بھی اپنی چھاپ چھوڑی اور بمبئی جسے انہوں نے اپنا وطن ثانی بنایا تھا کچھ اس طرح کہ وہاں وہ رچ بس سے گئے اور بمبئی ہی ان کا اصل وطن معلوم ہونے لگا۔ غرض جس جگہ بھی انہوں نے قیام کیا وہاں کا انہوں نے حق ادا کر دیا۔

مجاہد اردو کے طور پر بھی علی سردار جعفری کی اپنی ایک پہچان رہی ہے۔ بلاشبہ انہیں اپنی زبان سے بے حد محبت تھی۔ اردو کے حق اور اس کا جائز مقام دلانے کے لیے انہوں نے جدوجہد بھی کی، لیکن کیا ان کی یہ جدوجہد کامیابی سے ہمکنار ہو سکی؟ اردو کی ترقی اور فروغ کے لیے قائم گجرال کمیٹی میں وہ بطور رکن شامل رہے اور اس کی سفارشات کے ریویو کے لیے خود ان کی سرپرستی میں ایک کمیٹی تشکیل دی گئی جسے ہم جعفری کمیٹی کے نام سے جانتے ہیں۔ علی سردار جعفری یہاں بھی کچھ کر پانے سے قاصر نظر آئے۔ حالانکہ ان پر اقتدار سے قریب رہنے کا الزام بھی لگا۔ دراصل وہ سیاست، دوستی اور حقوق کی چکی میں پس کر رہ گئے تھے۔ واقعی وہ ایک شریف اور بامروت انسان تھے۔

(نومبر 2013)

نوبل انعام محض ایک رسم

زیر نظر شمارہ بنیادی طور پر مولانا آزاد کے لیے مخصوص ہے۔ لیکن اس میں دو مضامین ایک نوبل انعام پر اور دوسرا یادرفتگاں کے تحت راجندر یادو پر شامل اشاعت ہیں۔ آجکل میں ایسے مضامین ترجیحی بنیاد پر شامل کیے جاتے ہیں۔

ربندر ناتھ ٹیگور کو ان کی شاہکار تخلیق گیتانجلی کے لیے 1913 میں نوبل پرائز سے نوازا گیا۔ اس طرح ہندوستان کو ادب کا نوبل انعام ملے پورے سو سال ہو چکے ہیں۔ یہ جہاں ایک طرف خوشی کی بات ہے وہیں دکھ کی بات یہ ہے کہ ٹیگور کا گولڈ میڈل ہماری لاپروائی سے چوری ہو گیا۔ اب اس واقعہ کو بھی تقریباً دس سال ہونے کو آئے۔ مگر تفتیش سے متعلق تمام ادارے اسے ڈھونڈنے اور برآمد کرنے میں پوری طرح ناکام رہے۔ ٹیگور کو نوبل انعام ان کی بنگلہ زبان میں لکھی تخلیق گیتانجلی کے لیے تفویض کیا گیا۔ اس کے بعد سے اب تک اردو اور ہندی سمیت ہندوستان کی دوسری زبانوں کے ادیب حسرت سے نوبل میڈل کی راہ تک رہے ہیں۔

آج مولانا آزاد کی 125 ویں سالگرہ پر انہیں خراج عقیدت پیش کرتے ہوئے اس بات کا شدت سے احساس ہو رہا ہے کہ کیا مولانا آزاد کی تصانیف اس لائق نہیں تھیں کہ جن پر انہیں اس قسم کے پرائز سے نوازا جاتا۔ میرا خیال ہے کہ آزاد کو دیا جانے والا یہ انعام بھی بوجوہ متنازعہ ہو سکتا تھا۔ یوں بھی اس دنیا میں کون سا ایسا انعام ہے جو تنازعہ کا شکار نہیں ہوا ہو۔ غیر متنازعہ انعام تو صرف وہی ہے جو اوپر والے کی طرف سے عطا کیا جائے گا کہ اسی کی ذات حقیقی منصف ہے۔

نوبل انعام جسے دنیا کا اب تک کا سب سے بڑا انعام تصور کیا جاتا ہے، ایک ایسے شخص کی طرف سے خود اس کے نام پر جاری کیا گیا ہے جسے ہم 'موت کا سوداگر' کے نام سے جانتے ہیں۔ جی

ہاں! الفریڈ نوبیل موت کا سوداگر ہی تو تھا جس نے ڈائنامائٹ ایجاد کر کے خوب خوب دولت جمع کی۔ اس کے ایجاد کردہ ڈائنامائٹ سے لاکھوں انسانوں کی جانیں تلف ہوئیں۔ جب اس نے اس بڑے پیمانے پر جانوں کی تلفی دیکھی تو وہ خود ہی ہراساں و پریشاں ہو گیا۔ لیکن اب تیر کمان سے نکل چکا تھا۔ اب پچھتائے کا ہوت، جب چڑیاں چگ گئیں کھیت۔ ہاں البتہ ایک بات یہ ضرور ہوئی کہ اس کا ضمیر اب جاگ چکا تھا۔ اس نے جو کچھ ایجاد کیا تھا اب اس کا رزلٹ جس صورت میں سامنے آیا وہ خود موجد کو دل کی گہرائیوں تک دہلا گیا تھا۔ شاید اس نے خواب میں بھی یہ نہیں سوچا تھا جو حقیقی روپ میں اس کے سامنے آیا۔ جب الفریڈ نوبیل کا ضمیر جاگا تو اس نے سارے سرمایہ کو نیک کاموں میں لگانے کا عزم کیا۔ گویا اس نے اپنے گناہوں کی تلافی کی ایک صورت نکال لی۔

الفریڈ نوبیل نے وصیت کی تھی کہ اس کے ان پیسوں کا استعمال دنیا کے مختلف علوم و فنون میں نمایاں کارکردگی انجام دینے والوں کی حوصلہ افزائی کے لیے انعام کی صورت میں کیا جائے۔ چنانچہ 1901 سے اس انعام کی تفویض کا سلسلہ شروع ہوا جو اب تک جاری ہے۔ البتہ یہ ضرور ہے کہ جتنا بڑا یہ انعام ہے، اتنا ہی بڑا تنازعہ اس کے ساتھ جڑا ہوا ہے۔ چنانچہ جوں ہی انعام کا اعلان ہوتا ہے تنازعات کا پٹارہ بھی کھل جاتا ہے۔

جن شعبوں کے لیے یہ انعامات دیے جاتے ہیں اس میں سائنس، طب، اقتصادیات، امن و شانتی اور ادب شامل ہیں۔ 2013 میں جن شخصیات کو یہ انعامات دیے گئے، ان کے نام کچھ اس طرح ہیں:

جیمس راتھمین اور رینڈی شیک مین کی امریکی جوڑی اور جرمنی میں پیدا ہونے والے تھامس سیوداف کو طب کے شعبہ میں بے مثال اور نمایاں خدمات کے لیے نوبل انعام سے نوازا گیا ہے۔ امریکی یونیورسٹی میں کام کرنے والی اس تری مورتی کو انسانی شریانوں کے نظام تخلیق پر ان کی تحقیق کے لیے یہ ایوارڈ دیا گیا ہے۔ برطانیہ کے پیٹر ہکس اور بلجیم کے فرانکوئس اینگلرٹ کو 'گاڈ پارٹیکل' کو ہکس بوسن کی تلاش کے لیے فزکس کے نوبل انعام، کیمیائی عمل کو سمجھنے اور اس کا قبل از وقت اندازہ لگانے کے واسطے کمپیوٹر سیمولیشن کا فارمولہ تیار کرنے کے لیے تین سائنس دانوں (مالی کو ئیلر ماہرین) کو اس سال کیمسٹری کے نوبل ایوارڈ، امریکہ کے برطانوی نژاد شہری

مائیکل لیوٹ اور امریکہ کے اسرائیل نژاد شہری اریہ وارشیل کو مشکل کیمیائی عمل ملٹی کیل ماڈلوں کو ڈیولپ کرنے کے لیے اس انعام سے نوازا گیا ہے۔

کناڈیائی افسانہ نگار ایلس منرو کو ادب کا نوبل انعام دیا گیا ہے۔ یہ انعام انہیں کہانی سنانے کے فن میں مہارت کے اعتراف میں عطا کیا گیا ہے۔ ایلس منرو کو معاصر مختصر افسانے کی ملکہ کہا جاتا ہے۔ بعض ناقدین ایلس منرو کو کناڈا کی چیخوف کا درجہ دیتے ہیں۔

کہانی کہنے یا سنانے کے فن میں قرۃ العین حیدر منرو سے کسی بھی طرح پیچھے نہیں تھیں۔ قرۃ العین حیدر کو جان بوجھ کر محروم رکھا گیا ورنہ اگر ایلس منرو اور قرۃ العین حیدر کا تقابلی مطالعہ کیا جائے تو قرۃ العین حیدر کسی بھی طرح کمتر نہیں۔ البتہ یہ ضرور ہے کہ عینی کی تخلیقات چونکہ اردو میں ہیں جو اپنی بد نصیبی کے باوصف ہمیشہ ہی نظر انداز ہوتی آئی ہے یا یوں کہیں کہ تعصب کا شکار پہلے بھی رہی ہے اور اب بھی ہے۔

امن کا نوبل انعام جیتنے کی دوڑ میں بہت سے ادارے اور شخصیات شامل تھیں۔ جنہوں نے مختلف شعبۂ ہائے زندگی میں نمایاں کارکردگی دکھائی ہے۔ اسی حوالے سے ایک نام پاکستان کی طالبہ ملالہ یوسف زئی کا بھی تھا۔ لیکن اس بار یہ انعام آرگنائزیشن فار پروہیبیشن آف کیمیکل ویپنس (او پی سی ڈبلیو) نامی ایک تنظیم کو دیا گیا۔ بنیادی طور پر اس تنظیم کا کام کیمیائی ہتھیاروں کو تلف کرنے کا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اب یہ ایوارڈ تنظیم برائے امتناع کیمیائی ہتھیار کو دیا گیا۔ او پی ڈبلیو سی کے نمایاں کارناموں میں سے ایک حالیہ کارنامہ مشرق وسطیٰ میں شام کے اندر پھیلے کیمیائی ہتھیاروں کو تلف کرنے کا بھی ہے۔ واضح رہے کہ شام میں ان دنوں خانہ جنگی کی صورت حال ہے اور ماضی قریب میں کیمیائی حملوں کے نتیجے میں 1400 افراد اپنی جان گنوا چکے ہیں۔

نوبل امن انعام ایک بار پھر تنازعہ کا شکار ہوا ہے۔ دنیا کی نگاہیں ملالہ یوسف زئی پر لگی تھیں لیکن انعام ملا ایک تنظیم کو جو دنیا میں حرب وضرب کے لیے بنائے جانے والے ہتھیاروں کو تلف کرتی ہے۔ اس انعام کے اعلان کے ساتھ ہی الزام عائد کیا جانے لگا کہ اس انعام کے ذریعہ شامی صدر کے جرائم کی پردہ پوشی کی گئی ہے نیز یہ کہ امن کا انعام چند بااثر شخصیات کی غیر معمولی منافقت کا مظہر ہے۔ جہاں تک ملالہ کو امن کا نوبل انعام نہ ملنے کا سوال ہے تو ملالہ کو انعام ملا ہو یا

نہیں۔ وہ اپنے 'مشن' 'خواتین کے لیے تعلیم' کے سبب سب کی چہیتی بن چکی ہے۔ بلاشبہ اس نے کسی بھی نوبل انعام یافتہ شخص سے زیادہ شہرت اور عزت حاصل کر لی ہے۔

امن کے لیے دیا جانے والا انعام سیاست اور بدامنی کا شکار ہو جائے اور انتشار اور خلفشار اتنے بڑے پیمانے پر پھیل جائے تو پھر یہ کیسا امن؟ اور کیسا انعام؟ جب تک عالمی پیمانے پر ان انعامات کو سیاست سے مکت نہیں کرایا جائے گا، تب تک ان انعامات کی تفویض محض ایک رسم بن کر ہی رہے گی۔

(دسمبر 2013)

نوٹ: 2014، کا امن کا نوبل انعام پاکستان کی ملالہ یوسف زئی اور ہندوستان کے کیلاش ستیارتھی کو مشترکہ طور پر دیا گیا ہے۔

"..... کچھ عرصہ سے ہندی میں سنسکرت اور اردو میں عربی الفاظ داخل کرنے کی خواہ مخواہ کوشش ہو رہی ہے۔ اور اس سے دونوں زبانوں کا فاصلہ بڑھتا جا رہا ہے۔ آج کل نن کوآپریشن کے زمانہ میں اردو کے معزز رسائل اور اخبارات معمولی انگریزی الفاظ کو بھی بائیکاٹ کرنے کی فضول کوشش کر رہے ہیں....."

(زمانہ، اپریل 1921)

"..... ایک زمانہ میں ہم لوگوں کو شکایت ہوتی تھی کہ ہمارے حکام وقت صرف اسی اعزاز کے قدردان ہیں جو وہ خود ملک کے ممتاز اشخاص کو بخشیں اور ان عزتوں کی قدر نہیں کرتے جو خادمان ملک اپنی قوم سے خدمات قومی کے صلہ میں حاصل کرتے ہیں..... جو شخص اپنے کتب خانہ میں بیٹھ کر مدت العمر میں ایک ایسی کتاب لکھتا ہے جس کے مطالعہ سے ہزاروں افراد قوم مستفید ہوتے ہیں، جس سے ملک کے ذخیرہ لٹریچر میں مفید اضافہ ہوتا ہے اور جس سے کسی غیر ملک یا قوم کے پڑھنے والے کی نظر میں مصنف کی قوم کی نسبت اچھی رائے پیدا ہو سکتی ہے۔ ہماری رائے میں وہ شخص باوجود گوشہ نشیں ہونے کے اور باوجود اپنی سادگی وضع ہونے کے ایک سچا خادم قوم اور محسن قوم ہے۔..... عبدالقادر۔"

(مخزن، نومبر 1910)

قضا لے چلی چلے

2013 کا آفتاب غروب ہوتے ہوتے ادب کے چندے آفتاب چندے ماہتاب شخصیتوں کو اپنے ساتھ لے گیا۔اس میں اردو ہندی یا کسی دیگر زبان کی تخصیص نہیں لیکن اردو ادب میں غروب کے بعد کا یہ اندھیرا کچھ زیادہ ہی محسوس کیا جا سکتا ہے کہ ان رفتگان ادب میں بڑے بڑے نامی گرامی اور ادب پر اپنے نقوش چھوڑنے والے شاعر و ادیب شامل ہیں۔حالانکہ ان سطور کے لکھے جانے تک 2013 کے ختم ہونے میں ابھی ایک ماہ باقی ہے اور شہر اردو میں ماتم کا سلسلہ جاری ہے۔ہم اسے قانون قدرت سے تعبیر کر کے خود کو بہلا وہ دے سکتے ہیں۔

سال 2014 کا سورج حسب معمول پھر اسی طرح اُگے گا اور ہم ایک بار پھر 31 دسمبر کی رات سے ہی یکم جنوری کا انتظار کریں گے۔نئے سال کے استقبال کے نام پر نہ جانے کون کون سی واہیات اور خرافات حرکتیں کر کے اپنے تھرڈ لا پن کا ثبوت بھی دیں گے، جیسے کہ کچھ ہوا ہی نہیں:

آفتاب تازہ پیدا بطن گیتی سے ہوا

آسماں ڈوبے ہوئے تاروں کا ماتم کب تلک

یکم جنوری 2014 کو ہم پھر نئے جوش وخروش سے ایک دوسرے کو بدھائی دیتے ہوئے نظر آئیں گے۔نئے سال میں ہم ایک نئے عزم کے ساتھ متحرک و فعال دکھائی دیں گے۔لیجئے شروعات ہم کیے دیتے ہیں۔ہماری جانب سے آپ سب کو نئے سال کی بہت بہت مبارکباد۔

لیکن ہم اتنی جلدی اپنے مرحومین کو بھی شاید بھلا نہیں سکتے۔ہم اپنے ان بزرگوں کو اتنی جلدی کیوں کر بھلا سکتے ہیں کہ ہم کوئی پتھر نہیں انسان ہیں۔اور انسانی فطرت کا تقاضا یہ ہے کہ موت کے سامنے ہم سپر ڈال ہی دیتے ہیں۔

لائی حیات آئے ، قضا لے چلی چلے
اپنی خوشی نہ آئے نہ اپنی خوشی چلے

لیکن ہم اس حیوم وقیوم کے بندے ہیں جس کے ہاتھ میں ہماری جانیں ہیں اور ہم بہر حال اپنی جانوں کے امین ہیں۔ امانت میں خیانت ہم ہر گز نہیں کر سکتے اور ایسا بھی نہیں کہ اس کی مرضی کے بنا ہم جو چاہیں کرتے رہیں اور ہماری باز پرس بھی نہ ہو۔ مرنے والے اپنے نامۂ اعمال کے ساتھ خدا کے حضور پہنچ چکے اور اس ذات کی طرف سے اپنے فیصلہ کا انتظار کر رہے ہیں۔

قارئین! یہ ہم کون سا موضوع چھیڑ بیٹھے ہیں۔ آیئے ہم اپنے اصل موضوع کی طرف لوٹتے ہوئے فرداً فرداً اپنے مرحومین کا ذکر خیر کرتے چلیں کہ مرحومین کی کمزوریوں اور خامیوں کا بکھان کرنا ہماری اخلاقیات کے منافی ہے۔ اور پیٹھ پیچھے کسی کی برائی کرنا گناہ عظیم بھی، جس سے بچنے کی ہمیں تلقین کی گئی ہے۔ البتہ کسی مرحوم کے ذکر میں حقیقت حال جو اپنے بہاؤ کے ساتھ تقریر وتحریر اور بیان میں آجاتے ہیں ان سے مفر بھی نہیں۔ یہ وہ بات ہے جو ہمارے تجربات اور مشاہدات اور مرحوم کے اعمال کے ساتھ کچھ اس قدر پیوست ہیں کہ ہم چاہ کر بھی ان سے پیچھا نہیں چھڑا سکتے۔

حال میں ہم سے بچھڑنے والوں میں ہمارے بزرگ بلراج کومل (24 نومبر) ہمارے استاد شکیب ایاز (17 نومبر)، ظفر عدیم (16 نومبر)، معراج فیض آبادی (30 نومبر) اور مرزا کھونچ (16 نومبر) شامل ہیں۔

ہمارے بزرگ دوست ظفر عدیم اور ان کی والدہ جو اپنے بیٹے کی جدائی کا غم برداشت نہیں کر سکیں اور آخر اپنے بیٹے کے پاس پہنچ کر ہی دم لیا۔ بے پناہ پیار کرنے والی اس ماں نے ظفر عدیم کی صورت میں ایک ایسی تخلیق پیش کی تھی جس نے ادب میں کئی قابل ذکر اضافے کیے۔ لیکن وہ پہلے ہی خاموش ہوئے۔

بلراج کومل جیسا کہ نام سے ہی ظاہر ہے وہ واقعی کومل یعنی ہمدرد اور نرم دل انسان تھے۔ کومل نے اپنی ذات اور صفات کو لوگوں کے سامنے کچھ اس انداز سے پیش کیا کہ سبھی ان کے گرویدہ اور دوست ہو گئے۔ ادب کی دنیا میں بھی دوست اور دشمن ہوتے ہیں لیکن جہاں تک کومل کا تعلق ہے، انہوں نے کسی کو اپنا دشمن نہیں بنایا، سبھی یا تو ان کے دوست تھے یا بصورت دیگر ان سے لاتعلق

تھے۔آنجہانی بلراج کومل 25ستمبر 1928 کو سیالکوٹ میں پیدا ہوئے تھے۔ تقسیم وطن کے بعد انہوں نے دہلی کو اپنا مسکن بنایا اور اپنے علم، محنت، سچی لگن، انکساری اور نرم گفتاری کے باعث لوگوں کے دلوں میں اپنی جگہ بنائی۔ بلراج کومل کا ادبی سفر تقسیم وطن کے ناگفتہ بہ حالات میں شروع ہوا۔ اردو ادب کے تئیں ان کے سنجیدہ رویہ کی وجہ سے ہی ان کا شمار صف اول کے ادیبوں میں ہوتا تھا۔

معراج فیض آبادی کی وفات سے اردو ادب کا ایک منفرد لہجہ خاموش ہو گیا ہے۔ وہ اپنی شاعری میں آپ بیتی اور جگ بیتی کو کلاسیکی لب ولہجہ میں خوبصورت پیرائے میں پیش کرنے میں ید طولیٰ رکھتے تھے۔

شکیب ایاز ہمارے استاد تھے۔ پٹنہ اورینٹل کالج میں پڑھاتے تھے لیکن شہرت اور نام ونمود سے دور بھاگتے تھے۔ کالج میں ایمانداری سے پڑھاتے تھے۔ تعلیم وتعلم ہی ان کا مشغلہ تھا۔ اپنی فطرت سے ذرا زیادہ ہی معصوم تھے۔ چنانچہ جہاں تک میں سمجھتا ہوں کہ ان کا کوئی حریف، رقیب یا دشمن نہیں تھا۔ البتہ بیٹھے بٹھائے انہیں کیا سوجھی کہ بہار اردو اکیڈمی کے سکریٹری شپ کے لیے جوڑ توڑ شروع کر دی اور آخر کار سکریٹری بن بیٹھے۔ اکیڈمی کا سکریٹری بننا آسان ہے لیکن اس کی گریما کو نبھانا مشکل ہے۔ اب اس سکریٹری شپ کی کون کون سی علتیں ان کی پریشانی کا سبب بنیں یہ تو مرحوم ہی بتا سکتے تھے البتہ ہم اتنا ضرور بتا سکتے ہیں کہ انہوں نے اس کے لیے شرافت کا جامہ نہیں اتارا تھا۔ کالج سے سبکدوشی کے بعد بھی انہوں نے پڑھنے پڑھانے کا سلسلہ ترک نہیں کیا۔ اکثر وبیشتر خدا بخش لائبریری میں دیکھے جاتے تھے جہاں وہ کچھ نہ کچھ کرتے دکھائی دیتے۔ شہر علم سے ان کا تعلق تھا چنانچہ اس کی توقیر کو انہوں نے بھی بخوبی نبھایا۔ مراد آباد جسے ہم شہر جگر کے نام سے بھی جانتے ہیں وہاں تو گویا:

کمر باندھے ہوئے چلنے کو ہم یار بیٹھے ہیں
بہت آگے گئے باقی جو ہیں تیار بیٹھے ہیں

مراد آباد کے خمار نہٹوری (14 نومبر بعمر 80 برس)، عبدالحمید شمسی (14 نومبر بعمر 63) اور وحشی مراد آبادی (17 نومبر بعمر 75 سال) وفات پائی۔

ہمیں ان سب کے گزر جانے کا افسوس ہے لیکن موت برحق ہے لہٰذا ہر ذی نفس کو ایک نہ ایک دن موت کا مزہ چکھنا ہی پڑتا ہے۔ (جنوری 2014)

زمیں کھا گئی آسماں کیسے کیسے...

آدمی کیا سوچتا ہے اور کیا ہو جاتا ہے، ہم نے سوچا تھا کہ فروری کا شمارہ ہر سال غالب پر مخصوص ہی ہوتا ہے، لیکن اس بار فروری میں جاں نثار اختر اور غلام ربانی تاباں کی پیدائش کے سو سال بھی پورے ہو رہے ہیں، لہٰذا زیر نظر شمارہ میں غالب کے ساتھ ساتھ جاں نثار اختر اور غلام ربانی تاباں پر بھی مختصر گوشے شائع کریں گے، لیکن 2013، جاتے جاتے ایک اور چرکہ لگا گیا۔ 24/دسمبر کو کمال احمد صدیقی 28 دسمبر کو معروف فلم اداکار فاروق شیخ نے ملک عدم کی راہ لی۔ فاروق شیخ محض ایک اداکار نہیں تھے۔ وہ اپنی آرائش وزیبائش، کھان پان اور رہن سہن سے اردو تہذیب وشرافت کا جیتا جاگتا نمونہ تھے۔ اردو شعر وادب ان کی زندگی میں رچا بسا تھا۔ وہ فلمی دنیا کی ان چند شخصیات میں شامل تھے جن کے دم سے اردو اپنی تمام تر خوبصورتی، رعنائی اور لب ولہجہ کے ساتھ زندہ و پائندہ ہے۔

آہ! میں نے اپنا ایک بزرگ دوست کھو دیا۔ ڈاکٹر کمال احمد صدیقی ان فعال ترین شخصیات میں سے ایک تھے جنہوں نے آخری عمر تک کوئی نہ کوئی علمی اور ادبی کام کر کے اپنے فعال اور متحرک ہونے کا ثبوت دیا ہے۔ وہ علمی اور ادبی اعتبار سے ایک ناقد، محقق، شاعر، ماہر عروضیات اور ماہر غالبیات تھے۔ سچی بات یہ ہے کہ انہوں نے ان سبھی شعبوں میں اپنا ایک نقش ثبت کیا ہے۔ وہ ایک ہمہ جہت ادیب تھے۔ ان سب کے باوجود ان میں ذرا بھی گھمنڈ اور تکبر نہیں تھا۔ کوئی بھی کسی وقت بھی ان سے استفادہ کر سکتا تھا۔ وہ کبھی قیل وقال یا ٹال مٹول سے کام نہیں لیتے تھے۔ دراصل کمال صاحب ہمارے ان بزرگ دوستوں میں شامل تھے جو عمر کے طویل فرق کے باوجود ہم سے عام طور پر دوستانہ بے تکلفی کا مظاہرہ کرتے تھے۔ سروس کے آخری ایام میں ان کا تبادلہ ریڈیو

کشمیر سے دہلی ہوگیا تھا اور دہلی میں ڈپٹی چیف پروڈیوسر کے عہدے سے سبکدوش ہوئے۔ سبکدوش ہونے کے بعد گھر میں بیٹھ کر بے کار کی معذور اور مفلوج زندگی پر متحرک اور فعال زندگی کو ترجیح دی۔ انہوں نے جواہر لال نہرو یونیورسٹی میں 1986 میں اپنا نام پی ایچ ڈی کے لیے رجسٹرڈ کرالیا تھا۔ اس طرح وہ گود سے گور تک تعلیم حاصل کرنے کا عملی نمونہ تھے۔ انہوں نے پروفیسر محمد حسن، جو ان کے دوست تھے، ان کی نگرانی میں ریسرچ کا کام مکمل کیا۔ کمال صاحب نے کسی گھسے پٹے موضوع کے بجائے ماس میڈیا کے تعلق سے 'اردو: ریڈیو اور ٹیلی ویژن میں' پر کام کیا جس کا انہیں اپنی ملازمت کے دوران خاصا تجربہ اور مشاہدہ ہوا تھا۔ انہوں نے اردو میں اس اہم موضوع پر ڈاکٹریٹ کی ڈگری حاصل کی۔ یہ کتاب قومی اردو کونسل سے شائع ہوکر مقبول ہوچکی ہے۔

دوسری طرف عروض اور غالبیات پر بھی انہوں نے نہایت وقیع کام کیے۔ 'عروض و آہنگ' ان کا ایک اہم کارنامہ ہے، وہیں غالبیات میں ان کی اہم کتب 'غالب کی شناخت' اور 'بیاض غالب: ایک تحقیقی جائزہ' ایک اضافہ ہے۔ بیاض غالب میں کمال احمد صدیقی نے اپنے دلائل سے یہ ثابت کرنے کی کوشش کی ہے کہ نسخۂ امروہہ بخط غالب نہیں ہے۔ اس موضوع پر پروفیسر نثار احمد فاروقی سے بحث بھی ہوئی تھی۔ ماس میڈیا پر جن دنوں وہ پی ایچ ڈی کر رہے تھے، میں بھی اسی جے این یو سے سخت گیر نقاد کلیم الدین احمد پر پی ایچ ڈی کر رہا تھا۔ اس طرح ہم دونوں بیچ میٹ بھی تھے۔ جیسا کہ میں نے ابھی ذکر کیا ہے کہ غالبیات پر انہوں نے چند بڑے ہی وقیع کام کیے ہیں۔ وہ بحث و مباحثہ یا اختلاف سے قطعی پریشان نہیں ہوتے تھے۔ ایک بار انہوں نے خلیق انجم کے مرتبہ 'خطوط غالب' میں شامل غالب کے ایک خط پر ایک مضمون لکھا کہ غالب کا یہ خط بخط غیر نہیں بلکہ خود غالب کا تحریر کردہ ہے۔

یہ ایک دلچسپ انکشاف تھا جس نے مجھے مجبور کیا کہ میں بھی اس گفتگو میں شریک ہوجاؤں۔ ناچیز کو کمال احمد صدیقی کی یہ بحث محض برائے بحث ہی محسوس ہوئی تھی۔ لیکن چونکہ یہ بحث غالب سے متعلق تھی اور کمال احمد صدیقی کے مطابق 'یہ ایک نہایت اہم بات ہے' چناں چہ ناچیز بھی اس بحث میں شامل ہوگیا کیوں کہ مجھے غالب کا یہ خط متنازعہ اور واقعی 'بخط غیر' لگا تھا۔ لہٰذا میں نے کمال صدیقی کے ان معروضات پر مدلل جواب لکھا' جو 8 /جنوری 1988 کے ہماری زبان کے شمارے میں شائع ہوا۔

یہ خط غالب نے اپنے بیمار ہونے کی وجہ سے اپنے کسی شاگرد سے لکھوایا تھا۔ انجمن ترقی اردو کے ہفت روزہ 'ہماری زبان' میں اس پر باضابطہ بحث شروع ہوگئی، جس میں کمال احمد صدیقی اور خاکسار کے ساتھ ساتھ عابد پیشاوری بھی شامل ہوگئے۔ قابل ذکر بات یہ ہے کہ کمال صاحب نے بزرگ ہونے کے باوجود ہمارے اس اعتراض کا برا نہیں مانا۔ انہوں نے بڑے ہی تحمل سے دانشورانہ اور عالمانہ انداز میں اس کا مدلل جواب دیا۔ اس کے بعد سے میں کمال صاحب کا اور زیادہ گرویدہ ہوگیا۔ وہ نڈر، بے باک اور حق گو تھے۔ چنانچہ غلط بات کبھی برداشت نہیں کرتے تھے۔

کچھ ہی دنوں پہلے کی بات ہے جب کمال صدیقی جے این یو میں اپنے دوست پروفیسر محمد حسن کی برسی کے موقع سے منعقد ایک سمینار میں بن ٹھن کر شریک ہوئے تھے۔ قدرت نے وجیہ وشکیل شخصیت تو عطا کی ہی تھی، اس شخصیت کو کچھ اور بنا سنوار کر منفرد اور پر کشش بنا لیتے تھے۔ سوٹ پر لال ٹائی ضرور باندھتے تھے اور کوٹ کی اوپری جیب میں اکثر لال رنگ کا رومال تکونا کر کے لگایا کرتے تھے۔ وہ اکثر محفلوں میں سب کی توجہ کا مرکز بن جایا کرتے تھے۔

27 نومبر کو 'مضامین سکندر احمد' کے اجرا کے موقع پر غالب اکیڈمی میں ہماری ان سے آخری ملاقات ہوئی تھی، وہ کافی کمزور اور دبلے پتلے سے نظر آرہے تھے۔ لیکن ادب کے تئیں ان کے لگاؤ کی داد دینی چاہئے کہ وہ ایک آواز پر ہر محفل میں نہ صرف تشریف لاتے تھے بلکہ اظہار خیال بھی لازماً کرتے تھے۔ اتنا ہی نہیں وہ اکثر ایسی باتیں کرتے جن سے ہم جیسے طالبان علم وادب کی حوصلہ افزائی ہوتی تھی۔

2013 سے ہی کیا شکوہ۔ 2014 نے بھی ہمیں کم افسردہ نہیں کیا۔ اس نے چرکے پر چرکہ لگانا شروع کردیا ہے۔ یہی قدرت کا قانون ہے جو بھی اس دنیا میں آیا ہے وہ ایک دن یہاں سے رخصت بھی ہوگا۔ 2 رجنوری کو معروف صحافی اور مجاہد آزادی عشرت علی صدیقی کا لکھنؤ میں انتقال ہوگیا۔ عشرت علی صدیقی ان صحافیوں میں سے تھے جو صحافت کو عبادت سمجھتے تھے۔ انہوں نے کبھی اسے بلیک میلنگ یا نام ونمود کا ذریعہ نہیں بنایا۔ میری خوش نصیبی رہی ہے کہ مجھے 1982 میں 'قومی آواز' دہلی میں ان کے ساتھ کچھ وقت گزارنے اور کچھ سیکھنے کا موقع ملا۔ وہ لکھنوی تہذیب وشرافت کا ایک مثالی نمونہ تھے۔

(فروری 2014)

یہ بھی ایک سچائی ہے کہ شروع سے ہی اردو رسائل کے بعض مدیران کے ہاتھوں میں اداریہ نویسی کے نام سے ہی ارتعاش ہونے لگتا تھا اور ان کے قلم کی روشنائی سوکھنے لگتی تھی۔ آج بھی صورت حال کچھ ایسی ہی ہے۔ ایسے مدیران گو کہ صحافی اور مدیر کہلانے کے شوق میں رسائل کا اجرا تو کر لیتے ہیں لیکن اس پیشے کے مطالبات کو پورا کرنے سے قاصر رہتے ہیں۔

بیسویں صدی کے ساتھ اردو کی ادبی صحافت کا آغاز ہوتا ہے۔ 'مخزن' اور 'زمانہ' بوجوہ زیادہ معروف ہیں۔ البتہ جہاں تک ان کے اداریوں کا سوال ہے تو وہ بھی محض رسمی ہیں اور انہیں خانہ پُری سے زیادہ اہمیت نہیں دی جا سکتی۔ لیکن کبھی کبھی یہ اداریے واقعی اداریے کا حق ادا کرتے نظر آتے ہیں۔ آزادی ملنے کے ساتھ ملک دو ٹکڑوں میں تقسیم ہو چکا تھا اور طرح طرح کے مسائل سے عوام دو چار تھے، اس کا اثر عوامی زندگی کے ہر شعبے پر واضح طور پر نظر آتا ہے۔ صحافت بھی اس سے اچھوتی نہیں رہی۔

(اسی کتاب سے)

Edariya Navisi aur Mere Edariye

by Dr. Abrar Rahmani

'Tazeen Apartment' 179/22, Zakir Nagar,
New Delhi-110025 Mob.: 9911455508, 8860944899

arshia publications
arshiapublicationspvt@gmail.com
ISBN 93-83322-94-2